FARID
BOOK DEPOT

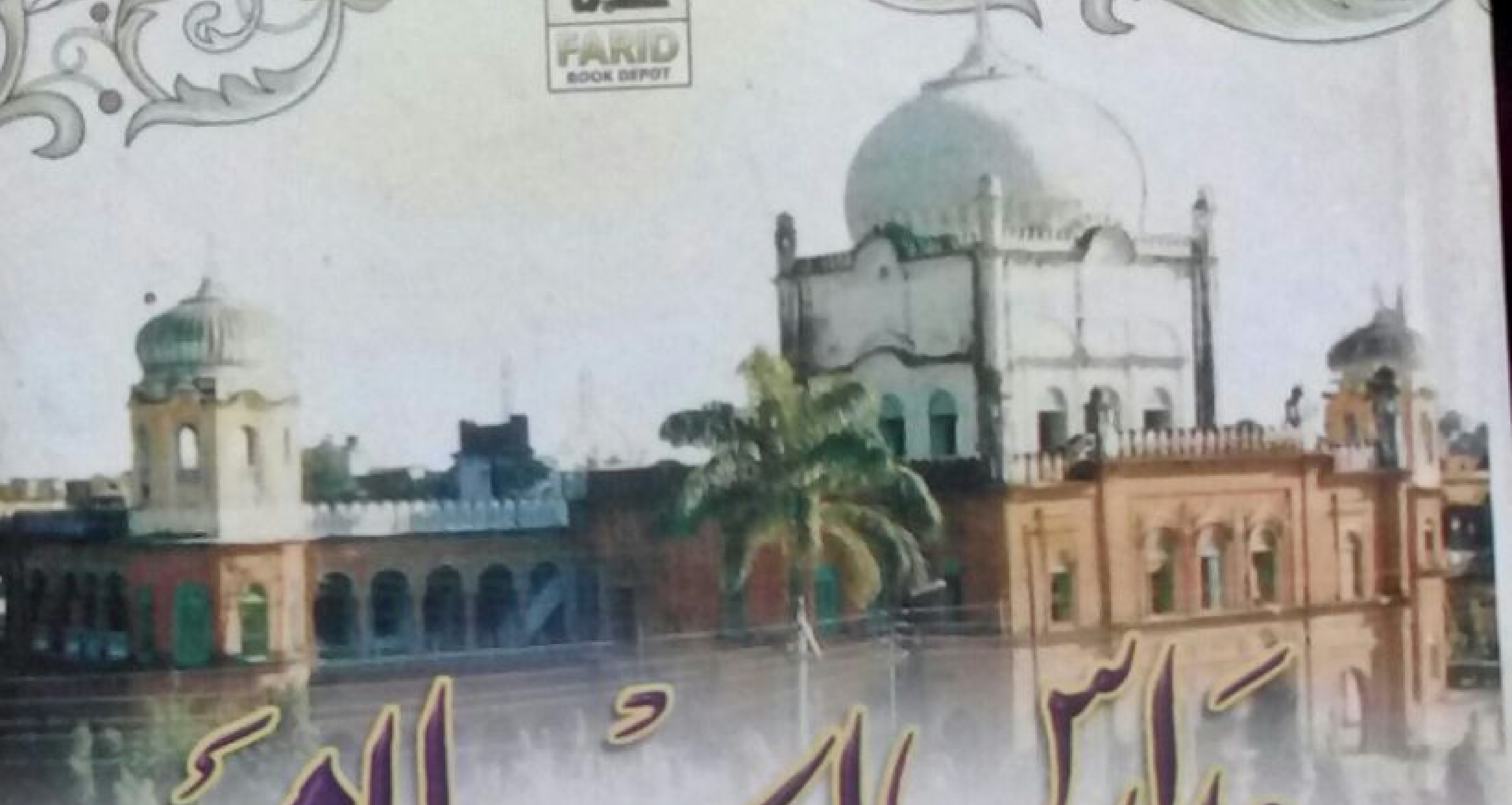

مدارسِ اسلامیہ

مشورے اور گزارشیں

مؤلف

مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی

صدر المدرسین مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، اعظم گڑھ، یوپی

مُرتب

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی

مدارسِ اسلامیہ

مشورے اور گزارشیں

مولف

مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی

(صدر المدرسین مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، اعظم گڈھ، یوپی)

مرتب

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی

ناشر

مکتبہ ضیاء الکتب، خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)
پن کوڈ: 276403 (موبائل: 9235327576)

تفصیلات

نام کتاب .... مدارس اسلامیہ مشورے اور گزارشیں
مولف .... مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی
مرتب .... ضیاء الحق خیرآبادی
باہتمام .... 〃 〃 〃
صفحات 312
قیمت 150/روپئے
طبع اول .... مارچ ۲۰۰۸ء
طبع دوم .... جولائی ۲۰۱۰ء
ای میل: zeyaulhaquekbd@gmail.com

ملنے کے پتے

- ☆ فرید بک ڈپو پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲
- ☆ کتب خانہ نعیمیہ، جامع مسجد دیوبند (یوپی)
- ☆ مکتبہ الفہیم صدر چوک مئوناتھ بھنجن 9236761926

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

تعارف طبع دوم	مولانا ضیاء الحق خیر آبادی	۵
مُقَدِّمَۃ	〃 〃 〃	٦
تَمہِیْد	حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی	١٠

☆☆☆☆☆

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
١	اہل مدارس کی خدمت میں	١٦
٢	اربابِ انتظام اور حضرات اساتذہ کی خدمت میں چند گزارشیں	٢٢
٣	طالبانِ علوم نبویہ سے چند باتیں	٣٧
٤	دستور الطلبہ	٤۵
۵	نصاب تعلیم کی اصلاح و ترمیم، جائزے اور مشورے	۵١
٦	علم و علماء اور نصاب تعلیم	٦١
٧	مدارس پر گرم نگاہیں، اسباب اور علاج	٨٨
٨	حضرات اساتذہ کیلئے چند رہنما اصول	٩٨
٩	دار العلوم دیوبند، داخلہ امتحان کے افسوسناک نتائج	١٠٧
١٠	مہتمم دار العلوم دیوبند کے نام خط اور ان کا جواب	١١١
١١	مدارس کا ماتم (١)	١١٨
١٢	مدارس کا ماتم (٢)	١٢٣

۱۳	مدارس سے متعلق ایک خط کا جواب	۱۲۶
۱۴	تین دن ضلع مہراج گنج کے مدارس میں	۱۳۴
۱۵	احتساب	۱۴۴
۱۶	مدارس نسواں	۱۴۸
۱۷	اربابِ مدارس اور اساتذہ کی ذمہ داریاں	۱۵۶
۱۸	علماء دین اور عصر حاضر	۱۶۲
۱۹	علم منطق	۱۶۹
۲۰	درسِ نظامی میں کتب حدیث کی شمولیت، وقت کی ایک اہم ضرورت	۱۷۳
۲۱	حقیقت علم اور اس کے تقاضے	۱۷۶
۲۲	دینی مدارس کا حکومت سے تعاون لینا مناسب یا غیر مناسب؟	۱۸۲
۲۳	مدارس کی حفاظت کیونکر ہو؟	۱۹۷
۲۴	آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے	۲۰۴
۲۵	وفاداری بشرطِ اُستواری اصل ایمان!	۲۱۶
۲۶	مدارس اسلامیہ	۲۲۷
۲۷	مدارس عربیہ اور مسابقے	۲۳۳
۲۸	تعلیم وتعلم کا اسلامی نظریہ	۲۳۷
۲۹	مدارس اسلامیہ عربیہ کا موضوع	۲۴۲
۳۰	دار العلوم دیوبند کیا ہے؟	۲۴۸

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعارف طبع دوم

یہ کتاب حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہ کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مدارس اسلامیہ کے سلسلے میں تحریر فرمائے ہیں، ان مضامین میں مدارس کے تینوں ارکان یعنی اہل انتظام، اساتذہ، طلبہ اور ساتھ ساتھ نصاب تعلیم، ہر ایک سے بحث کی گئی، اور مولف نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ قیامِ مدارس کی جو اصل روح ہے وہ سامنے آجائے۔ مزید تفصیل کیلئے کتاب کا مقدمہ ملاحظہ فرمایا جائے۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ مکتبہ حمادیہ کراچی پاکستان سے جون ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی، اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ ہندوستان میں اس کا پہلا ایڈیشن مارچ ۲۰۰۸ء میں فرید بک ڈپو دہلی سے شائع ہوا، اور ایک سال کے اندر ختم ہوگیا۔ اب تین مضامین ﴿حقیقت علم اور اس کے تقاضے﴾ ﴿دینی مدارس کا حکومت سے تعاون لینا مناسب یا غیر مناسب؟﴾ ﴿مدارس کی حفاظت کیونکر ہو؟﴾ کے اضافے کے ساتھ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔

باری تعالیٰ سابقہ ایڈیشنوں کی طرح اسے بھی قبولیت عام سے نوازے اور اسے اصلاح مدارس کا ذریعہ بنائے۔ آمین

ضیاء الحق خیرآبادی

۵/ جولائی ۲۰۱۰ء مطابق ۲۱/ رجب ۱۴۳۱ھ دوشنبہ

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مُقَدِّمَہ

مدارس اسلامیہ! یہ دین کی حفاظت کے قلعے ہیں، یہاں ان سرفروشوں اور پاکیزہ نفوس کی تربیت و پرورش ہوتی ہے، جو آگے چل کر دین و مذہب اور ملک وملت کے تحفظ وبقاء کے لئے جان کی بازی لگادیتے ہیں۔

مدارس اسلامیہ! علم وانسانیت کی درسگاہیں اور اخلاق وآدمیت کی تربیت گاہیں، ہیں جہاں بہترین انسان تیار ہوتے ہیں، ایثار و ہمدردی کے پیکر ڈھلتے ہیں، محبّ وطن اور خیر خواہ شہری پیدا ہوتے ہیں۔

انگریزوں کے دورِ غلبہ واقتدار میں جب پورا ملک ان کے ظلم وقہر اور خوف ودہشت سے لرزاں وترساں تھا، انھیں مدارس کے لوگ آگے آئے، اور قیادت کے فرائض انجام دئے، آپ نظر دوڑائیے! ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دینے والے شاہ عبدالعزیز صاحب، انگریزوں سے جہاد کرنے والے سید احمد شہید، مولانا اسمٰعیل شہید، انقلاب ۱۸۵۷ء میں قیادت کا فریضہ انجام دینے والے حاجی امداداللہ صاحب، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، علمائے صادق پور، ریشمی رومال اور خلافت تحریک کے بانی شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب، الہلال کے مدیر مولانا ابوالکلام آزاد، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا سید حسین احمد مدنی، علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا احمد سعید دہلوی، اوران جیسے بہت سے افراد، یہ سب انھیں مدارس کے ساختہ پرداختہ تھے، جنھیں آج دہشت گردی کا اڈا کہا جاتا ہے، آپ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی نظر دوڑائیے ان

فضلائے مدارس کے کارہائے نمایاں اور ان کی مخلصانہ خدمات اور بے لوث قربانیاں آپ کو ضرور ملیں گی۔

ان مدارس کے قیام اور اس طرز تعلیم کا سب سے اہم فائدہ یہ ہوا کہ علم کی روشنی بالکل عام ہوگئی، ورنہ پہلے تعلیم ایک خاص طبقہ تک محدود تھی، اور ہر شخص اس کے حاصل کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا تھا، ان مدارس کے قیام کے بعد مسلمانوں کا ہر ہر طبقہ خواہ وہ اقتصادی اور سماجی لحاظ سے کتنا ہی پست ہو علم حاصل کرنے کا حوصلہ محسوس کرنے لگا، چنانچہ جو پچھڑی قومیں اور ہندوستان کی فرقہ پرور فضا کی ساختہ پرداختہ برادریاں عمومی طور سے زیور علم سے سے محروم تھیں، اب علم و عمل کے سرمایہ سے مالا مال ہونے لگیں، ہر طبقہ میں علم بڑھا، اور دینداری کے چرچے عام ہوئے، انسانوں کی پہنائی ہوئی ظالمانہ بیڑیوں سے لوگوں نے آزادی حاصل کی، بندوں کی غلامی سے نجات حاصل کر کے اللہ کی بندگی کی وسیع فضا میں آئے۔

موجودہ طرز کے ان مدارس کے قیام پر ڈیڑھ صدی پوری ہو چکی، اور جب کسی نظام یا تحریک پر ایک عرصہ گزر جاتا ہے تو اس میں بہت ساری خرابیاں راہ پا جاتی ہیں، یہی حال ان مدارس کا بھی ہے، مؤلف کتاب استاذ محترم حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہٗ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

> ”لیکن جس نظام اور تحریک پر ایک مدت گزر جاتی ہے، اس میں مختلف جہتوں سے کمزوریاں آنے لگتی ہیں۔ اگر ان کا جائزہ لیا جاتا رہے، اور ان کی کمزوریوں کو دور کرنے کی مخلصانہ جدوجہد کی جاتی رہے، تو نظام درست رہتا ہے، اور اگر ”سب ٹھیک ہے“ کہہ کر ان کمزوریوں اور خرابیوں سے صرف نظر کر لیا جائے، تو آج کی ایک معمولی کمزوری کل کو ایک بڑی ہلاکت بن سکتی ہے۔ قومیں جب زندہ ہوتی ہیں، تو وہ اپنا احتساب خود کرتی رہتی ہیں۔ اپنی کوتاہیوں اور خرابیوں کا کھلے دل کے ساتھ اعتراف کرتی ہیں۔ اور پھر ان کی اصلاح کی کوشش کرتی ہیں، اور جب قوم پر مردنی چھاتی ہے

> تو اگر اس کے کسی عیب پر انگلی رکھ دی جائے تو وہ بھڑک اٹھتی ہے، اس لئے نہیں کہ اس میں وہ عیب نہ تھا، اور اس پر تہمت لگا دی گئی ہے بلکہ اس لئے کہ اس کا عیب کیوں کسی نے جان لیا، اور کیوں اس کی خبر دی گئی، یہ حالت افراد کیلئے بھی مضر ہے اور اقوام کے لئے بھی!''
>
> ''الزام تراشیوں اور تہمت طرازیوں کا طوفان جب کسی کے خلاف چلے خواہ وہ کوئی فرد ہو یا قوم! اسے اپنا مکمل جائزہ لینا چاہئے، اور اس حوصلے سے جائزہ لینا چاہئے کہ اگر کوتاہی سامنے آئے گی تو اس کا اعتراف بھی کیا جائے گا اور اس کی اصلاح بھی کی جائے گی، افراد اور قوموں کی زندگی میں یہ مرحلہ بہت سخت آتا ہے کہ کوتاہی کا اعتراف نہ ہو اور اس کی اصلاح کا حوصلہ نہ ہو، زندہ قومیں کشادہ دلی کے ساتھ اپنی کوتاہیوں اور کمیوں کا جائزہ لیتی ہیں اور اگر کوئی دوسرا نشاندہی کرتا ہے تو شکریے کے ساتھ قبول کرتی ہیں۔
>
> میں چونکہ مدارس ہی کا پروردہ ہوں۔ ابتداء شعور سے اب تک کی پوری زندگی مدارس میں ہی بسر ہوئی ہے۔ میری زندگی کی تمام ضروریات مدارس ہی چہار دیواری سے پوری ہوئی ہیں، میں نے یہاں زندگی کا ہر رنگ دیکھا ہے۔ اس لئے میں اپنے اوپر حق سمجھتا ہوں کہ وہ باتیں لکھ دوں جو میں نے محسوس کی ہیں۔ ان کے ادا کرنے میں اگر کوتاہی ہو یا تعبیر میں غلطی ہو تو اس سے درگزر کی توقع کے ساتھ لکھنے کی ہمت کر رہا ہوں۔''

ان اقتباسات سے ان مضامین کو...... جو مدارس اسلامیہ کے متعلق لکھے گئے ہیں، یکجا کرنے کی کی غرض وغایت بخوبی سمجھ میں آجائے گی۔

استاذ محترم حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی کو اللہ تعالیٰ بڑے عزم وحوصلہ کا انسان بنایا ہے، اسی کے ساتھ ملت کی دردمندی اور ہمدردی وغمخواری کا بھی بڑا حصہ ودیعت فرمایا ہے، یہی وہ جذبات تھے جوان مضامین کے لکھنے کا محرک اور سبب

بنے، جن مقاصد کو پیش نظر رکھ کر یہ لکھے گئے، باری تعالیٰ اسے پورا کریں۔ اور اسے مدارس کی اصلاح اور ترقی کا سبب بنائیں۔

اس میں شامل اکثر مضامین ماہنامہ ضیاء الاسلام شیخوپور میں شائع ہوئے ہیں، ایک مضمون ''علم وعلماء اور نصاب تعلیم'' ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، اور ''نصاب تعلیم جائزے اور مشورے'' مجلّہ المآثر مئو میں شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ایک دو مضامین ماہنامہ انوارالعلوم جہانا گنج میں شائع ہوئے تھے۔

باری تعالیٰ اس سعی وکاوش کو قبول فرمائیں، اور اسے ہماری اصلاح کا ذریعہ بنائیں۔

ضیاء الحق خیرآبادی
ایڈیٹر ماہنامہ ضیاء الاسلام
واستاذ مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور، اعظم گڈھ
یکم/ربیع الاول ۱۴۲۵ھ مطابق ۲۲/اپریل ۲۰۰۴ء پنجشنبہ

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

ہندوستان میں مدارس اسلامی کی کیا حیثیت ہے؟ یہ بات اہل نظر پر پوشیدہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلامی حکومت کے زوال کے بعد یہاں کے مسلمانوں کو مدارس اسلامیہ کی شکل میں ایک مضبوط اور محفوظ پناہ گاہ عطا فرمائی ہے، جس کے حصار میں دین وایمان کی حفاظت ہوتی ہے۔

صدیوں پہلے کی بات ہے، کسی خطۂ زمین پر کافرانہ نظامِ حکومت تھا۔ وہاں کا حاکم اس بات پر تلا ہوا تھا کہ دین حق کا کوئی رواج باقی نہ رہے، اس دور کے لحاظ سے جو سیاسی اور مذہبی ہتھکنڈے ہو سکتے تھے، دین حق کے نام ونشان مٹانے میں استعمال کر لئے گئے تھے، اس وقت چند جوان تھے، جو اپنے ایمان پر پختہ تھے، ان کے سامنے دو راہیں تھیں، ایک یہ کہ وہ برملا اعلان حق کر کے اس کافرانہ نظام حکومت کے مدمقابل کھڑے ہو جاتے، اور اپنے غلبۂ واقتدار کی جدوجہد کرتے، پھر وہ ظالم بادشاہ کی دستبرد میں آ کر جامِ شہادت نوش کر کے زندۂ جاوید ہو جاتے، یا حالات کی سنگینی میں ایمان بھی کھو دیتے۔ دوسرے یہ کہ اپنے دین وایمان کو بچانے کے لئے کوئی ایسی راہ اختیار کرتے کہ ایمان بھی بچتا، اور اس دنیا کی زندگی بھی محفوظ رہتی، بجائے سیاسی چھیڑ چھاڑ اور غلبۂ واقتدار کی کشمکش کے یکسوئی کے ساتھ اپنے گرانمایہ ایمان وعمل کی حفاظت میں لگتے، شاید **اللہ تعالیٰ** بعد میں اس کی برکت سے حالات پلٹ دیں۔

حق تعالیٰ نے قرآن پاک میں خبر دی کہ ان جوانوں نے دوسری راہ اختیار کی، اور بجائے کافرانہ نظام حکومت کے سامنے ڈٹ جانے اور مقابلہ کرنے کے، ایک مرتبہ اعلانِ حق کیا، اور باہم مشورہ کر کے ایک پہاڑی کہف (کھوہ) میں پناہ لینے چلے گئے وہاں ایمان کی حفاظت تو یقینی تھی، کیونکہ کفر کی نگاہوں سے وہ روپوش ہو چکے تھے،

مگر جان کا مسئلہ اور ضروریات زندگی کا معاملہ اہم تھا۔ یہاں کیا کمائیں گے؟ اور کیا کھائیں گے؟ پھر زندگی کی دوسری ضروریات سے کیسے عہدہ برآ ہوں گے؟ یہ سوال بہت مشکل تھا، مگر ایمان کے تحفظ وبقاء کے خیال نے اس کی پرواہ نہ ہونے دی، تاہم اس سے صرف نظر ممکن نہ تھا۔ کھوہ میں پہونچ کر وہی ایمان جو انھیں یہاں تک لے کر آیا تھا، اسی ایمان نے ایک راستہ ان پر کھولا۔ انھوں نے پورے اعتماد کے ساتھ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں دعا کی کہ﴿ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا﴾ سورہ کہف: ۱۰) اے ہمارے پروردگار! آپ ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرمایئے۔ اور ہمارے لئے ہمارے اس معاملہ میں ہدایت کا سامان مہیا فرمادیجئے۔

مطلب یہ ہے کہ زندگی کیلئے اور ایمان ویقین کیلئے جس جس سامان رحمت کی ضرورت ہے، سب کا انتظام آپ فرمادیجئے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور انھیں نیند کی آغوش میں سلادیا، اور بغیر اسباب ظاہر کے ان کی زندگی، صحت اور حفاظت کا مکمل انتظام تین سو سال تک قائم رکھا۔ پھر جب ان کی آنکھ کھلی تو اس خطۂ زمین پر ایک خوشگوار انقلاب آچکا تھا، کافرانہ نظام حکومت فنا ہو چکا تھا۔ باطل کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ اہل حق غلبہ پاچکے تھے۔ اس ہدایت میں کیا ان سونے والے اصحابِ کہف کا دخل نہیں تھا؟ اسباب ظاہر کی خوگر نگاہ تو یہی سمجھے گی کہ اس انقلاب میں ان سونے والوں کا دخل نہیں ہے۔ لیکن قرآن نے جس سیاق میں یہ واقعہ بیان کیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ، اس ہدایت کے پھیلنے اور انقلاب کے آنے میں اصحاب کہف کا یہ خاموش عمل ہی اصل عامل ہے، ان کے اس مجاہدانہ اور متوکلانہ اقدام کا یہ ثمرہ ظاہر ہوا کہ دنیا بدل گئی۔

قرآن میں بیان کردہ اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا میں انقلاب لانے کا ایک ہی ذریعہ نہیں ہے کہ کفر سے راست ٹکر لی جائے۔ حالات کے لحاظ سے ٹکراؤ کا راستہ بدلا بھی جاسکتا ہے، البتہ روح دونوں جگہ ایک ہوگی، وہ یہ کہ اللہ پر کامل ایمان اور مکمل توکل انسان کا شعار ہو، پھر ہجرت بھی سرچشمۂ ہدایت ثابت ہوگی، اور

جہاد وقتال بھی! دنیا طلبی اور اقتدار پسندی ہر دو صورت میں نہ ہو، ورنہ خدا کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔

یہ واقعہ جو ہم نے قرآن کریم میں پڑھا، پچھلی تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنی پسندیدگی کی مہر اس پر لگا کر ہمیشہ کے لئے اہل ایمان کے واسطے ایک لائحہ عمل متعین کردیا ہے۔

اب آئیے، اس دور میں آئیے، جس کا ایک حصہ ہم اور ہمارے قریبی اسلاف ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت کا مکمل خاتمہ ہوگیا۔ اس وقت انگریزوں سے راست ٹکراؤ کا انتظام، اس ملک والوں نے بالخصوص مسلمانوں نے کیا تھا۔ مگر اس ٹکراؤ کے نتیجے میں جو کچھ رہی سہی برائے نام مسلمانوں کی حکومت تھی وہ بھی ختم ہوگئی، علماء اسلام نے اس ٹکراؤ میں بڑا ہمہ گیر حصہ لیا تھا۔ اس لئے انگریزوں نے انھیں خاص طور سے اپنے نشانے پر رکھا، اور علماء شہادت سے سرفراز ہوئے، جو بچ گئے تھے، اب ان کے سامنے وہی دوسرا راستہ رہ گیا تھا، جو اصحابِ کہف نے اختیار کیا تھا، چنانچہ موجود علماء نے بھی وہی راہ اختیار کی، اور اپنے کو کافرانہ نظام حکومت کے سامنے سے ہٹالیا۔ ایک خاصی تعداد ہجرت کرکے ارضِ اسلام یعنی حرمین شریفین چلی گئی، حتیٰ کہ اس وقت جو بزرگ امیر المومنین بنائے گئے تھے یعنی حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ وہ بھی مکہ شریف پہونچ گئے، لیکن اپنے دو خلفاء کو ہندوستان میں چھوڑ گئے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی **قدس سرہما**

ان دونوں بزرگوں نے اپنے کو حکومت وقت کی نگاہ سے اس طرح ہٹایا کہ ایک تعلیم گاہ کا حصار بنالیا، اور اس میں روپوش ہوگئے، یہ مدرسہ ان کیلئے بمنزلۂ کہف کے تھا۔ یہاں بھی معاش ومعیشت کا سوال تھا، تو ان لوگوں نے بھی توکل اور دعا سے کام لیا۔ پھر ایک بڑی تعداد اس کہف میں آتی چلی گئی، اس مدرسہ میں اور اس کے زیر اثر دوسرے مدرسوں میں ایسی تعلیم کا انتظام کیا گیا، جس سے کافرانہ حکومت کو نہ کوئی

سروکار ہو، نہ بظاہر کوئی خطرہ! حکومت کی نگاہ سے بچ کر دین وایمان کے تحفظ کا مستحکم عمل یہاں ہوتا رہا، دنیا کا قافلہ جس طور پر سفر کر رہا تھا، اس کے لحاظ سے مدرسے والے گویا کہ خواب غفلت میں تھے، دنیا جدھر بھاگ رہی ہے، یہ ادھر رخ ہی نہیں کرتے، اس لئے دنیا انھیں سوتا سمجھ کر آگے بڑھتی چلی گئی اور یہ اپنی آخرت اور اپنا دین سنبھالے بیٹھے رہے، دنیاوی نظام کے لحاظ سے ان کی معاش اور دوسری ضروریات زندگی کا مسئلہ قابل غور تھا، مگر انھوں نے اس پر غور کرنے کے بجائے خدا کے حوالے کر دیا۔

ان بزرگوں نے ایک نظام بنایا کہ ایمان واسلام یہاں محفوظ رہے، اور بحمد اللہ وہ محفوظ رہا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک یہ **کہفی نظام** چلتا رہا۔ بہت سے لوگوں نے انھیں طعنہ دیا کہ یہ زمانے سے بے خبر لوگ آخر زمانے کی خبر کیوں نہیں لیتے، کفر بڑھا اور چڑھا چلا جا رہا ہے، مگر یہ خاموشی کے ساتھ اپنی بے خبری میں مست رہے۔ پھر جب ۹۰؍سال کے بعد ایک انقلاب آیا تو زمین کے نقشے پر مسلمانوں کی ایک سیاسی طاقت پاکستان کے نام سے وجود میں آچکی تھی، جو زمین کے دو بڑے حصوں پر مشتمل تھی، پھر تکوینی طور پر وہ دونوں حصے الگ الگ ملک بن گئے۔ یہ دونوں ملک چاہے جیسے ہوں، مگر ان کا مذہب اسلام ہے۔ اور یہ مدارس دونوں جگہ آباد ہیں۔ ہم جس خطۂ زمین پر ہیں، اس کا مذہب اسلام نہیں ہے، لیکن یہاں بھی مدارس کے کہف کی شکل میں ایمان واسلام کے تحفظ کا پورا انتظام موجود ہے۔

تو یہ مدارس درحقیقت دین وایمان کے تحفظ کے بہترین قلعے ہیں۔ ان کا نظام وہی بہتر ہے کہ کفر وسیاست کی نگاہیں ان پر نہ پڑیں۔ اصحابِ کہف نے بیدار ہونے کے بعد اپنے ایک آدمی کو کھانے کیلئے باہر بھیجنے کا جب ارادہ کیا تو اس باہر جانے والے کو ہدایت کی کہ ﴿**فَلْيُنْظُرْ أَيُّهَا أَزْكىٰ طَعَاماً فَلْيَاتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَداً**﴾ سورہ کہف: ۱۹) مطلب یہ ہے کہ جانے والا پاکیزہ اور حلال کھانے کی جستجو کرے اور اس میں سے کچھ کھانا لے کر آئے، اور اس طرح آہستگی

اور خفیہ طریقے پر جائے کہ تمہارے وجود کا کسی کو پتہ نہ چلے۔ کیونکہ ﴿إنَّهُمْ إنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ أوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْا إذاً أبَداً﴾ سورہ کہف: ۲۰) اگر وہ تم کو جان لیں گے تو تمہیں پتھروں سے ماریں گے یا تم کو اپنی ملت میں لوٹا لیں گے، اور اگر ایسا ہوا تو تم کبھی کامیاب نہ ہوسکو گے۔

آج بھی ان مدارس کیلئے یہی طریقۂ کار متعین ہے کہ کفر ان کے احوال اور ان کی سرگرمیوں پر مطلع نہ ہو، ورنہ یہ کافر انھیں ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے، تہمتیں لگائیں گے، پریشان کریں گے، یا پھر اپنے طور طریقے پر لانے کی جدوجہد کریں گے۔ ان مدارس کا خاموش عمل ہی مؤثر ہے، اور یہ نہ سمجھیں کہ ان کا یہ خاموش عمل بے اثر ہوگا، یا اس سے ان کی معیشت تباہ ہوگی۔ اللہ پر بھروسہ کریں، تو دین و ایمان بھی محفوظ رہے گا۔ جان کی بھی حفاظت ہوگی، اور بقدر ضرورت معاش کا بھی انتظام ہوتا رہے گا۔ اور خوشگوار انقلاب کے دروازے پر دستک بھی ہوتی رہے گی۔

کہنے والے جو چاہیں کہتے رہیں، طعنہ دینے والے جو چاہیں طعنہ دیتے رہیں لیکن مدارس کو انھیں خطوط پر عامل رہنا چاہئے جو ابتداءً بزرگوں نے متعین کردئے تھے۔ بانیٔ دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے چند رہنما اصول دارالعلوم دیوبند کے لئے ابتداءً متعین فرمائے تھے، یہی اصول تمام مدرسوں کے لئے ہیں۔ ان میں سے چند دفعات یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

(☆)......اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں ہے جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرطِ توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہوجائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہوجائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

(☆)......سرکاری شرکت اور امراء کی شرکت بھی مضر معلوم ہوتی ہے۔

(☆)......تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو، بالجملہ حُسنِ نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

(☆)...... یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علمائے روزگار خود بیں اور دوسروں کے درپئے توہین نہ ہوں، خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

کاش کہ اب بھی اسی طریقے پر کام ہوتا رہتا۔ اور لوگوں میں پروپیگنڈے کا شوق نہ ہوتا، اور ہر خزانہ سے مال حاصل کرنے کی ہوس نہ ہوتی، بلکہ صرف وہی مال حاصل کیا جاتا جو خوب پاکیزہ ہوتا۔ اور معلوم ہے کہ حکومتوں کا مال کتنا پاکیزہ ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ ان سے ربط رکھا جائے، تو وہ ہمارے احوال پر مطلع ہو کر ہمیں جان اور ایمان دونوں طرح کی مشکلات میں ڈال دیں گے اور ایسا ہی ہو رہا ہے۔ اب دین وایمان کے ان قلعوں میں ہمارے ہی کچھ لوگوں نے حکومت وقت اور اس کے کافرانہ نظام کو پہونچا دیا ہے۔

بہر حال مدارس کی جو حیثیت روز اول سے چلی آرہی ہے، وہی باقی رہنی چاہئے۔ اس کتاب میں جو مضامین شامل ہیں۔ ان سب کی مرکزی روح یہی ہے، اسی نقطۂ نظر سے یہ مضامین لکھے گئے۔ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں، لیکن حاصل سب کا ایک ہے۔

مدارس کے اربابِ انتظام، حضراتِ اساتذہ اور عزیز طلبہ بغور انھیں پڑھیں، شاید کوئی بات اثر کر جائے۔

اعجاز احمد اعظمی
مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور، اعظم گڈھ

۵؍ربیع الاول ۱۴۲۵ھ مطابق ۲۶؍اپریل ۲۰۰۴ء دوشنبہ

اہل مدارس کی خدمت میں

اسلامی ماہ وسال کے اعتبار سے شوال میں ہمارے عربی دینی مدارس اپنے تعلیمی سال کا آغاز کرتے ہیں۔ علوم دین کے شائق طلبہ اپنی اپنی پسند کے مدارس میں داخلہ کے لئے پہونچتے ہیں، مدارس میں داخلہ اور امتحان داخلہ کی ہماہمی ہوتی ہے۔ دو ماہ کی خاموشی اور تعطیل کے بعد مدارس کے در و بام پھر تعلیم وتدریس کی گرم بازاری سے معمور نظر آنے لگتے ہیں۔ ہمارے ملک پر اللہ تعالیٰ کا یہ بڑا احسان ہے کہ مدارس ومکاتب کے ذریعہ علم دین کی بقا وتحفظ کا ایک ناقابل تسخیر نظام وجود میں آ گیا ہے۔ انھیں مدارس کی برکت ہے کہ باطل کی ہزار زور آزمائیوں کے باوجود ہندوستان کے طول وعرض میں دین اور علم دین کا نور موجود ہے، اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم کا جس قدر شکر ادا کیا جائے، کم ہے۔

لیکن جس نظام اور تحریک پر ایک مدت گزر جاتی ہے، اس میں مختلف جہتوں سے کمزوریاں آنے لگتی ہیں۔ اگر ان کا جائزہ لیا جاتا رہے، اور ان کی کمزوریوں کو دور کرنے کی مخلصانہ جدوجہد کی جاتی رہے، تو نظام درست رہتا ہے، اور اگر ''سب ٹھیک ہے'' کہہ کر ان کمزوریوں اور خرابیوں سے صرف نظر کر لیا جائے، تو آج کی ایک معمولی کمزوری کل کو ایک بڑی ہلاکت بن سکتی ہے۔ قومیں جب زندہ ہوتی ہیں، تو وہ اپنا احتساب خود کرتی رہتی ہیں۔ اپنی کوتاہیوں اور خرابیوں کا کھلے دل کے ساتھ اعتراف کرتی ہیں۔ اور پھر ان کی اصلاح کی کوشش کرتی ہیں، اور جب قوم پر مردنی چھاتی ہے تو اگر اس کے کسی عیب پر انگلی رکھ دی جائے تو وہ بھڑک اٹھتی ہے، اس لئے نہیں کہ اس میں وہ عیب نہ تھا، اور اس پر تہمت لگا دی گئی ہے بلکہ اس لئے کہ اس کا عیب کیوں کسی

نے جان لیا، اور کیوں اس کی خبر دی گئی، یہ حالت افراد کے لئے بھی مضر ہے اور اقوام کے لئے بھی!

ہندوستان کا ایک مشہور ادیب، بہت بدصورت تھا۔ ادیب بہت بڑا تھا، صحافت کا امام، قلم کا بادشاہ، معلومات کا زبردست خزانہ مگر بدصورت بھی بہت زیادہ، ایک حجام اس کا خط بنا رہا تھا، جیسا کہ عادت ہوتی ہے اس نے بالوں کی اصلاح کر کے آئینہ اس کے سامنے پیش کر دیا۔ اس میں اس نے اپنی صورت جو دیکھی، تو دفعۃً طیش میں آکر ایک زناٹے کا طمانچہ اس غریب حجام کو رسید کر دیا۔ بیچارہ حجام ہکا بکا رہ گیا۔ دیکھنے والے بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ بعد میں اس نے بتایا کہ میں بہت بدصورت ہوں، اس لئے کبھی آئینے میں اپنی صورت نہیں دیکھتا، اب اس نے جو صورت میری دکھادی ہے تو اب کئی دن تک میں قلم پکڑنے کے قابل نہیں رہوں گا۔ احساس بدصورتی مجھے ستاتی رہے گی۔ یہ ایک نفسیاتی کمزوری ہے۔ اپنی کمزوری کی اطلاع پر چراغ پا ہونا، اسی باطنی رذیلہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

بحمد اللہ ہمارے ارباب مدارس اپنا احتساب کرتے رہتے ہیں۔ انھیں اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا احساس بھی رہتا ہے۔ اور وہ ان کا اعتراف بھی کرتے رہتے ہیں۔ اس جگہ صرف ایک بات کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

وہ یہ کہ ہمارے یہ مدارس، صرف درسگاہیں نہیں ہیں۔ طلبہ کے لئے اقامت گاہیں بھی ہیں۔ طلبہ مدرسہ کی چہار دیواری میں چوبیس گھنٹے رہتے ہیں، ان کی زندگی کا یہ قیمتی حصہ مدرسہ کے اندر تعلیمی مشغولیات میں محصور ہوتا ہے۔ اور اکثر مدارس میں اساتذہ کی بھی بڑی تعداد مدرسہ میں ہی مقیم ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں مدارس کی ذمہ داری صرف اتنی نہیں ہے، انھیں کتابیں پڑھا دی جائیں۔ اور مطمئن ہو جایا جائے کہ ہم نے اپنا فریضہ ادا کر دیا۔ طلبہ نے جب اپنے کو مکمل طور پر مدارس کے آستانے پر ڈال دیا ہے، تو جس طرح ان کے کھانے پینے، دوا علاج، اور رہائش کے انتظامات ہمارے

مدارس کرتے ہیں، اسی طرح ان کی اخلاقی اور عملی تربیت پر بھی توجہ دینی چاہئے۔ تربیت کی کمی کی وجہ سے ایک طالب علم، دین پڑھتا رہتا ہے لیکن اس سیرت وکردار اور اس کی چال ڈھال سے دین سے بے رغبتی اور اعراض بھی ظاہر ہوتا رہتا ہے، اس طرح بہت سے طالب علموں کا دل دو عملی کا شکار ہو جاتا ہے۔ کتابیں کہہ رہی ہیں کہ دین کا نمونہ یہ ہے، اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ خلوص چاہئے، قناعت چاہئے، دین سے وفاداری چاہئے، اللہ پر توکل اور بھروسہ چاہئے، اخلاق ایسے ہونے چاہئیں، معاملات یوں ہونے چاہئیں۔ یہ تو کتابوں کی تعلیم ہوتی ہے، لیکن تربیت کے ذریعے سے چونکہ یہ باتیں دل میں اتری ہوئی نہیں ہوتیں اس لئے ان کا اثر بدن پر ہوتا ہے، زبان پر ہوتا ہے۔ مگر قلب میں کچھ اور باتیں بھی جاگزیں ہوتی ہیں۔ اور یہ وہ باتیں ہوتی ہیں جن کا آج ساری دنیا میں غل مچا ہوا ہے کہ مال کی بہتات چاہئے، معیار زندگی بلند ہونا چاہئے۔ پیٹ کی ہر خواہش پوری ہونی چاہئے لذت نفس کی تسکین کا سامان چاہئے۔ اس کشمکش میں ہمارا طالب علم، جیسا طالب علم ہونا چاہئے، نہیں ہو پاتا۔ طالب علموں کی نوجوانی ہوتی ہے، اور اس عمر میں آدمی لذت وخواہش کی طرف بے تحاشا بھاگتا ہے۔ یہ وقت بہت نازک ہوتا ہے۔ اگر اس وقت میں آدمی صحیح راہ اختیار کر لیتا ہے، تو بہت مفید بنتا ہے، اور اگر اسی وقت میں خدانخواستہ راستہ غلط ہو گیا تو راہ پر آتے آتے بڑی دیر لگ جاتی ہے۔

یہ طلبہ ارباب مدارس کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانتیں ہیں، رسول اللہ ﷺ کے مہمان ہیں۔ ان کے قلب وباطن کی تربیت کی پوری کوشش اگر نہیں کی گئی، تو امانت کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔

طالب علموں پر سب سے زیادہ اثر اپنے اساتذہ کا ہوتا ہے۔ اگر استاذ علم و اخلاق اور اخلاص وصداقت کا نمونہ ہو تو طالب علم اسی رنگ میں ڈھلتا چلا جائے گا، استاذ میں جس قدر تدین، اور تقویٰ ہوگا، طالب علم کو اسی قدر اس سے عقیدت ومحبت

ہوگی، اور سیرت سازی کا سارا تعلق عقیدت ومحبت اور ادب واحترام ہی سے ہے، اگر کسی کو کسی سے تعلق وعقیدت نہ ہو، تو اس کی نصیحت کارگر نہ ہوگی، اور محبت وعقیدت ہو تو بغیر کچھ کہے ہوئے بھی آدمی بدلتا چلا جاتا ہے، جو لوگ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی علیہ الرحمہ کی صحبت میں رہے، وہ صرف ان کے علم کی گہرائی اور گیرائی کی وجہ سے باکمال نہیں ہوئے تھے، بلکہ انھیں مولانا سے اس درجہ محبت وعقیدت تھی کہ وہ ان کا شائبہ ناگواری بھی برداشت نہیں کرسکتے تھے، پھر ان کی سیرتوں میں مولانا کی زندگی جھلکنے لگی، جن لوگوں نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کی صحبت پائی، وہ ان کی نیکی، سادگی، جذبۂ خدمت اور تواضع وللّٰہیت کی وجہ سے ان پر فدا ہوئے۔ اور اس طرح ان کی سیرت چمکتی چلی گئی۔ آدمی نمونہ دیکھ کر بنتا ہے، صرف باتیں سن کر نہیں، شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ نے فرمایا کہ جس وقت آدمی کا دیکھنا تمھیں نفع نہ دے، تو اس کی بات بھی تم کو فائدہ نہیں پہونچا سکتی، مدارس میں پہلے ایسے نمونے کافی ہوا کرتے تھے، طلبہ ان سے فائدہ اٹھاتے تھے اور یہ حضرات بھی محبت وشفقت کے ساتھ ان کی نگہداشت کرتے رہتے تھے، آج بھی وہی طریقہ متعین ہے، طلبہ کی تربیت کا بڑا عامل خود اساتذہ کی سیرت ہے۔ یہ جب فکر وعمل کی درستی کیلئے کوشاں رہیں گے، تو طلبہ کی اصلاح کی بھی کوشش کرسکیں گے۔

یہ حضرات علماء ہیں۔ ان سے کچھ عرض کرنا داخل گستاخی ہے۔ لکھنے والے کا نہ یہ منصب ہے، اور نہ منہ ہے تاہم چونکہ راہِ عمل یہی ہے، اسی لئے ضرورۃً اس گستاخی کا ارتکاب کرنا پڑ رہا ہے۔

ہمارے مدارس کے اساتذہ اور ارباب انتظام خود اس بات کی طرف متوجہ ہوں کہ اپنی زندگی، اپنے اخلاق اور اپنی سیرت وکردار نیز اپنے معاملات کا اس علم کی روشنی میں جائزہ لیتے رہیں، جو انھیں رسول اللہ ﷺ سے **وراثۃ** ملا ہے۔ جہاں جہاں وہ علم ترمیم واصلاح کا مطالبہ کرے، وہاں وہ اپنے ذاتی اغراض، دنیاوی مفاد اور

نفس کی لذت وخواہش سے بلند ہوکر اس مطالبہ کو پورا کریں۔ دین وشریعت کے ساتھ مکمل وفاداری اختیار کریں، تقویٰ کو امام بنائیں، اور اس کے ساتھ طالب علموں کی دینی واخلاقی تربیت کا اہتمام کریں، تو یہ طلبہ دین کے بھی وفادار ہوں گے، اور اساتذہ کے بھی ہمیشہ کے لئے ممنونِ کرم ہوں گے۔

اب سے پہلے طالب علمی سے فارغ ہونے والوں کا دستور تھا کہ فراغت کے بعد کسی اللہ والے سے تعلق قائم کرتے، ان کی خدمت میں رہ کر اپنے نفس کا تزکیہ کراتے، اور پھر علم وعمل کا اچھا نمونہ بنتے، اس طرح تربیت یافتہ لوگوں کی اور اہل ذکر کی کچھ نہ کچھ مقدار ہر مدرسے میں ہوتی، اور ان کے انفاس طیبہ کے اچھے اثرات مدرسہ میں اور طالب علموں پر ہوتے، لیکن اب حضرات اہل علم نے دنیا کے تقاضوں اور تنقیدوں کی یلغار سے اس کی طرف التفات ہی ختم کر دیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک بڑے خیر سے محرومی ہوتی چلی جا رہی ہے۔

یہ ایک ایسی ضرورت ہے، جس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اخلاق اچھے نہ ہوں، قول وعمل میں تضاد ہو، تو علم بھی بے ثمر ہو کر رہ جاتا ہے۔

طلبہ کی تربیت میں دوسرا مؤثر عامل یہ ہے کہ ان کے لئے کم از کم ہر ہفتہ میں ایک تذکیری مجلس منعقد کی جائے۔ جس میں اساتذہ میں سے ہی کوئی صاحب وقت اور حالات کے مناسب ایسی گفتگو کریں، جو طالب علموں کیلئے دلنشیں ہو۔ اور کبھی کبھی مناسب سمجھیں تو باہر سے کسی بزرگ یا استاذ کو اس کیلئے دعوت دیں۔ جلسے کا اہتمام نہیں بلکہ صرف مجلس تذکیر ہو، یہ عمل اگر مسلسل جاری رہے، تو اس کے بہت فوائد ظاہر ہوں گے، اور طلبہ کی زندگی میں ایک خوشگوار اثر پیدا ہوگا۔ اور بہت سے وہ مسائل ومعاملات جو ارباب انتظام کیلئے دردِ سر بنے رہتے ہیں، ان سے نجات مل جائے۔ ہاں شرط یہ ہے کہ جو صاحب بھی گفتگو کریں، وہ صرف تربیتی امور کے بیان پر اکتفا کریں۔ کسی کی ذاتیات سے تعرض نہ کریں، اور نہ ڈھکے چھپے کسی پر کوئی تبصرہ کریں، صرف عام تذکیری

انداز ہو، اس میں علم کے لئے جدوجہد، علم دین کی اہمیت وعظمت اچھے اخلاق کی تفصیلات اخلاقِ بد کے برے اثرات کا بیان ہو، اور ساتھ ہی ساتھ رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام اور مشائخ وبزرگانِ دین کے احوال وواقعات کا تذکرہ ہو اور طلبہ کو ہدایت ہو کہ بطور سبق اس کا بھی مذاکرہ کریں۔ اسلاف کے حالات وواقعات میں بڑی تاثیر ہے، اگر صرف مشائخ دیوبند ہی کے دلآویز ومؤثر واقعات طلبہ کے سامنے مسلسل لائے جائیں تو بڑے فوائد ظاہر ہوں۔ یہ حضرات اس دورِ آخر میں اللہ تعالیٰ کی حجت وبرہان تھے، ان کے اقوال وملفوظات اور ان کی تصنیفات اور ان کے احوال وسوانح میں ایک عجیب تاثیر ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق دیں۔

ماہنامہ انوار العلوم جہانا گنج، فروری ۱۹۹۶ء)

☆☆☆☆☆

ارباب انتظام اور حضرات اساتذہ کی خدمت میں چند گزارشیں

آغاز سخن کی یہ سطریں میں ۱۵رشعبان کو لکھ رہا ہوں۔ عربی دینی مدارس عموماً اس تاریخ تک اپنے سالانہ امتحان سے فارغ ہوجاتے ہیں۔ اور طلبہ واساتذہ دو ماہ کی تعطیل پاکر اپنے گھروں کو روانہ ہوجاتے ہیں، اہل انتظام اگلے سال کے لئے مالیات کی فراہمی کے اہتمام میں مصروف ہوجاتے ہیں، کیونکہ مدارس کے مالیات کی جو ریڑھ کی ہڈی ہے، وہ زکوٰۃ وصدقات کی رقوم ہیں، اور مسلمان عموماً زکوٰۃ کا حساب اور اس کی ادائیگی رمضان میں ہی کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں پر عظیم احسان ہے کہ اسلامی حکومتوں کے زوال کے بعد دین اور علم دین کی بقاء وتحفظ کے لئے مدارس ومکاتب کی راہ ان پر آسان کی گئی۔ اس راہ سے مسلسل ایسے برگزیدہ افراد اور طاقتور اصحاب عزائم نکل نکل کر آرہے ہیں جن کی عزیمت اور جن کی ایمانی طاقت سے اسلامی معاشرہ زندگی سے معمور اور شاداب وپُر نور ہے، ایمان وعمل اور اخلاق وانسانیت کے اس دورِ زوال میں جہاں جہاں روشنی کی شمعیں فروزاں ہیں، وہ انھیں مدارس کی برکت ہے۔

مدارس سے نکلنے والے علماء ومشائخ کی ایک لمبی تعداد ہے، جنھوں نے دنیا اور زینت دنیا سے منہ موڑ کر تمام مال ومتاع سے رشتہ توڑ کر ایک اللہ سے تعلق جوڑا، وہ اپنے محبوب کے دروازے پر مضبوطی سے بیٹھ گئے، تو پھر موت ہی کے ہاتھوں نے

اٹھایا۔ انھوں نے جو عہد وفا باندھا تھا، اسے پورا کردیا۔ چراغ سے چراغ جلتے ہیں، کم سہی، ٹمٹماتے سہی، بہر حال انھیں چراغوں سے روشنی حاصل کرکے اب تک چراغ جل رہے ہیں۔ اور جہل وضلالت کی اندھیریوں کو مٹانے میں لگے ہوئے ہیں۔

کفر وشرک کے پرستار کہتے ہیں کہ یہ مدارس فساد کی تعلیم دیتے ہیں، دہشت گردی کی تربیت کرتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ کفر وشرک کو مٹانا، اسے جڑ سے اکھاڑنا، جہالت کی تاریخ کو مٹانا، ظلم کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا، بے انصافی کو کچلنا اور محسن کشی اور ناشکری کو ختم کرنے کی کوشش کرنا، اگر فساد ہے، تو بے شک ہم اقرار کرتے ہیں، بلکہ اعلان کرتے ہیں کہ مدارس فساد کی تعلیم دیتے ہیں، اور دہشت گردی کی تربیت کرتے ہیں۔ فساد اور دہشت گردی کا یہ الزام آج نیا نہیں ہے۔ کفر نے ہمیشہ اسلام کو دہشت گرد کہا ہے۔ درحقیقت فساد اور فتنہ اس دنیا میں کفر وشرک ہے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (سورہ بقرہ:۱۹۱) فتنہ یعنی شرک قتل سے بڑھ کر گناہ ہے، لیکن چونکہ دنیا میں تعداد اور ساز وسامان کے لحاظ سے فساد زیادہ ہے، اور وہ غل مچاتا ہے کہ اللہ پر ایمان رکھنے والے دہشت گرد ہیں، تو بظاہر فسادیوں کا ہی غلبہ نظر آنے لگتا ہے۔ ورنہ جو لوگ دنیا میں اپنے آپ کو مصلح ثابت کررہے ہیں، وہ سراپا فساد اور دہشت ہیں، ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ اَلَا اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَا يَشْعُرُوْنَ﴾ (سورہ بقرہ:۱۲/۱۱) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت مچاؤ، تو کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح چاہتے ہیں، خوب سمجھ لو کہ یہی فسادی ہیں، مگر انھیں شعور نہیں۔

بے شک فسادیوں کا یہی دستور ہے کہ وہ اپنے آپ کو امن پسند، مصلح اور معلم اخلاق قرار دیتے ہیں، اور یہ صرف اس لئے کہ ان کے پاس مادی طاقت ہے۔ اسی کے بل بوتے پر جس کو چاہیں دہشت گرد کہہ دیں اور جس کو چاہیں فسادی ٹھہرادیں، ان کی

باتیں بظاہر بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں مگر حقیقت میں وہ بگاڑ ہی بگاڑ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَافِىْ قَلْبِهٖ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ٥ وَإِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ٥ وَإِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ (سورہ بقرہ: ۲۰۴ تا ۲۰۶) اور کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ان کی باتیں دنیاوی زندگی کے معاملات میں اچھی معلوم ہوتی ہیں، وہ اپنے دل کی خوبی پر اللہ کو گواہ بناتے ہیں، حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہیں، وہ دوسری طرف رخ کرتا ہے تو ملک میں فساد مچانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس میں خرابی ڈالے، اور کھیتیوں اور جانوں میں تباہی لائے، اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتے، اور جب ایسے لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو، تو ان کا تکبر انھیں اور گناہ پر بھڑکا دیتا ہے، سو کافی ہے اس کو جہنم، اور بے شک وہ برا ٹھکانا ہے۔

مادی طاقت کے نشہ میں چور افراد اور قوموں کا حال یہی ہے کہ وہ خود تو ہمہ وقت آمادۂ فساد ہوتے ہیں، لیکن اگر انھیں کوئی ٹوک دے، تو بجائے شرمندہ ہونے کے ان کے تکبر کا پارہ اور چڑھ جاتا ہے، وہ مزید سرکشی اور گناہ پر آمادہ ہوجاتے ہیں، اور دوسروں پر غرانا شروع کردیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں آخری سزا کا فیصلہ سنادیا ہے کہ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے، لٰہذا مظلوموں کو عجلت نہیں کرنی چاہئے کہ وہ اسی دنیا میں کسی سزا کی گرفت میں آجائیں، انتظار کریں فیصلے کا دن آرہا ہے۔ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتاً يَّوْمَ يُنْفَخُ فِى الصُّوْرِ فَتَاتُوْنَ اَفْوَاجاً (سورہ النبا: ۱۷/۱۸) بے شک فیصلے کے دن کا ایک وقت مقرر ہے، جس دن صور پھونکی جائے گی، پھر تم غول کے غول چلے آؤ گے۔ اور اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَاداً لِلطّٰغِيْنَ مآباً (سورہ النبا: ۲۱/۲۲) بے شک دوزخ تاک میں ہے، شریروں کا ٹھکانا ہے۔ پس اہل ایمان کو جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ آج بظاہر طاقت وقوت کا غلبہ مشرکین اور شریروں کی طرف ہے، لیکن ہر روز

ایسا نہ ہوگا۔ نقشہ بدلے گا، حالات میں انقلاب آئے گا، فیصلے کے دن کچھ اور ہی رنگ ہوگا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (سورہ النساء: ۱۴۱) اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ فرمائیں گے، اور اللہ تعالیٰ کافروں کو اہل ایمان پر غلبہ کی راہ ہرگز نہ دیں گے۔

دنیا میں یہ صورت حال کہ کفار مسلمانوں کو بالکل ختم کر دیں، یہ غلبہ کفار کو کبھی حاصل نہ ہوگا اور آخرت میں تو کسی اعتبار سے کفار غالب اور اہل ایمان مغلوب نہ ہوں گے۔

یہ گفتگو اس پر چل پڑی کہ دہشت گردوں نے ایمان اور عمل صالح کو دہشت گردی، اور ایمان و عمل صالح کے مراکز کو دہشت گردی کا اڈہ قرار دے رکھا ہے، اسلام کو بدنام کرنے کی پوری کوشش چل رہی ہے۔ ایمان کی روشنی میں ہم اس بات پر بالکل مطمئن ہیں کہ یہ شور وغل ایک بادِ ہوائی سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن الزام تراشیوں اور تہمت طرازیوں کا طوفان جب کسی کے خلاف چلے خواہ وہ کوئی فرد ہو یا قوم! اسے اپنا مکمل جائزہ لینا چاہئے، اور اس حوصلے سے جائزہ لینا چاہئے کہ اگر کوتاہی سامنے آئے گی تو اس کا اعتراف بھی کیا جائے گا اور اس کی اصلاح بھی کی جائے گی، افراد اور قوموں کی زندگی میں یہ مرحلہ بہت سخت آتا ہے کہ کوتاہی کا اعتراف نہ ہو اور اس کی اصلاح کا حوصلہ نہ ہو، زندہ قومیں کشادہ دلی کے ساتھ اپنی کوتاہیوں اور کمیوں کا جائزہ لیتی ہیں اور اگر کوئی دوسرا نشاندہی کرتا ہے تو شکریے کے ساتھ قبول کرتی ہیں۔

میں چونکہ مدارس ہی پروردہ ہوں۔ ابتداء شعور سے اب تک کی پوری زندگی مدارس میں ہی بسر ہوئی ہے۔ میری زندگی کی تمام ضروریات مدارس ہی چہار دیواری سے پوری ہوئی ہیں، میں نے یہاں زندگی کا ہر رنگ دیکھا ہے۔ اس لئے میں اپنے اوپر حق سمجھتا ہوں کہ وہ باتیں لکھ دوں جو میں نے محسوس کی ہیں۔ ان کے ادا کرنے میں

اگر کوتاہی ہو یا تعبیر میں غلطی ہو تو اس سے درگزر کی توقع کے ساتھ لکھنے کی ہمت کررہا ہوں۔

مدرسہ مرکب ہے تین عناصر سے! اربابِ انتظام، اساتذہ اور طلبہ، یہ تینوں عناصر درست ہوں، ان میں باہم موافقت ہو اور سب اپنی اپنی ذمہ داریاں بحسن وخوبی انجام دے رہے ہوں تو مدرسہ عمدہ چلتا ہے۔

بات بہت طویل نہیں ہے۔ خلاصہ صرف اتنا ہے کہ یہ تینوں عناصر اپنے پیش نظر تمام امور ومعاملات میں اللہ اور رسول ﷺ کے احکام وہدایات کو رکھیں، حتی الامکان وہی کام کریں جو شریعت کی جانب سے ان پر لازم ہو، مدرسہ علم دین کی درس گاہ ہے۔ کس کام کا دینی حکم کیا ہے؟ اس کا علم مدرسہ میں بہت آسان ہے۔ بس آدمی اپنے کو پابند رکھے کہ وہ شریعت کے دائرہ سے باہر نہیں نکلے گا اگر کسی معاشرہ میں یہ اہتمام ہو تو اللہ تعالیٰ کی رضا اور رحمت مسلسل برسے گی۔

اربابِ انتظام کی ذمہ داری یہ ہے کہ ادارہ سے وابستہ کارکنان اور مالیات دونوں میں بہت حزم واحتیاط کو پیش نظر رکھیں۔ مدرسہ میں اساتذہ عموماً علماء ہوتے ہیں، علماء کا ایک خاص مقام ہوتا ہے، یہ علماء جو مدارس میں پڑھاتے ہیں۔ اربابِ انتظام کے لحاظ سے ان کی دو نسبتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حضرات عالم دین ہیں اور اس حیثیت سے یہ بہت زیادہ قابل تکریم وتعظیم ہیں، اور دوسری حیثیت یہ ہے کہ یہ اپنی خدمات کا دنیوی معاضہ بصورت تنخواہ ارباب انتظام سے حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح ایک حیثیت ملازمت کی ہوجاتی ہے، اور اس حیثیت سے گویا یہ حضرات ارباب انتظام کے دست نگر ہوتے ہیں، اور ان کے سامنے اپنی خدمات کے سلسلے میں جواب دہ ہوتے ہیں، اپنی حاجات وضروریات کے سلسلے میں انھیں بسا اوقات درخواستیں ارباب انتظام کے سامنے پیش کرنی پڑتی ہیں۔ یہاں اربابِ انتظام سے اکثر چوک ہوجاتی ہے، ان کے سامنے ان علماء کرام کی دوسری یعنی ملازمت والی حیثیت زیادہ نمایاں رہتی

ہے۔ اور اسی تقاضے کے مطابق زیادہ عمل کرنے میں لگ جاتے ہیں، یہ ایک غلطی ہے۔ اس کے نتیجے میں اہل انتظام اور اساتذہ کے درمیان دوری ہونے لگتی ہے۔

اہل انتظام اگر اساتذہ کے بارے میں ان کے علم و فضل کا لحاظ رکھیں اور ان کے ساتھ عظمت واحترام کا وہی معاملہ رکھیں جو شرعاً مطلوب ہے، قانونی معاملات میں بے شک دستور کی پابندی کریں، مگر اس طرح نہیں کہ ان حضرات کی بے وقعتی ہونے لگ جائے، خدمت میں کوتاہی ہو تو بے شک تنبیہ کی جائے، مگر اس طرح نہیں کہ ان کی اہانت ہو جائے، دوسرے ملازمین وطلبہ کے درمیان ان کی رسوائی ہو جائے، نہیں بلکہ اس طرح کہ ان کا احترام بھی برقرار رہے اور تنبیہ بھی ہو۔

دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ نے ایک بار محسوس کیا کہ اساتذہ درس گاہوں میں قدرے تاخیر سے پہونچتے ہیں، انھوں نے کچھ کہا نہیں، انھوں نے اس دروازے پر جس سے اساتذہ گزرتے تھے چارپائی ڈال لی، اور وقت سے پہلے آکر بیٹھ جاتے، کچھ کام کرتے رہتے، اساتذہ نے خود بخود پابندی شروع کردی۔ ایک بزرگ استاذ اپنی بعض مشغولیات کی وجہ سے پھر بھی تاخیر سے آتے رہے، تو ان سے تنہائی میں بہت ادب سے کہا کہ حضرت آپ بہت مشغول رہتے ہیں، تعلیم کے وقت کے کچھ کام میرے سپرد کردیں، میں انھیں انجام دوں گا۔ آپ وقت پر مدرسہ تشریف لایا کریں تاکہ طالب علموں کا نقصان نہ ہو۔

بعض مدارس میں ناظم اور مہتمم کی جانب سے مختلف قوانین اور ہدایات وقتاً فوقتاً جاری ہوتے رہتے ہیں، تعلیم یا انتظام سے متعلق کوئی بات آئی اسے بصورت قانون پیش کردیا جاتا ہے، اس طرح قوانین کی بھرمار ہوجاتی ہے، اور کسی قانون کی عمر چندروز سے زیادہ نہیں رہ پاتی، لیکن جن پر وہ قانون نافذ کیا جاتا ہے، ان کی طبیعتیں اچاٹ ہوجاتی ہیں۔ ایک بے دلی کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے، قانون کی وقعت ختم ہوجاتی ہے، اور علمی فضا پژمردہ ہوکر رہ جاتی ہے۔

بہت غور وفکر کے ساتھ چند اصولی اور ضروری قوانین مرتب کرلیں جن پر عمل درآمد کی پابندی کی جائے۔ باقی جزئی امور کو باہمی رابطہ سے درست کرلیا جائے انھیں اصولی اور قانونی شکل نہ دی جائے۔

اربابِ اقتدار بعض اوقات ایک بڑے مہلک ابتلاء میں گرفتار ہوجاتے ہیں اور وہ ہے خوشامد پسندی۔ حبِّ جاہ سے کون خالی ہوتا ہے، ہر ایک میں یہ مرض ہوتا ہے، بہت محنت اور بہت علاج کے بعد کہیں اس بیماری سے شفا ہوتی ہے۔ لیکن جب کسی کے ہاتھ میں اقتدار آجاتا ہے تو اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اپنی تعریف کی لامتناہی خواہش دل میں موجیں مارنے لگتی ہے، ہر وقت یہی دھن سوار رہتی ہے کہ لوگ تعریف کرتے رہیں، خواہ کوئی کام قابل تعریف ہو یا نہ ہو۔ اگر اتفاق سے کوئی تعریف کرنے والا نہیں ملتا تو ہر مجلس میں، ہر شخص سے خود اپنی اور اپنے کارناموں کی تعریف شروع کردیتے ہیں، عنوان خواہ کچھ اختیار کریں مگر مقصود اپنی تعریف، مدح سرائی اور اپنی تشہیر ہوتی ہے، ان کی ماتحتی میں جو لوگ کام کرتے ہیں، وہ اس نکتہ کو پالیتے ہیں تو جو کوئی سفلہ پن کا شکار ہوتا ہے، وہ منہ بھر بھر کر ان کی تعریف کرتا ہے۔ جا بے جا ہاں میں ہاں ملاتا ہے، اس طرح کے لوگ دل سے نہیں مانتے بلکہ اپنی اغراض حاصل کرنے کیلئے چاپلوسی کرتے ہیں۔ یہ فرض منصبی کی ادائیگی میں چاہے کوتاہی کریں، مگر حاضر باشی، خوشامد گری، مدح سرائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، اس سے حد سے بڑھی ہوئی خوشامد پسندی اور حب جاہ کی پیاس کو وقتی طور سے آسودگی ملتی ہے، پھر یہ لوگ مقرب بن جاتے ہیں، اور معاملات کے سیاہ وسفید میں ان کا دخل ہوجاتا ہے، یہ لوگ کام کے بالکل نکمے ہوتے ہیں، مگر خوشامدانہ پالیسی کی بدولت مقبول ہوتے ہیں، اور جو لوگ واقعی کام کرنے والے ہوتے ہیں، وہ ان چھچھوروں کی چیرہ دستیوں اور چغلخوریوں کی وجہ سے پریشان رہتے ہیں۔

حکومت سے لے کر مدارس ومساجد کے اہتمام وانتظام تک ہر جگہ یہ بیماری

جڑ پکڑے ہوئے ہے۔ لیکن اس سے دین کا کتنا بڑا نقصان ہوتا ہے، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، حب جاہ اور خوشامد پسندی کا لازمی ثمرہ کبر وغرور ہے۔ اور معلوم ہے کہ کبر وغرور کتنی زبردست معصیت ہے۔ ابلیس اسی سے تباہ ہوا۔ آدم کی اولاد کو تو یہ غلطی نہیں کرنی چاہئے۔

مدارس داخلی طور اس بیماری کی وجہ سے بڑی مصیبت میں مبتلا ہیں، ہر شخص خوشامد کا یہ رویہ اپنا نہیں سکتا، پھر وہ اپنے ناکردہ گناہوں کی وجہ سے اربابِ اقتدار کی طرف سے برابر پریشان رہتا ہے۔

پھر یہ سوچنا چاہئے کہ نفس وطبیعت کا یہ جذبہ معاصی کی بنیاد پر ہے، نہ جانے معصیت کے کتنے شعلے اس کی وجہ سے دہکتے ہیں، پھر اللہ کی رحمت، جس کا تعلق طاعت وعبادت سے ہے کیونکر آ سکتی ہے۔

ایک مسئلہ جو اربابِ انتظام سے متعلق ہے، دیکھا جاتا ہے کہ تعلیم کمزور ہے، تربیت کا فقدان ہے، مردم گری کا کارخانہ سست ہے، اور تعمیرات کا کام بے ضرورت بھی جاری ہے، اور زیب وزینت اور نمائش تو ایسی کہ ہر شخص کی نگاہ اس پر پڑے، مدارس کو پختہ ضرور بنائیں، ضروری تعمیرات کرائیں، لیکن اصل توجہ تعلیم وتربیت پر ہونی چاہئے، اگر یہ نہیں تو پتھر اینٹ کی عمارت وبال ہی لائے گی۔ نمائشی تعمیر بلکہ نمائش کی ہر چیز حتیٰ کہ نمائش والی عبادت بھی اللہ کی نظر رحمت سے محروم ہوتی ہے۔

ایک بڑا مسئلہ جو اربابِ انتظام کیلئے دردِ سر بنا رہتا ہے، وہ چندے کا مسئلہ ہے، اس سلسلے میں دو باتیں قابل لحاظ ہیں۔ ایک تو چندے میں اتنا غلو پایا جاتا ہے جیسے چندہ ہی اصل مقصد ہو، نہ تعلیم وتربیت، نہ کتابیں، نہ نظام، بس چندہ کی دھن ہے، اس کے لئے نہ وقت کی قید ہے، نہ اس کا لحاظ ہے کہ کس کو چندے پر بھیجا جا رہا ہے، اور نہ تعلیم کے نقصان کا خیال ہے، کتنے مدرسے ہیں، جن میں جہاں کسی فصل کا وقت آیا، اساتذہ وطلبہ سب کو چندے میں جھونک دیا جاتا ہے، اساتذہ پڑھانے کے لئے ہیں۔

طلبہ پڑھنے کے لئے ہیں، چندے کی ان مہموں کی وجہ سے تعلیم کتنی متاثر ہوتی ہے۔ بس بیان سے باہر ہے۔ بقرعید میں چرم قربانی کی مہم، دھان کی فصل تیار ہوئی، تو اس کی محنت، گیہوں تیار ہوا، تو اس کی وصولی، تعلیم کے اوقات کا بڑا حصہ ان چیزوں کی نذر ہو جاتا ہے، نتیجہ میں تعلیم صفر ہو کر رہ جاتی ہے۔

مدرسین اور طلبہ کو تو تعلیم و تعلم کے لئے یکسو رکھنا چاہئے تاکہ وہ فراغتِ ذہن و دماغ کے ساتھ علم کے مشغلے میں لگے رہیں۔ مدرسین ہی چندہ بھی کریں، دربدر کی ٹھوکریں کھائیں، لوگوں کی کڑوی کسیلی سنیں، اور پھر رقم لاکر مہتمم صاحب کو دیدیں اور وہ اس کے ذریعہ انھیں مدرسین پر حکومت کریں، کتنی نازیبا بات ہے۔

ایک مسئلہ وقت پر تنخواہوں کی ادائیگی کا بھی ہے، قاعدہ یہ ہے کہ جب ملازمین اور کارکنان سے ادارہ کا معاملہ ہوا ہے، اور عرف میں یہ بات طے شدہ ہے کہ خدمت کرنے والا پورے ماہ خدمت کرے گا، اور مہینہ ختم ہونے پر کم یا زیادہ جو اس کی تنخواہ ہو، وہ مل جانی چاہئے۔ بہت سے مدرسوں میں دیکھا جاتا ہے کہ یہی شعبہ سرد مہری کا شکار ہوتا ہے، ہر کام ہو رہا ہے، حتیٰ کہ مہتمم صاحب کی ادنیٰ سے ادنیٰ ضرورت تک کے لئے بڑی فیاضی سے رقم خرچ ہوتی ہے۔ مگر مدرسین و ملازمین کی تنخواہ کے لئے مدرسہ کے خزانہ میں رقم نہیں ہے اور نہ اس کی ادائیگی کیلئے معتد بہ فکر و اہتمام ہے، یہ شرعی ذمہ داری سے انحراف ہے، وعدہ خلافی ہے۔

ایمان کا لازمہ ہے کہ آدمی وعدے کا پابند ہو، اور نفاق کا شاخسانہ یہ ہے کہ آدمی وعدہ کی خلاف ورزی کرتا رہے، بکثرت یہ شکایت ہوتی ہے کہ حضرات منتظمین اساتذہ سے، طلبہ اور دوسرے خدمت گزاران مدرسہ سے سے وعدہ کرتے ہیں، مگر اسے وفا نہیں کرتے، اور اس سے قلوب میں بے اطمینانیاں اور بے اعتمادیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وعدہ تو ایسا نبھانا چاہئے کہ ہر شخص مطمئن ہو جائے۔

اربابِ انتظام کی طرف سے طلبہ کے داخلے اور اخراج کے سلسلے میں بھی بعض

اوقات بے اعتدالیاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ بعض مدارس میں علاقائی عصبیت کارفرما ہوتی ہے، کسی کسی علاقہ کے طلبہ کا داخلہ نہیں کیا جاتا، یا مشکل سے کیا جاتا ہے علم میں تعصب کا کیا دخل؟ علم کا طالب جو بھی آئے، اگر وہ واقعی طالب ہے تو اسے سینے سے لگانا چاہئے، اور اگر وہ طالب نہیں مطلوب بننے کی شان رکھتا ہو، تو وہ کہیں کا ہو، اس سے معذرت کر لینی چاہئے۔ کوئی طالب علم صاحب ثروت گھرانے کا آگیا تو اہل انتظام کی نگاہیں فرشِ راہ ہو جاتی ہیں، اور اگر غریب گھرانے کا ہے تو اس سے بات کرنے کے روادار نہیں ہیں۔ حالانکہ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ تعلیم وتعلم کا مزاج فاسد ہو جاتا ہے۔

یہی حال اخراج کا ہوتا ہے۔ اپنا خاص آدمی ہے یا اصحابِ ثروت میں سے ہے تو اس کی بڑی سے بڑی غلطی معاف اور اگر ایسا نہیں ہے تو ادنیٰ غلطی اخراج کیلئے کافی ہوتی ہے، یہ طرز عمل عدل وانصاف کے خلاف ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مدرسہ جب دین اور علم دین کی نشر واشاعت کی بقاء واستحکام کیلئے ہے، نیز اس لئے ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوں تو جب تک اس سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہو وہ کارآمد ہے، ورنہ وبالِ جان ہے۔

اربابِ مدرسہ کو دوسروں کے اعمال واحوال کے ساتھ اپنے طرزِ عمل اور نیتوں کا بھی جائزہ لیتے رہنا چاہئے، جہاں کور کسر ہو اسے درست کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ حسن نیت پر توفیق عطا فرماتے ہیں، نصرت فرماتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

یہ باتیں تو اربابِ انتظام سے متعلق ہیں، اب کچھ باتیں حضرات اساتذہ سے متعلق عرض کرنی ہیں، ہمارے دور میں ہر کام تجارت بن گیا ہے، جب تک مادی منفعت دکھائی نہیں دیتی، آدمی حوصلہ اور شوق اپنے اندر نہیں پاتا۔ انگریزوں کے دنیا میں پھیلاؤ کے جہاں اور بہت نقصانات ہوئے ہیں، ایک بڑا نقصان یہ بھی ہوا ہے کہ ہر کام دنیاوی سود وزیاں کی ترازو پر تولا جانے لگا ہے۔ تعلیم ہمارے نقطہ نظر سے ایک

عظیم عبادت ہے، یہ صاحب علم کے ذمہ ایک فریضہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے **حسبةً لله** اپنی امت کو تعلیم دی ہے، آپ نے اور تمام انبیاء نے بیک زبان یہ اعلان فرمایا تھا کہ: **لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْراً اِنْ أَجْرِیَ إِلَّا عَلَی اللّٰہِ** میں تم سے کسی معاوضہ کا سوال نہیں کرتا، میرا معاوضہ تو محض اللہ کے اوپر ہے، چنانچہ پوری اسلامی تاریخ گواہ ہے، انگریزوں کے دورِ عروج سے پہلے کی تمام صدیاں گواہ ہیں کہ اساتذہ نے تعلیم کو کبھی تجارت نہیں سمجھا، اسے عبادت ہی سمجھتے رہے، اور عبادت کے طور پر یہ کام انجام دیتے رہے، اس لئے اس عمل میں وہی تقدس پایا جاتا رہا جو عبادت میں ہوتا ہے۔

پھر جب انگریزوں کے اثر سے یہ رجحان بدلا، اور انھوں نے اس کو ایک تجارتی مشغلہ بنالیا تو یہ زہریلی ہوا مدرسوں میں بھی آئی۔ اب اساتذہ اسے بجائے عبادت کے ذریعہ معاش سمجھنے لگے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ عبادت کے تقاضے اور اس کے آثار کچھ اور ہوتے ہیں، اور ذریعہ معاش اور تجارت کے تقاضے اور اثرات دوسرے ہوتے ہیں۔ اس رجحان کا لازمی اثر یہ ہوا کہ علم دین کی حرمت وعظمت دلوں سے کم ہوگئی۔ اب لوگوں میں بقدرِ تنخواہ پڑھانے کا رجحان پرورش پانے لگا ہے تنخواہ کم ہے، تو کم پڑھاؤ۔ اس رجحان کے پیدا ہونے سے طلبہ کے قلوب میں بھی اساتذہ کا وہ احترام اور وہ ادب باقی نہیں رہا جو فیضان علم کے لئے ناگزیر ہے، تاہم اب بھی بعض اساتذہ ایسے مل جاتے ہیں جو خالص عبادت کے نقطۂ نظر سے معلّمی کرتے ہیں، تنخواہ کے بیش وکم پر اور اس کے جزئی حسابات پر ان کی نظر نہیں ہوتی، اور علم دین کی رونق ایسے ہی برگزیدہ اساتذہ کے طفیل باقی ہے، لیکن عام حال اس کے خلاف ہوگیا ہے۔

اساتذہ معلم خیر ہیں، ان کا درجہ اللہ کے نزدیک بھی اور بندوں کے نزدیک بھی بہت اونچا ہے، انھیں دنیاوی اغراض کی آلائشوں سے پاک ہونا چاہئے۔ روزی عطا فرمانے والی ہستی اللہ تعالیٰ کی ہے، ان پر توکل کا سرمایہ، ہر معاوضہ اور قیمت سے بڑھ کر ہے۔ اساتذہ تعلیم کے میدان میں قدم رکھیں تو اپنی نیت کا احتساب ضرور

کریں۔ اس سے کام مین عمدگی اور برکت ہوگی۔ مدرسہ سے جو کچھ بصورت تنخواہ ملے، اسے اپنے کام کا معاوضہ نہیں، بلکہ حق تعالیٰ کی طرف سے عطیہ اور نوازش سمجھیں، یہ مسلّم ہے کہ عربی مدارس کی تنخواہ آج کے متوسط معیار زندگی بلکہ ادنیٰ معیارِ زندگی کو بھی پورا کرنے والی نہیں ہے، لیکن تنخواہ حاجت روا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے بالحاحِ تمام ہمیشہ دعا میں مشغول رہیں۔ سب ضرورتیں غیب سے پوری ہوتی رہیں گی۔

میں تو اپنے عزیزوں سے کہتا ہوں کہ تنخواہ بڑھانے کی درخواست کبھی مت دو جو کچھ درخواست کرنی ہو اللہ کے حضور کرو، یہی در وہ در ہے جہاں سوال کرنے سے آبرو نہیں جاتی، بلکہ بڑھ جاتی ہے۔

پھر تعلیم دینے میں اس کا خاص لحاظ رکھیں کہ مدرسہ کی جانب سے جو اوقات درس کے لئے مقرر ہیں اور جو نصاب متعین ہے، اس میں کوئی کمی نہ کی جائے سبق میں ناغہ نہ ہونے دیں۔ سبق کا مطالعہ اہتمام سے کریں اور اس طرح اسباق کی مقدار متعین کریں کہ وقت مقررہ میں نصاب پورا ہوجائے۔ نہ تعلیمی وقت سے خارج میں پڑھانے کی نوبت آئے اور نہ سبق کی مقدار ناقابل برداشت حد تک بڑھانی پڑے۔ بعض اساتذہ شروع میں اسباق کا ناغہ کرتے ہیں یا لمبی لمبی تقریریں کرکے سبق کی مقدار گھٹا دیتے ہیں، پھر آخر میں خارجی اوقات میں پڑھاتے ہیں۔ اس سے طلبہ کو تکرار و مذاکرہ کا موقع نہیں ملتا، اور ان کی استعداد فاسد ہوکر رہ جاتی ہے۔

اساتذہ کرام اپنے طالب علموں اور تلامذہ کیلئے معیار ہوتے ہیں، ان کی صحبت میں دن اور رات یہ رہتے ہیں اور انھیں کے اثرات یہ قبول کرتے ہیں، اس لئے اساتذہ ہی وہ نمونہ قائم کریں، جو قابل تقلید ہو، اساتذہ اگر حرص مال اور حب جاہ میں گرفتار ہوں گے، تو طلبہ بھی اس میں ملوث ہوں گے، مدرسوں میں بعض اوقات یہ منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ اساتذہ باہم حسد میں مبتلا ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے ایک دوسرے کی تحقیر کرتے ہیں، باہم تنقیدیں کرتے ہیں، طلبہ کی نگاہ میں ان کی وقعت کم

کرتے ہیں، اس سے مدرسہ کا ماحول عجیب تشویش انگیز ہو جاتا ہے، اور جذبۂ حصول علم سرد پڑ جاتا ہے۔ جذبۂ تحاسد بڑھتا چلا جاتا ہے، اللہ ہی جانتا ہے کہ حسد کی وجہ سے کتنی تباہیاں آتی ہیں۔

طلبہ کو علم کا فیض پہونچانے کیلئے ضروری ہے کہ ان سے اتنا تعلق رکھا جائے کہ وہ اپنے سوالات کو اساتذہ سے حل کرا سکیں، لیکن انھیں اتنا بے تکلف نہ بنایا جائے کہ وہ جو چاہیں بے تکلف کہتے چلے جائیں، اتنی بے تکلفی اور مقربیت کے بعد شکوہ شکایت کا دروازہ کھلتا ہے، بے تحاشا بدگمانیاں پھیلتی ہیں، حکایت وشکایت کا دروزہ اپنے اوپر بند رکھنا چاہئے، اور کان اور دل کو مضبوط رکھنا چاہئے کہ ہر کس وناکس کی زبان سے حکایت وشکایت سن کر اسے باور نہ کرلیں اور نہ بدگمانی میں مبتلا ہوں۔

استاذ طالب علم پر شفیق ومہربان ہوتا ہے، اس شفقت ومہربانی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی استعداد اور صلاحیت قلبی کی ترقی میں کوشاں رہے، استاذ اگر طالب علم سے صرف درس گاہ تک واسطہ رکھتا ہے تو وہ اس کا حق نہیں ادا کرتا، تمام اساتذہ پر حق ہے کہ وہ طلبہ کی خیر خواہی میں ان پر روک ٹوک کرتے رہیں، کسی نامناسب حالت میں دیکھیں تو انھیں مشفقانہ تنبیہ ونصیحت ضرور کریں، یہ سوچ کر اعراض نہ کریں کہ یہ فلاں کی ذمہ داری ہے، اساتذہ مناسب انداز میں تنبیہ ونصیحت کرتے رہیں تو اس کے دو فائدے نقد ظاہر ہوتے ہیں، اور وہ دونوں فوائد ایسے ہیں کہ براہِ راست مدرسہ کے ماحول کو متاثر کرتے ہیں۔ ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ کو کسی نامناسب حرکت کی جرأت نہیں ہوتی، اور اس طرح ماحول میں بھلائی پھیلتی اور برائی سمٹتی ہے، دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اساتذہ کی وقعت وعظمت دل میں بیٹھ جاتی ہے، **امر بالمعروف اور نہی عن المنکر** جو ایک خاص امر خداوندی ہے، اس کی یہ دونوں برکتیں بروقت ظاہر ہوتی ہیں، البتہ یہ ضرور خیال رہے کہ تنبیہ ونصیحت میں خیر خواہی کے علاوہ اور کوئی جذبہ نہ ہو، رسول اللہ ﷺ نے طالب علموں کے ساتھ خیر خواہی ومہربانی کی وصیت فرمائی ہے۔

صحبت کی تاثیر ساری دنیا کو تسلیم ہے، آدمی جس کی صحبت میں رہتا ہے، شعوری اور غیر شعوری دونوں طرح اس سے متاثر ہوتا ہے، بالخصوص جب عظمت وعقیدت کے ساتھ یہ صحبت ہو تو تاثیر دو آتشہ ہوکاتی ہے، طلبہ میں صرف اساتذہ کے اعمال ونظریات ہی موثر نہیں ہوتے۔ ان کے احوال وکیفیات بھی موثر ہوتے ہیں۔ اگر استاذ طالب علم کو علم کی راہ پر لگانا چاہتا ہے تو وہ خود بھی اسی راہ پر لگا رہے۔ اساتذہ جب محنت ومشقت سے مطالعۂ کتب اور تحریر وتصنیف میں لگے رہتے ہیں تو یہی ذوق طلبہ میں بھی عام ہونے لگتا ہے، اور اساتذہ جب سیاست کرنے لگتے ہیں تو طلبہ کا رجحان بھی تعلیم سے برگشتہ ہونے لگتا ہے۔

ایک خاص بات یہاں اور بھی ضروری ہے، وہ یہ کہ عموماً مدرسوں میں اساتذہ، اربابِ انتظام کے مقابلے میں ایک گروہ کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں، کچھ تو واقعی غلطیاں ہوتی ہیں اور کچھ بدگمانیاں ہوتی ہیں۔ حضرات اہل انتظام کے لئے عرض کر چکا ہوں، اساتذہ وملازمین سے یہ عرض کرنا ہے کہ وہ حتی الامکان اربابِ انتظام سے موافقت کا معاملہ رکھیں، ان کے اقدامات پر اعتراض نہ کریں۔ خواہ وہ ان کے نزدیک قابل اعتراض ہی ہوں، کتنے مسائل ومعاملات ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی نوک پلک کو انتظام کرنے والا ہی سمجھتا ہے۔ ایسا بہت تجربہ ہوا کہ کسی انتظامی امر پر اعتراض کرنے والوں کو جب وہی انتظام سپرد کیا گیا تو انھوں نے بھی وہی کیا جس پر ان کو پہلے اعتراض تھا۔ اساتذہ تعلیم میں لگیں، انتظامی امور پر تنقید وتبصرہ بالکل نہ کریں، یا بہت کم کریں، آپس کی رائے زنی بسا اوقات مضر ثابت ہوتی ہے، تنقید وتبصرہ جس کو شریعت کی اصطلاح میں غیبت کہا جاتا ہے کوئی اچھی چیز نہیں ہے، جس سے خیر کا ظہور ہو، اساتذہ اور منتظمین میں موافقت ہوگی، تو باہم اعتماد ہوگا، اور تعلیمی ماحول خوشگوار اور پُرسکون ہوگا،

ہمارے زمانے میں مدارس کے اندر یہ بڑا روگ ہے کہ انتظام ایک الگ پارٹی ہے اور تعلیم ایک الگ پارٹی ہے، اور دونوں ایک دوسرے سے بدگمان ہیں، ایک

دوسرے کی شکایت میں مبتلا ہیں، نہ اس پارٹی کی ذہنیت اور زبان صاف ہے، اور نہ اس پارٹی کی، دونوں پارٹیاں گنہ گار ہوتی ہیں، اور مدرسہ کا ماحول بھی متعفن ہوتا ہے۔ حضرات اساتذہ کرام بالخصوص درجاتِ عربی کے اساتذہ حضرات علماء ہوتے ہیں، علماء کیلئے یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی کہ وہ قلب وزبان کے گناہ میں مسلسل مبتلا رہیں۔ اللہ نے انھیں ایک بڑا منصب عطا فرمایا ہے، اس کے حقوق کی رعایت بڑی ذمہ داری ہے۔

غرض یہ ہے کہ مدرسہ کا ایسا ماحول بننا چاہئے جو اسلامی تعلیم کی عملی تفسیر ہو، اس سلسلے میں چند ناتمام باتیں عرض کی گئیں جن کا تعلق اہل انتظام اور ارباب تدریس سے ہے، کچھ باتیں طالب علموں سے بھی کرنی ہیں، اس کے لئے اگلے شمارے کا انتظار کیجئے، اللہ تعالیٰ حسن توفیق، حسن عمل اور حسن قبول سے نوازیں۔ آمین

☆☆☆☆☆

طالبان علوم نبویہ سے کچھ باتیں

پچھلے شمارے میں خاکسار نے مدارس دینیہ کے بارے میں کچھ باتیں عرض کی تھیں، جن میں خصوصیت کے ساتھ اہل انتظام اور حضرات اساتذۂ کرام کی خدمت میں کچھ گزارشیں کی گئی تھیں، اور ارادہ ظاہر کیا گیا تھا کہ اگلے شمارہ میں طلبۂ علوم دینیہ کے متعلق کچھ لکھا جائے گا۔ آج کی مجلس میں اس ارادہ کی تکمیل کرنا چاہتا ہوں۔

طالب علم وہ ہوتا ہے، جو حصول علم کے لئے اپنے آپ کو یکسو کر لیتا ہے، دنیا کے ہر مشغلے سے کٹ کر ساری مصروفیات سے ہٹ کر ایک کام میں لگ جاتا ہے، اور علم بھی وہ علم جو علم دنیا نہ ہو بلکہ علم دین ہو، جس سے احکام شرع کا علم ہوتا ہو، جس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوتی ہو۔ ان طالبان علوم نبویہ کی ایک تاریخ رہی ہے، نہایت روشن اور بے حد درخشاں! طلب علم کی سرگرمیاں ہم قرونِ اولیٰ ہی سے مسلسل دیکھ رہے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ رسول اللہ ﷺ کے در اقدس پر حاضر ہوئے تو دنیا کے تمام تقاضے بھول گئے، حتیٰ کہ کھانے پینے کا ہوش نہ رہا، ہمہ وقت یہ دھن رہتی تھی کہ جناب نبی کریم ﷺ سے سنا ہوا کوئی کلمہ ذہن سے فراموش نہ ہو، اور جو کچھ آپ کی زبان مبارک سے نہیں سن سکے تھے، جستجو رہتی تھی کہ سننے والوں سے اسے بھی سن کر یاد کر لیں، کچھ بھول جاتے تو تکلیف محسوس کرتے، ایک مرتبہ بارگاہِ رسالت میں بھولنے کی فریاد کی، تو آپ ﷺ نے ایسی دعا دی کہ پھر کچھ نہ بھولے۔ آپ کی خدمت میں مسلسل حاضر رہ کر حضرت عبد اللہ بن مسعود ؓ علم کا خزانہ بن گئے، پھر دور صحابہ میں اصاغر صحابہ اور تابعین نے اکابر سے علم کی تحصیل کی، علم کی جستجو میں طالبان علوم بنوت نے مشرق

ومغرب اور جنوب وشمال کی حدیں ملادیں۔

علوم نبوت کے ان طلبہ کی ایک تابناک تاریخ ہے، ان کے واقعات تاریخ اور تذکروں کے صفحات پر جگمگا رہے ہیں، اس وقت مجھے یہ تاریخ نہیں دہرانی ہے، بس اجمالاً اشارہ کرنا ہے کہ قرون اولیٰ سے قرون متاخرہ تک طالبان علم کے قافلے آپ کو ہر اس جگہ خیمہ زن ملیں گے جہاں علم کا کوئی چشمہ جاری ہو، پھر ان کی یکسوئی، ان کا انہماک، دنیا سے ان کی بے نیازی سب کا ایک نرالا انداز ہوتا، دلی میں کچھ عرصہ پہلے جب کہ مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا ہم ایک طالب علم کو پاتے ہیں جو نانوتہ سے تحصیل علم کے لئے دارالسلطنت میں آیا تھا، وہ طالب علم غریب تھا، اس کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ تیل خرید کر چراغ جلاتا، اور اس کی روشنی میں راتوں کو پڑھتا، وہ اپنی کتاب لے کر سڑک پر نکل آتا، سرکاری لالٹین کے نیچے کھڑا ہو کر مطالعہ میں مصروف ہو جاتا اور اسی حالت میں رات گزار دیتا، ایک دن وہ حسب معمول اپنی کتاب لئے کھڑا تھا کہ کسی مغل شاہزادے کا جلوس نکلا۔ آگے آگے مشعل بردار مشعلیں لئے چل رہے تھے، اس طالب علم کو روشنی فراواں ملی تو بہت خوش ہوا، اسی روشنی کے ساتھ چلنے لگا کہ مطالعہ میں آسانی ہوگی، شاہزادے کے حاشیہ برداروں میں کسی نے اس کو دھکا دیا کہ ہٹو، دیکھو شاہزادے کی سواری آرہی ہے۔ اس غریب طالب علم نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ شاہزادہ دولہا بنا ہوا ساز وسامان سے مرصع ہاتھی پر بیٹھا ہوا ہے۔ طالب علم نے منہ بگاڑ کر کہا کہ بڑا آیا ہاتھی پر بیٹھنے والا، اگر کافیہ (علم نحو کی مشہور کتاب) کا ایک مسئلہ پوچھ دوں تو بغل جھانکنے لگے گا، اور پھر اپنے مطالعہ کی محویت میں مستغرق ہو گیا۔ پھر وہی طالب علم **استاذ العلماء** بنا۔ مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی **علیهما الرحمه** کے استاذ محترم مولانا مملوک العلی صاحب علیہ الرحمہ۔

یہ ایک مثال ہے، تاریخ میں اس جیسی مثالیں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ آج بھی طالب علم جب مدرسے میں داخل ہوتا ہے تو اس کے سامنے طلب علم کے یہی تقاضے

آجاتے ہیں۔ اگر وہ ان تقاضوں کو پورا کرتا ہے تو دیر نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ اسے گوہر مقصود سے نواز دیتے ہیں، اور اگر وہ ان تقاضوں سے صرف نظر کرتا ہے تو بجھ کر رہ جاتا ہے۔

یہ بچے جو آج طالب علم کہلاتے ہیں، کل عالم و فاضل ہو جائیں گے، ان کے احوال و اعمال درست رہیں تو اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی قبولیت پائیں گے اور عوام الناس بھی اپنے دینی و دنیوی معاملات میں ان سے صحیح راہ پائیں گے، انھیں علم کے لئے ہمیشہ محنت و کاوش کرنی چاہئے، تاکہ خدا تعالیٰ کی بھی خوشنودی حاصل ہو اور عام لوگوں کا بھی بھلا ہو، امام محمد علیہ الرحمہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ بڑھاپے کی عمر تک مطالعۂ و مذاکرہ میں بہت جد و جہد کرتے تھے، راتوں کو جب سارا عالم نیند کی آغوش میں چلا جاتا تھا تو یہ اپنی کتابوں کے اوراق الٹتے پلٹتے رہتے تھے، پوری پوری رات علم کی تحقیق و تصنیف میں گزار دیتے، کسی نے پوچھا کہ حضرت آپ اتنے زبردست عالم ہیں، علوم کے تمام گوشے آپ کے ذہن و حافظہ میں موجود ہیں، پھر آپ کو اس قدر محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے، فرمایا کہ ساری امت چادر تان کر سو رہی ہے اور مطمئن ہے کہ کوئی مسئلہ پیش آئے گا، تو محمد سے پوچھ لیں گے، اگر محمد بھی سو جائے تو پھر کیا ہوگا؟ طلبہ کا طرۂ امتیاز یہی ہے کہ انھیں اپنی تعلیم کے علاوہ کسی اور چیز کی فکر نہ ہو، ضروریات زندگی کا انتظام تو غیبی نظام کے تحت ہوتا رہتا ہے۔ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے ملفوظات میں ایک واقعہ ملتا ہے کہ ایک طالب علم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ کی خدمت میں طلب علم کیلئے حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے پاس طالب علموں کے کھانے پینے کا جو انتظام ہے وہ پورا ہو گیا ہے۔ اب کوئی گنجائش اس میں نہیں ہے، اس نے کہا حضرت! مجھے پڑھنا ہے، آپ مجھے درس میں داخل فرمالیں، رہا کھانے کا مسئلہ تو اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے، وہ دیں گے تو کھا لوں گا اور نہیں دیں گے تو کہہ دوں گا آپ کی دی ہوئی جان حاضر ہے، واپس لے لیجئے۔ حضرت گنگوہیؒ بہت

متاثر ہوئے اور اسے پڑھانا منظور فرمالیا، پھر اسی مجلس میں اسی وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اس کی ضروریات کا انتظام بھی ہوگیا۔

موجودہ مدارس کے نظام میں تو ایسا انتظام ہے کہ طالب علموں کو اپنی تمام حاجات وضروریات کی فکروکاوش سے بالکل فراغت ہے، کھانا مدرسے کے مطبخ سے پکا پکایا مل جاتا ہے، رہنے کیلئے کسی عمارت اور مکان کی تلاش نہیں ہوتی کہ ہر مدرسے کے ساتھ دارالاقامہ بھی ہے، اس کے علاوہ دوا علاج، لباس وپوشاک ہر ضرورت کا انتظام مدرسہ کے ذمہ دار حضرات رکھتے ہیں۔ اس صورت حال کا حق تو یہ ہے کہ طالب علم اپنے آپ کو تحصیل علم کیلئے اس طرح کھپادے کہ وہی اس کی شناخت بن جائے۔ طالب علم اور کھیل کود؟ طالب علم اور سیر سپاٹا؟ طالب علم اور نمائشی جلسے وہنگامے؟ طالب علم اور نزاع وکشمکش؟ طالب علم اور چھٹی کے لئے بے چینی؟ کیا ربط ہے اور ان کا آپس میں کیا تعلق ہے۔

ہر چیز اپنے محل پر خوبصورت لگتی ہے، ہر آدمی اپنے کام میں لگا ہوا حسین وجمیل معلوم ہوتا ہے، کھیتی کرنے والا اپنے کھیت میں محنت کرتا ہوا بھلا معلوم ہوتا ہے، ملاح دریا میں کشتی کھیتا ہے، ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھا گاڑی چلا رہا ہے، مزدور اپنے کام میں جٹا ہوا ہے تو کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے اور یہی لوگ اپنا اپنا کام چھوڑ کر مہمل ادھر ادھر گھومتے رہیں تو کتنے نکمے معلوم ہوتے ہیں۔ زلفیں سر پر ہوں تو کتنی خوبصورت ہوتی ہیں، انھیں کو کاٹ کر زمین پر ڈال دیجئے تو آدمی ان سے کیسا بچتا ہے کہ کپڑے پر نہ لگ جائیں، اور اگر لگ جاتی ہیں تو کتنی محنت سے انھیں ہٹاتا ہے، اسی طرح طالب علم بھی کتاب میں، مطالعہ میں، مذاکرہ وتصنیف میں قابل تعریف معلوم ہوتا ہے، اور جب وہ ایسی جگہوں پر اور ایسے کاموں میں دیکھا جاتا ہے، جہاں اور جس کام میں اسے نہیں ہونا چاہئے تو ہر شخص کو برا لگتا ہے، دین کا طالب علم اگر سنیما ہال میں دکھائی دے تو برے لوگ بھی ٹوکیں گے اور اگر وہی مدرسہ اور مسجد میں دکھائی دیتا ہے تو کتنا قابل احترام

معلوم ہوتا ہے۔

مجھے طالب علموں سے یہ عرض کرنا ہے کہ وہ مدرسہ میں داخل ہوں تو ان امور کو مستحضر رکھیں، وہ مدرسہ میں اسلئے نہیں داخل ہوتے کہ کھیل کود کی ٹیمیں بنائیں، اور کھیل کود کو بطور مشغلہ کے اختیار کریں۔ نہ مدارس کا یہ موضوع ہے، نہ قوم اس کے لئے چندہ دیتی ہے کہ ان بے مقصد دھندوں میں لگیں۔ طالب علم کو تو اپنے مقصد کی دھن ہونی چاہئے۔ انگریزی مدارس اور انگریزی طالبعلموں کی دیکھا دیکھی عربی مدرسوں میں بھی انگریزی کھیلوں کی لعنت گھس آئی ہے اور بہت سے لوگ سادگی سے فرما بھی دیتے ہیں مدرسوں میں کھیل کود کا انتظام بہت ضروری ہے، وہ یہ نہیں سوچتے کہ تعلیم اور کھیل کود کا کیا جوڑ ہے۔ صحت جسمانی اس سے بنے یا نہ بنے، صحت دماغی اور صحت ایمانی تو خراب ہو ہی جاتی ہے، خوب تجربہ ہے کہ کھیل کود میں دلچسپی لینے والے پڑھنے سے اچاٹ ہی رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ محدود وقت میں کھیلیں گے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ہاتھ پاؤں کی حرکت کھیل کود میں چاہے تھوڑی دیر رہے، مگر دل و دماغ تو مسلسل دن رات اسی میں مبتلا رہتا ہے۔ بالخصوص ایسے کھیلوں میں جن میں مقابلہ آرائی ہوتی ہے، لیکن افسوس طلبہ اپنا مقصد بھول کر ٹیمیں سجاتے ہیں میچ کھیلتے ہیں، اس کی تیاریاں کرتے ہیں، میچ ہونے کے بعد ان جھگڑوں میں الجھے رہتے ہیں جو کھیل کود کے مقابلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں، تعلیم تباہ ہو جاتی ہے اور کھیل میں بھی ناکام رہتے ہیں، ایک بڑے عالم دین جو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں شعبۂ دینیات کے روح رواں تھے، انھوں نے ایک گاڑی خریدی، کچھ دنوں رکھ کر اس کو فروخت کر دیا، پھر رکشہ اور تانگہ سے یونیورسٹی جانے لگے، کسی نے کہا گاڑی تھی تو آنے جانے میں آسانی تھی، آپ نے اسے کیوں نکال دیا، فرمایا کہ ہاں بھائی! آسانی تو تھی، مگر میں اس پر گھنٹہ دو گھنٹہ سوار ہوتا تھا اور وہ ۲۴؍ گھنٹے میرے اوپر سوار رہتی تھی۔ یہی حال کھیل کود کی ان دلچسپیوں کا ہوتا ہے، عملاً خواہ تھوڑی دیر آدمی اس میں لگے مگر وہی موضوع زندگی بن

جاتا ہے۔

کھیل تو مدرسہ کے موضوع کے بالکل خلاف ہے، لیکن مدارس میں طلبہ کے درمیان ایک کام کا اور رواج ہے، جس کے بعض اجزاء تو بظاہر ان کے مقصد سے ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں، اس میں وہ دلچسپی لیتے ہیں، مدارس کے اساتذہ وارباب انتظام بھی اس کی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں، وہ انجمن سازی ہے۔ اکثر مدارس میں طلبہ اپنی انجمن بناتے ہیں، مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے تحت وہ تقریر وتحریر کی مشق کریں گے، یہی جز تعلیمی تگ ودَو کے ساتھ ہم آہنگی رکھتا ہے، اور یہ ذمہ داری ارباب انتظام کی ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو تبلیغ دین کیلئے بھی تیار کریں، مگر جب طلبہ انجمن بناتے ہیں اور اس میں قدرے خودمختاری پاتے ہیں تو وہ تمام لوازم ان کے یہاں بھی گھس آتے ہیں جو یونیورسٹیوں اور کالجوں کی یونینوں میں دیکھنے میں آتے ہیں، عہدوں کے انتخاب، الیکشن، آپس کی کشمکش، رقابت، نزاع اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں، لڑائی جھگڑے پھر کیا کیا نہیں ہوتا، پھر یہ طلبہ اساتذہ کے قابو میں نہیں رہتے، ہمارے دینی مدارس میں کتنے فسادات اور ہنگامے اسی انجمن آرائی کی نحوست سے پیدا ہوتے ہیں۔

عزیز طلبہ! تم اس لئے مدرسے میں نہیں آئے ہو کہ انجمن سجاؤ، الیکشن لڑو، سازشیں کرو، کسی کو گراؤ، کسی کو اٹھاؤ، تمہارا کام تو اپنے آپ کو علم دین سے سنوارنا سجانا تھا، دین کا ایک سچا نمونہ بننا تھا، تم علم حاصل کرلو، پھر اللہ کو جو کام منظور ہوگا تم سے لے لیں گے، ہمارا تو تجربہ ہے کہ عموماً وہی طلبہ بعد میں کارآمد بنتے ہیں جو علم کے اندر فنا ہوتے ہیں، ان ہنگامہ آرائیوں سے دور رہتے ہیں، اور جو لوگ فضول اور مضر کاموں میں منہمک ہوتے ہیں، ان کا مزاج بعد تک ہنگاموں ہی کا بنا رہتا ہے اور وہ دین کیلئے یا تو بالکل مفید نہیں رہتے یا بہت کم مفید رہتے ہیں۔

اسی انجمن کے بطن سے ایک مصیبت اور نکلی ہے جو ہے تو انجمن ہی کے تابع، مگر اس کے نقصانات مستقل درجہ رکھتے ہیں، وہ انجمن کے سالانہ جلسے ہیں، جن میں

طلبہ بڑے اہتمام کے ساتھ دلچسپی لیتے ہیں، ان جلسوں سے کچھ فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں، مگر ان کے اہتمام وانتظام میں تعلیم کا اور طلبہ کے اخلاق ومزاج کا جتنا نقصان تجربہ میں آیا ہے، اس کے مقابلے میں فوائد ہیچ ہیں، کئی ہفتے پہلے ان جلسوں کی تیاریاں شروع ہوجاتی ہیں، کچھ اسٹیج پر نمودار ہونے کی تیاری کرتے ہیں، کچھ چندوں کی مہم میں لگ جاتے ہیں، کچھ دوسرے انتظامات کی دردسری میں مبتلا ہوتے ہیں، تعلیمی مزاج بگڑ جاتا ہے۔ اور بعض مدارس میں تو طلبہ صرف تقریروں پر اکتفا نہیں کرتے مقابلے کی ٹھان لیتے ہیں، انعامی مقابلے ہوتے ہیں، یہ مقابلے اور بھی مضر ہوتے ہیں، یہ مقابلے طلبہ کی تمام دلچسپیوں کو اپنی طرف مرکوز کرلیتے ہیں، اور ان کا اثر عرصہ تک باقی رہتا ہے، ان میں بھی ایک دوسرے کو گرانے اور اٹھانے کی سازشیں ہوتی ہیں، تحاسد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، لڑائیاں ہوجاتی ہیں، بعض اوقات منتظمین مدرسہ کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

بلاشبہ ان جلسوں سے طلبہ اور مدرسے کی نمائش ہوجاتی ہے، لیکن تجربہ کے بعد مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ **إثمهما اكبر من نفعهما**، مدرسہ کی انتظامیہ اور اساتذہ اپنے قابو میں رکھ کر ہلکا پھلکا تقریری پروگرام کرالیں، جس میں نہ مسابقہ ہو، نہ انعام ہو، نہ نمائش کا جذبہ ہو، نہ انتخابات طلبہ کے سپرد ہوں تو نقصانات سے قدرے حفاظت ہوسکتی ہے، ورنہ انگریزیت کا اثر ان جلسوں میں بھی پھیلتا اور بڑھتا دکھائی دیتا ہے، بعض جگہوں پر ڈرامے دیکھنے میں آئے، بعض جلسوں میں ہوتے تو مکالمے ہی ہیں مگر ڈراموں جیسی شکل بن جاتی ہے، بعض جگہ ریڈیو، ٹی وی کی نقالی ہوتی ہے، علم دین کی سنجیدگی ووقار کو ان خرافات سے کیا تعلق؟ دینی جلسے ہنسنے ہنسانے اور تفریح طبع اور حظ نفس کیلئے نہیں منعقد کئے جاتے، کاش کہ طلبہ ان غیر متعلق اور مضر امور سے یکسو ہوکر اپنی علمی استعداد پختہ کرتے، اخلاق حسنہ سے خود کو سنوارتے تو علم کا نور پھیلتا، اور برائیوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب پر کچھ بند لگتا، ورنہ اتنے مدارس چل رہے ہیں اور ہر طرف

شور ہے کہ کام کے آدمی نہیں نکلتے۔

اِدھر کچھ دنوں سے طلبہ نے ایک نئی بدعت ایجاد کی ہے، وہ یہ کہ جب تعلیم سے فراغت کا وقت ہوتا ہے تو ''جشن بخاری'' مناتے ہیں، یہ ان مدرسوں میں ہوتا ہے جن میں دورۂ حدیث کی تعلیم ہوتی ہے، اس کیلئے کارڈ چھپتے ہیں، شوخ وخوش رنگ، ان کارڈوں پر مہمل قسم کا مضمون ہوتا ہے، دعوتیں ہوتی ہیں، ان میں بے تحاشا اسراف ہوتا ہے، محض نمائش اور ظاہر داری! استعداد اور محنت کے نام پر صفر اور شان وشوکت ایسی جیسے برات سج رہی ہو، ہمارے اسلاف تو لرزاں وترساں رہتے تھے کہ استعداد ہی نہیں تعلیم کا حق ادا نہیں ہوا، کس منہ سے اپنے کو کہیں کہ ہم عالم ہوگئے، اور یہاں رنگ ہی کچھ اور ہے۔

عزیزو! اپنا کام دیکھو، علم کتنا حاصل ہوا، خشیت الٰہی کتنی پیدا ہوئی، اخلاق حسنہ سے کتنے مزین ہوئے، اساتذہ کو کتنا خوش رکھا، جس ماحول میں تم پہونچو گے، اس کے مناسب تم نے کیا تیاری کی ہے، لوگوں نے تم سے کیا توقع باندھ رکھی ہے، اور تم اس پر کتنا پورا اترو گے۔ اس کا خیال کرو، نمائش چھوڑو، رسوم کو توڑو، حقیقت پیدا کرو۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

☆☆☆☆☆

دستور الطلبہ

مدارس میں طلبہ ہر ہفتہ تقریری پروگرام کے جلسے منعقد کرتے ہیں، ایسے ہی ایک سال کے اختتامی پروگرام میں حضرت مولانا مدظلہ شریک ہونا چاہتے تھے، مگر بعض ناگزیر وجوہات کی بناپر شرکت نہ کرسکے، تو اسی کی تلافی کیلئے طلبہ کو ایک تحریری پیغام دیا، یہ کہنے کو تو ایک مختصر سا پیغام ہے، مگر طالب علمانہ خصوصیات کا نچوڑ اور طلبہ کے لئے دستور العمل ہے، نصیحت کا ایک باب ہے۔ عمل کی ایک شاہراہ ہے، اللہ تعالیٰ اس پر عمل کی توفیق بخشیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العٰلمین ، والصلوۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ أجمعین ، أمابعد ! طلبۂ عزیز و برخورداران باتمیز! آج تم لوگوں کی انجمن کا یہ آخری اجلاس ہے اور میرا عزم مصمم تھا کہ اس اختتامی جلسہ میں شرکت کروں اور تم لوگوں کے پروگرام کے بعد کچھ ضروری باتیں گوش گزار کروں، لیکن انسان کا ارادہ خواہ کتنا ہی محکم اور مصمم ہو، لیکن مشیت الٰہی اس کی پائیداری کو تار تار اور اس کی استواری کو برہم و بیکار کردیتی ہے، مجھے بڑی خوشی تھی کہ تم لوگوں کی محنت و کوشش کا ثمرۂ شیریں اور تم لوگوں کی کدو کاوش کا نتیجۂ آخریں دیکھتا، تم لوگوں کو داد دیتا، آفریں کہتا، مگر یہ سب نہیں ہوسکا، تم لوگ یہاں بیٹھے اپنی مجلس سنوار رہے ہو اور میں ایک دوسری جگہ، تم لوگوں کی یاد دل میں لئے، تمہاری برادری یعنی طلبہ عزیز کو خطاب کررہا ہوں۔ لیکن نہ سہی میرا وجود، قلم تو ہے، حق تعالیٰ نے **علم بالقلم** فرما کر انسان کی رہنمائی فرمائی ہے کہ جہاں زبان اور سماعت کا گزر نہ ہو، وہاں قلم کے ذریعے علم و حکمت کا نزول آنکھوں کے راستے دل پر ہوتا ہے، تو کیا حرج ہے زبانی تخاطب نہ سہی، قلم کا سہارا لے کر اس کا تدارک کرلیا جائے، اور جو چند باتیں میں تم لوگوں سے عرض کرتا اسے کاغذ کے سپرد کردوں۔

عزیزانِ گرامی! تم ابھی وہ دن نہ بھولے ہوگے جب تم نے مدرسہ کی چہار دیواری میں قدم رکھا تھا۔ نئے تعلیمی سال کی نئی توانائیاں تھیں، داخلہ کی ہماہمی تھی، بڑی آرزوؤں اور تمناؤں کے سائے میں تم نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا تھا، اور اب وہ دن قریب ہے کہ سال بھر کی تعلیم وتمرین کا آخری امتحان دے کر تم اس حال میں اپنے گھروں کی جانب لوٹو گے کہ تم ایک درجہ تعلیم میں آگے بڑھ چکے ہوگے۔ یہاں تم ایک لمحہ ٹھہر کر اپنا احتساب کرو، ممتحن تمہارا امتحان بعد میں لے گا، پہلے تم خود اپنا حساب لو، جو قومیں خود احتسابی کی خوگر ہیں وہ ہر لمحہ آگے بڑھتی رہتی ہیں۔ اور جو لوگ اس کی طرف سے بے فکر ہوئے ان کا ہر قدم انھیں پیچھے ڈال دیتا ہے۔

تمہیں مدرسہ میں آکر تین چیزیں حاصل کرنی تھیں، انھیں تین چیزوں کے حصول کے لئے تم اپنا گھربار، وطن ودیار اور ماں باپ کا لاڈ وپیار چھوڑ کر یہاں پڑے رہے۔ تم اچھی طرح دیکھو کہ تینوں باتیں تم لوگوں نے اطمینان بخش مقدار میں حاصل کرلیں یا نہیں؟ اگر واقعی کسی قدر معتد بہ مقدار میں حاصل کر چکے ہو تو خدا کے سامنے سجدۂ شکر بجالاؤ، اور اپنے اساتذہ ومدرسہ اور اہل مدرسہ کو دعائیں دو کہ تم کامیاب رہے، خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ اور خدانخواستہ تم سے کوتاہی ہوئی ہے تو خدا کے حضور معذرت کرو، اور آئندہ عزم کرو کہ ہر ممکن تلافی، اس کوتاہی کی کروگے۔ ایسی تلافی کہ خدا بھی راضی ہو، اور اساتذہ واہل مدرسہ بھی خوش اور مطمئن ہوجائیں،

آؤ تمہیں بتائیں کہ وہ تین باتیں کیا ہیں؟ غور سے سنو! حالانکہ تم ان باتوں کو خوب جانتے ہو، تاہم تذکیر بہرحال مفید ہے، ہاں تو ان باتوں میں پہلی بات ہے، **استعدادِ علم۔**

میں نے علم نہیں کہا استعداد علم کہا ہے، کیونکہ علم تو ایک دریائے ناپیدا کنار ہے اور ایک بحر ذخار ہے، یہ دھندا اور یہ مشغلہ تو زندگی بھر کا ہے، اس سے تو کبھی فرصت وفراغت نہ ہوگی، تم اس میدان میں آگے بڑھوگے، آگے اس سے وسیع وعریض میدان نظر آئے گا،

یہاں جو تم آئے ہو، وہ اس لئے کہ تمہارے اندر اس علم کے سمندر میں شناوری کی استعداد پیدا ہو جائے، علوم وفنون سے مناسبت حاصل ہو جائے، جو فنون تم نے پڑھے ہیں، ان کی کوئی بھی کتاب آجائے تم اسے سمجھ سکو، اور کوئی مسئلہ درپیش ہو تو اسے حل کرسکو، متاخرین کی موشگافیوں پر حاوی ہوسکو، کیا صَرف، کیا نحو، کیا منطق وادب، کیا فقہ وعقائد، اور کیا علم حدیث وتفسیر، سب کی کتابیں اور سب کے مسائل تمہاری دسترس میں ہوں، اگر تم نے کافیہ پڑھ لی تو شرح جامی میں تمہارے لئے اندھیرا نہ رہے، اگر تم شرح وقایہ پڑھ چکے ہو، تو ہدایہ حل کرسکتے ہو، اور تم نے شرح شمسیہ یعنی قطبی پڑھ لی ہے تو سلّم کی بلندیوں پر چڑھ سکو، یہ ہے استعداد کا مطلب۔ کیا تم نے کبھی اپنے ذہن ودماغ کا جائزہ لیا کہ یہ استعداد تمہیں حاصل ہو رہی ہے یا نہیں، عبارت صحیح پڑھتے ہو، کسی قدر مطلب حل کرلیتے ہو، اگلی کتاب سے طبیعت میں اجنبیت کا احساس تو نہیں ہوتا، فن کی غیر درسی کتابوں میں ذہن ناکارہ تو نہیں ہو جاتا۔ اگر نہیں غور کیا ہے، تو اب غور کرلو۔ پس یہاں علم کے بارے میں تمہیں اسی کی محنت کرنی ہے یہ گفتگو نامکمل رہ جائے گی، اگر تمہیں اس استعداد کی تحصیل کا طریقہ نہ بتادوں۔ گو کہ اساتذہ کرام اسباق میں ہمیشہ اس کے طریقے کی جانب رہنمائی کرتے رہتے ہیں، تاہم اصولی طور پر یہ عرض کردینا نامناسب اور غیر مفید نہ ہوگا، کہ حصول استعداد کے تین ارکان ہیں، بس ان ارکان کو ذہن ودماغ میں گرہ دے لو۔ اول یہ کہ اسباق میں اگلے سبق کے مطالعے کے ساتھ حاضری ہو، مطالعہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سارا سبق تم حل کرلو۔ اجمالاً اس کا مطلب سمجھ لو اور بس۔ دوسرے یہ کہ استاذ کی تقریر غور سے سنو، ذہن کو ادھر ادھر بھاگنے نہ دو، اور پھر اس تقریر کو عبارت پر منطبق کرلو، اور تیسرا کام یہ ہے کہ اس کا مذاکرہ کم از کم ایک بار کرلو، اگر تم اتنا کام پورے سال اہتمام کے ساتھ کرتے رہے تو سمجھ لو کہ استعداد میں کوئی کمی نہ رہے گی۔ حصول استعداد کا یہ طریقہ میں نہیں بتا رہا ہوں، یہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کا ارشاد فرمودہ نسخہ ہے، جن کی حذاقت ومہارت کا ایک جہاں قائل ہے۔

جو تین باتیں میں نے کہی ہیں، ان میں سے دوسری بات! سیکھے ہوئے علم کو دوسروں تک منتقل کرنے کی استعداد و صلاحیت ہے، اگر تم نے علم حاصل کر لیا، مگر اسے دوسرے طالبین یا غافلین تک پہونچا نہ سکے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے تم نے عطر کو شیشی اور مشک کو ڈبے میں بند کر کے رکھ دیا ہے، بھلا بتاؤ، اس عطر اور اس مشک کا کیا فائدہ جو مہر بند ہو، تم ڈھکنا کھولنا سیکھو تا کہ عالم معطر اور فضا مشکبار ہو جائے، علم کا عطر مجموعہ دل میں بند رہتا ہے مگر اس کا ڈھکن زبان اور قلم سے کھلتا ہے، منتظمین مدرسہ نے انجمن تہذیب اللسان کے دائرہ میں تمھیں اس بات کا موقع دیا اور وسائل مہیا کئے کہ تم سلیقہ کے ساتھ اپنی زبان اور قلم کے ذریعے اپنا علم دوسروں تک منتقل کر سکو، خواہ دوسرے لوگ عوام ہوں، یا طلبہ، تحریر و تقریر دو عظیم الشان فن ہیں، ان میں جیسی عمدہ لیاقت ہوگی، اپنے علم کو اتنی خوبصورتی اور حسن و جمال کے ساتھ پیش کر سکو گے، علماء کا فریضہ ہے کہ وہ شریعت مقدسہ کو پیکر جمیل کی صورت میں عوام کے سامنے پیش کریں تا کہ وہ اس کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر اس کی جانب لپکیں، اور یہ بات بغیر عمدہ تحریر و تقریر کے حاصل نہیں ہو سکتی، مدرسہ میں تمہاری حیثیت جو بھی ہو، مگر جب اپنے دیار و وطن میں پہونچو گے تو تمہارے متعلقین اور اہل وطن کی خواہش ہوگی اور بجا طور پر ہوگی کہ تم انھیں دین کی باتیں سناؤ۔ بتاؤ کیا تم اپنے کو اس پوزیشن میں پاتے ہو کہ بے تکلف ان کے سامنے اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی باتیں پیش کر سکو۔

اب آخری بات سنو! یہ بات اول بھی ہے، اوسط بھی ہے اور آخری بھی۔ وہ ہے تہذیب اخلاق، مدرسہ میں تمھیں جہاں علم حاصل کرنا ہے، علم کی اشاعت کا طریقہ سیکھنا ہے، وہیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ تمہاری اخلاقی و قلبی حالت کیا ہے؟ اسلام نے بطور خاص قلب کی اصلاح کو اپنا موضوع بنایا ہے، اخلاق کا تعلق قلب ہی سے ہے، اپنے دل کا جائزہ لو، اور دیکھو کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہیں۔ یوں تو قلب کے وظائف بہت ہیں۔ خدا کرے تمہارا تعلق کسی شیخ طریقت سے ہو جائے، تو تم بہت کچھ سیکھو گے۔

یہاں صرف تین باتوں کی طرف توجہ دلاؤں گا۔ ایک تو یہ کہ اخلاق حسنہ کی بنیاد تواضع ہے، تواضع کا مطلب یہ ہے کہ فضائل وکمالات میں اپنے کو کمتر سمجھو، ہر برائی کی جڑ کبر ہے، اور ہر بھلائی کا منبع تواضع ہے۔ دیکھو دنیا میں بڑائی صرف خدا کو زیب دیتی ہے، وہی بڑا ہے، اور سب چھوٹے ہیں، ان کے سامنے کوئی بڑائی ہانکے، اس سے بری کوئی بات نہیں۔ خوب اچھی طرح سن لو کہ علم میں ایک سرور ہوتا ہے، یہ سرور طغیان پیدا کرتا ہے، اور پھر یہ طغیان تکبر کی صورت میں ظاہر ہوکر عالم کو بدنما بنا دیتا ہے، تم ابتداء ہی سے تواضع کے خوگر بنو، خبردار کبر کا سایہ بھی تم پر نہ پڑے۔

دوسری چیز ترک منازعت ہے، علم، وقار اور متانت چاہتا ہے، اور منازت اس کی ضد ہے، نہ عالم سے جدال کرو، اور نہ جاہل سے الجھو، عالم سے بحث وجدال کرو گے تو وہ تمہیں ذلیل اور رسوا کرنے کی فکر میں ہوگا، اس طرح تم ذلیل اور وہ گنہگار ہوگا۔ اور جاہل سے الجھو گے تو ساری دنیا تم پر تھوکے گی، اگر تمہیں اپنی بات حق معلوم ہوتی ہے، تو کہہ کر خاموش ہوجاؤ، منوانے کی ذمہ داری تمہاری نہیں ہے۔ یہ طریقہ بہت اسلم ہے، نہ مدرسہ میں، نہ وطن میں، کہیں بھی کسی سے منازعت نہ کرو، آدمی بحث وجدال اور جھگڑے میں اعتدال پر نہیں رہتا، اور اس کی نیت بھی اچھی نہیں رہ پاتی، مشہور ہے کہ امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ نے اپنے بیٹے حضرت حمادؒ کو مناظرہ سے منع کیا۔ انھوں نے عرض کیا کہ مناظرہ تو آپ نے بھی کیا ہے، پھر کیوں منع کرتے ہیں، انھوں نے فرمایا کہ ہمارے اور تمہارے مناظرہ میں نیت کا فرق ہے، اس لئے روکتا ہوں۔ میں مناظرہ کرتا تھا تو ہمیشہ دل میں یہ ارادہ اور خواہش رکھتا تھا کہ فریق مقابل کے منہ سے کوئی معقول اور حق بات نکل آئے تو میں اسے تسلیم کرلوں، اور تم اپنے مناظرہ میں یہ چاہو گے کہ میرے مناظر کے منہ سے کوئی ناحق بات نکل آئے تو میں اسے ذلیل کردوں، گویا تم نے اس کی گمراہی کی خواہش کی اور پھر اسے ذلیل کرنا چاہا۔ دیکھو تو سہی یہ کیسی پرخطر بات ہے۔ تم اس لئے نہیں ہو کہ دوسروں کو گمراہی پر دیکھنا پسند کرو۔ پس

اس کا خیال رکھو، ہرگز ہرگز منازعت کے قریب نہ جاؤ۔

تیسری بات جو نہایت ضروری ہے، ترکِ حسد ہے، یہ بیماری طبقۂ علماء میں بہت ہے، معاصرین میں حسد کی بہتات ہوتی ہے، ایک ساتھی دوسرے ساتھی کی اچھی حالت اور مقبولیت دیکھ کر جلتا ہے، حسد کی آگ زبردست آگ ہے، اس سے بہت بچو، حاسد زبردست جرم کا مرتکب ہو رہا ہے، ایک تو اپنے بھائی کو ستا رہا ہے، اور اس کی ذہنی وقلبی اذیت کا باعث بن رہا ہے، دوسرے اس سے بڑا جرم یہ ہے کہ حق تعالیٰ پر اعتراض کر رہا ہے کہ وجاہت اور مقبولیت یا مال ودولت کی نعمت فلاں کو کیوں ملی، حق تعالیٰ کو چاہئے تھا کہ اسے نہ دے کر مجھے عطا فرماتے۔ پھر جب وہ نہیں پاتا تو اللہ تعالیٰ ہی سے ناراض ہوجاتا ہے، یہ مرض بڑا سنگین مرض ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ خوب اچھی طرح سمجھ لو، اور دل میں جمالو کہ عطا فرمانے والے حق تعالیٰ ہیں، وہ جس کو جو نعمت دینا چاہیں، ان کی مرضی ہے۔ میں کون ہوتا ہوں دخل دینے والا۔ دوسرے یہ کہ محسود کی تعریف زبان سے کرتا رہے، اس کے سامنے تواضع کا معاملہ کرے، انشاء اللہ اس سے حسد ختم ہوجائے گا۔ گو کہ اس میں مجاہدہ بہت سخت ہے، لیکن خوب یاد رکھو، نارِ جہنم اس مجاہدہ سے بدرجہا سخت ہے۔

بس یہ تین چیزیں اگر تم نے حاصل کر لیں تو تمہارے اخلاق کی تہذیب ہوگئی، پھر تم ایک شیریں انسان ہوگے، جو تمہیں برتے گا، وہ تم پر فدا ہوجائے گا۔

اب آخر میں تم کل کا خلاصہ مختصر طور پر یاد رکھ لو کہ مدرسہ میں تمہیں تین باتیں حاصل کرنی تھیں۔ اول استعداد علم، دوم استعداد نشر، سوم تہذیب اخلاق۔ خوب غور کر لو کہ ان تین باتوں میں سے تم کتنا حاصل کر چکے ہو۔

حق تعالیٰ سے بصمیمِ قلب دعا ہے کہ تم عالم باعمل، عالم ربانی وحقانی بنو، ہر قسم کے شرور وفتن سے تمہاری حفاظت رہے۔ اور دنیا وآخرت میں سرخرو اور کامیاب رہو۔ اور میں تم لوگوں سے اسی دعا کا آرزو مند اور امیدوار ہوں۔ فقط فقط فقط

نصاب تعلیم کی اصلاح وترمیم

جائزے اور مشورے

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ اٰلہٖ وصحبہٖ اجمعین، اما بعد!

ایک عرصہ سے اصلاح نصاب کی آوازیں مختلف حلقوں سے لگائی جارہی ہیں ، ان آوازوں کی زد، صرف اس نصاب تعلیم پر ہے جو فی زمانہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے طرز کے مدارس میں معمول بہ ہے، اس نصاب تعلیم کی بنیاد جیسا کہ مشہور ہے درس نظامیہ پر ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ درس نظامیہ جو حضرت ملا نظام الدین فرنگی محلیؒ کی طرف منسوب ہے، دارالعلوم دیوبند کا نصاب اس سے بہت کچھ مختلف ہے، مگر کہا اسے بھی درس نظامیہ ہی جاتا ہے، دعویٰ یہ کیا جاتا ہے محتاجِ اصلاح صرف یہی نصاب ہے، خرابیاں ساری اسی میں ہیں، ان مشوروں کا نشانہ قدیم طرز تعلیم ہی کے علماء ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ اصلاح کی ضرورت زیادہ شدت سے محسوس کرتے ہیں، انھیں جب موقع ملتا ہے درس نظامیہ کی اصلاح نہیں بلکہ یکسر اسے ترک کرکے دوسرا نصاب تجویز کرکے اس کا تجربہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ندوۃ العلماء نے اپنا ایک نیا نصاب تعلیم تجویز کیا۔ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر نے اپنا مستقل نصاب تعلیم تجویز کیا، مشرقی یوپی کی نئی بڑی درس گاہ جو جماعت اسلامی سے وابستہ ہے یعنی جامعۃ الفلاح بلریا گنج اس کا علیٰحدہ نصاب تعلیم ہے، ان کے علاوہ اور بھی بعض تجدد پسند مدارس ہیں، جو درس نظامیہ سے اپنا دامن چھڑا کر الگ نصاب چلا رہے ہیں، ان سب نصابہائے تعلیم میں اگر کسی کو اصلاح

وترمیم کے لئے منتخب کیا جاتا ہے تو وہ درس نظامیہ کا نصاب تعلیم ہے، جتنی خرابیاں اور معائب ہوسکتے ہیں، سب اسی میں گنوائے جاتے ہیں، اس کے علاوہ دوسرے نصابوں میں غالباً ترمیم واصلاح کی ضرورت نہیں، شاید جدید نصاب وضع کرنے والوں کو یہ آرزو ہو کہ درس نظامیہ کے بجائے ان کا ایجاد کردہ نصاب قبول کرلیا جائے۔

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ بار بار اصلاح کی یہ صدا کیوں بلند ہوتی ہے؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم سے فارغ ہونے والے علماء میں کوئی ایسی کمی پائی جاتی ہے، جسے عام طور پر لوگ محسوس کررہے ہیں، اور جس کا دور کرنا نصاب تعلیم کی اصلاح پر موقوف ہے، مطلب یہ ہے کہ یہ علماء اس معیار پر پورے نہیں اترتے، جو معیار علماء کے لئے مطلوب ہے، کسی درخت کے پھل اگر معیاری نہیں حاصل ہورہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ درخت ناقص ہے، غالباً یہ باور کیا جارہا ہے کہ جس تناسب سے بہتر اور معیاری علماء حاصل ہونے چاہئیں، اس نصاب تعلیم کی وجہ سے اس تناسب سے نہیں بن پارہے ہیں، ظاہر ہے کہ کسی بھی نصاب تعلیم کے پڑھے ہوئے لوگ ہوں، سب کے سب معیاری نہیں ہوسکتے، ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ تمام پڑھنے والے معیاری عالم بن گئے ہوں، بہت سے لوگ علم حاصل کرتے ہیں، تو ان میں سے چند لوگ بلند معیار کے پیدا ہوتے ہیں، اور باقی اپنے مختصر علم اور تھوڑی سی معلومات لے کر اپنے ماحول میں گم ہوجاتے ہیں۔ معاشرہ پر اثر تو ان کا بھی ہوتا ہے مگر ایسے علماء کہ جنھیں تاریخ کا حافظہ یادرکھے، اور وہ قوم وملت کی عمومی رہنمائی کریں۔ ہر زمانے میں تھوڑے ہی ہوتے ہیں، تو جو مختصر سی تعداد اچھے معیاری علماء کی ہونی چاہئے اتنی قلیل تعداد بھی حاصل نہیں ہورہی ہے، اور ایسا نصاب تعلیم کے نقص کی وجہ سے ہوتا ہے، اگر اس کی اصلاح کردی جائے تو مطلوبہ تعداد حاصل ہونے لگے گی۔

یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ وہ معیار مطلوب کیا ہے، جس پر، پرکھ کر انھیں معیاری یا غیر معیاری قرار دیا جائے، یہ معیار متعین کرنا ان حضرات کی ذمہ داری

ہے، جو نصاب تعلیم کی اصلاح کے لئے کوشاں ہیں، تا کہ ان کی کوشش علیٰ وجہ البصیرۃ ہو، پھر یہ بھی بتانا ہوگا کہ نصاب تعلیم ہی کے نقص کی وجہ سے یہ مطلوبہ معیار حاصل نہیں ہو رہا ہے، جب تک یہ دونوں باتیں واضح نہ ہو جائیں، ترمیم واصلاح کی بات ہوائی فائرنگ سے زیادہ نہیں۔

جہاں تک ہم نے غور ومطالعہ کیا ہے یہ حضرات کوئی متعین اور واضح معیار نہیں بتاتے، مجمل اور گول مول باتیں تو بہت سننے میں آتی ہیں، مثلاً یہ کہ علوم آلیہ ہی کے پڑھنے پڑھانے میں عمریں ضائع کر دی جاتی ہیں، شرعی علوم قرآن وحدیث اور نقد رجال وغیرہ پر کم توجہ دی جاتی ہے، فقہ وکلام میں سارا زور خلافیات پر صرف ہوتا ہے، فقہی اور کلامی مسائل پر علماء میں باہم تفسیق وتکفیر کی عام گرم بازاری ہے، جدید علوم وفنون کی تحصیل اگر کفر نہیں تو درجہ فسق تک ضرور ہے، علماء کو جدید علوم کا بھی عالم ہونا چاہئے، یورپ کے مصنفین اسلام پر جو حملے کر رہے ہیں۔ ان کے جواب کی ان میں صلاحیت ہونی چاہئے۔ علماء کو ملحدین یورپ کے خیالات سے واقف ہونا چاہئے تا کہ یورپ اور امریکہ جا کر وہ اسلام کی تبلیغ کر سکیں، کتاب سمجھنے والے علماء تو پائے جاتے ہیں، لیکن کسی فن کے ماہر نہیں پائے جاتے، وغیرہ وغیرہ۔ اسی قسم کے افکار وخیالات دیکھنے اور سننے میں آتے ہیں، ان کا حاصل بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ علماء کو انگریزی زبان اور انگریزی علوم میں مہارت حاصل کرنی چاہئے اور یہ بات درس نظامیہ سے حاصل نہیں ہوتی۔

یہ بات مستقلاً قابل غور ہے کہ کیا علماء کیلئے یہی معیار مطلوب ہے؟ یا اس کے علاوہ کچھ اور معیار ہے؟ تاہم اس سے قطع نظر کر لیجئے اور غور کیجئے کہ جن لوگوں نے اصلاح وتجدید کے نام پر درس نظامیہ کے نصاب تعلیم کو بدل کر نیا نصاب جاری کیا، اور اب اس نصاب پر ایک طویل مدت گزر چکی ہے، کیا اس نصاب سے معیار مذکور کے مطابق اچھے تناسب سے علماء تیار ہوئے ہیں، جو قدیم علوم یعنی اسلامی علوم وفنون تفسیر

وحدیث اور فقہ وغیرہ کے بھی ماہر ہوں ، اور اس کے ساتھ ساتھ جدید علوم وفنون اور انگریزی زبان میں بھی درجۂ کمال رکھتے ہوں ۔ چند ایک کا اعتبار نہیں ، یہ چند مستثنیٰ لوگ تو درس نظامیہ کے علماء میں بھی ملتے ہیں، اور سب ان کا اعتراف کرتے ہیں، بات عمومی ہونی چاہئے ، اس پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں، تو مایوسی سی ہوتی ہے، کیونکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نصاب جدید کے تعلیم یافتہ فضلاء بجائے اس کے کہ دینی علوم وفنون میں مہارت حاصل کرتے اور اپنے آپ کو دین کیلئے وقف کرتے ، وہ ان مدارس کو دنیوی علوم کے جامعات (یونیورسٹیوں) میں پہونچنے کے لئے بطور زینہ استعمال کرتے ہیں ۔ پھر ان میں سے بڑی تعداد دنیا طلبی کی دوڑ میں شریک ہو کر اپنا اور اپنے گھر والوں کا معیارِ زندگی اونچا بنانے کی فکر میں لگ جاتی ہے، اور ایسے لوگ پھر دوبارہ اپنے بچوں کو ان مدارس میں بھیجنے کے بجائے براہ راست انگریزی جامعات کے حوالے کردیتے ہیں ، چنانچہ بہت کثرت سے اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ جدید نصاب کے تعلیم یافتہ حضرات میں انھیں کی ذات تک علم دین محدود رہتا ہے، اپنی اولاد پر وہ یہ ’’بوجھ لادنا‘‘ گوارا نہیں کرتے ، ہم یہ نہیں کہتے کہ سب ایسا کرتے ہیں، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اتنی کثرت سے ایسا ہوتا ہے کہ جدید نصاب والوں کی علامتی شناخت یہی کیفیت بن گئی ہے۔

اس گفتگو سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ہم نصاب تعلیم میں مطلق اصلاح کے مخالف ہیں ، بلکہ کہنا یہ ہے کہ نصاب تعلیم کے ذمے سارا قصور تھوپ دینا زیادتی کی بات ہے، اس قصور میں کچھ اور عوامل ومحرکات بھی ہیں، انھیں بھی سامنے رکھنا چاہئے

☆☆☆☆☆

ایک سوال یہاں اور بھی ہے کہ کیا قدیم طرز کے ان مدارس نے نصاب تعلیم میں اصلاح کا عمل نہیں کیا ہے، درس نظامیہ کا علمبردار، دارالعلوم دیوبند کو مانا جاتا ہے، جن مدارس کا تعلیمی سررشتہ یہاں سے جڑا ہوا ہے، وہ اپنے اپنے احوال وظروف کے اعتبار سے یہیں کے نصاب تعلیم کو قدرے تصرف کے ساتھ چلا رہے ہیں، میں نے

شروع میں عرض کیا تھا کہ دارالعلوم دیوبند کا نصاب درس نظامیہ سے مختلف ہے، یہ گویا نصاب تعلیم کی اصلاح کی جانب پہلا قدم تھا کہ بعینہٖ درس نظامیہ کو قبول نہیں کیا گیا، پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ اس میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں عمل میں آتی رہی ہیں، اگر دارالعلوم دیوبند کی سال بسال رودادیں دیکھی جائیں تو ان تبدیلیوں کا تفصیلی نقشہ سامنے آجائے گا۔ تاہم اجمالاً اتنی بات تو معلوم ہے کہ ابتداء میں معقولات کی جس قدر کتابیں داخل نصاب تھیں، اب ان کی بڑی مقدار گھٹ کر رہ گئی ہے، منطق میں آخری کتاب ''سلم العلوم'' اور فلسفہ میں اول وآخر ''میبذی'' رہ گئی ہے، ابتدائی درجات میں قرآن پاک کے ترجمہ اور احادیث کے بعض مجموعوں کا اضافہ ہوا ہے، اسی طرح عصری علوم کا بھی نصاب میں اضافہ ہوا ہے، انگریزی جس کے داخل کرنے کیلئے بڑی بے قراری تھی، وہ بھی داخل درس ہوگئی، عربی تحریر وتقریر کا بھی معقول اضافہ ہوا، درس نظامیہ میں صرف ایک کتاب حدیث کی ''مشکوٰۃ شریف'' تھی، دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں اب پورا ایک سال صرف حدیث کے لئے وقف ہے۔ جس میں تقریباً دس کتابیں حدیث کی عبوراً سہی طالب علم کی نظر سے گزر جاتی ہیں، نحو میں شرح جامی کی متبادل شرح ابن عقیل رکھی گئی، دیکھا جائے تو اس طرح کی جزوی ترمیمات بکثرت ہوئی ہیں۔ ہاں یہ ہے کہ سرے سے اس نصاب کو فنا نہیں کردیا گیا ہے۔

بہرحال یہ اجمالی معلومات بتاتی ہیں کہ اصلاح نصاب سے ارباب دارالعلوم غافل نہیں ہیں، البتہ اس کے لئے ان حضرات نے شور وغل نہیں مچایا، اصلاح نصاب کا پریس اور اخبارات میں نعرہ نہیں لگایا، جلسے اور کانفرنسیں نہیں کیں۔ لمبی لمبی رپورٹیں نہیں پیش کیں۔ جو کرنا تھا خاموشی سے کر ڈالا، اور دارالعلوم اور اس کے متعلقہ مدارس میں غالباً یہی بڑی کمزوری ہے کہ جتنا کرتے ہیں اس سے زیادہ تو کیا اشتہار واعلان کرتے، اتنا بھی نہیں کر پاتے، اس لئے ان کے کاموں کا تعارف لوگوں میں نہیں ہو پاتا، خیر اب یہ حضرات بھی اس دوڑ میں شریک ہونے کی تیاریوں میں لگ گئے ہیں،

مگر شاید تمام تر کوششوں کے باوجود پروپیگنڈہ کے فن کو یہ اس طرح نہ برت سکیں، جیسے دوسرے لوگ اسے برت لیتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

آیئے اب اس سوال پر غور کریں کہ دارالعلوم دیوبند کا موجودہ نصاب تعلیم کیا واقعی محتاج اصلاح وتجدید ہے، اگر ہے تو اس اصلاح کی نوعیت کیا ہوگی، اس کے اصول کیا ہوں گے؟ اور اس نصاب کی وجہ سے تعلیم میں کیا نقص رہ جاتا ہے؟

اس سوال کے جواب سے پہلے دو بنیادی باتوں کو بخوبی مستحضر کر لینا چاہئے، اور اس کو کسی مرحلے میں فراموش نہیں ہونے دینا چاہئے ''اول'' یہ کہ درس تدریس کا موضوع یہ نہیں ہے کہ کسی طالب علم کو بالفعل علوم وفنون کا ماہر بنادیا جائے، کسی بھی علم وفن کی مہارت تحصیل علم کی ابتدائی مدت میں ہو بھی کیسے سکتی ہے، اس کے لئے تو ایک طویل ریاض، بکثرت مطالعہ، اور تعمق نظر کے ساتھ غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے، درس وتدریس کا ماحصل یہ ہے کہ طالب علم میں اتنی استعداد پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے فنون کی کتابیں بخوبی سمجھ لے اس کے بعد اگر وہ اپنی اس استعداد علمی کو کام میں لائے گا، اور علم ہی کے اشتغال میں رہے گا، تو اس کا علمی پایہ بلند ہوتا جائے گا، اور وہ بڑا عالم بن کر قوم وملت اور دین ومذہب کی خدمت انجام دینے کے قابل ہو جائیگا۔

''دوسرے'' یہ کہ تعلیم کا بنیادی رکن صرف نصاب تعلیم نہیں ہے، بلکہ اس کے بنیادی ارکان تین ہیں۔ اساتذہ، طلبہ، اور نصاب تعلیم۔ ان تینوں میں اول الذکر دو ارکان ذی شعور، منطق کی اصطلاح میں ذوی العقول، زندہ اور متحرک بالارادہ ہیں، اس کے برخلاف نصاب تعلیم ایک بے روح، غیر ذی عقل اور غیر متحرک بالارادہ ہیں، اس کی حیثیت استاذ وطالب علم کے درمیان حصول علم کے لئے ایک واسطہ اور آلہ کی ہے، اس میں روح انھیں ارکان کی وجہ سے آتی ہے، استاذ اور طالب علم میں جس قدر ذہانت وذکاوت قوت ومحنت اور طلب وحوصلہ مندی ہوگی، اسی کے بقدر نصاب تعلیم

میں جان آئے گی، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ نصاب تعلیم اگر دونوں کی ضرورت کے لحاظ سے بہتر ہوگا، تو اس میں روح زیادہ طاقتور اور مفید ہوگی، اور اگر اس سے کمتر ہوگا تو اسی اعتبار سے روح اور افادیت میں کمزوری ہوگی، لیکن اگر نصاب تعلیم بہتر سے بہتر ہو، مگر استاذ وطالب علم طلب وکوشش یا ذہانت وذکاوت سے تہی دامن ہوں تو اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلے گا، اس کا حاصل یہ ہے کہ ابتدائی طور پر اساتذہ وطلبہ پر توجہ مرکوز ہونی چاہئے، استاذ وطالب علم کی مشترکہ ذہانت اور جد واجتہاد کے باوجود اگر معیار کے مطابق نتیجہ نہ نکل رہا ہو، تو البتہ غور کیا جاسکتا ہے کہ نصاب تعلیم میں کوئی کوتاہی ہے، فرض کرلیجئے کہ اساتذہ اور طلبہ دونوں اپنا اپنا تعلیمی حق ادا کررہے ہیں، تب بھی تعلیم میں کچھ کمزوری رہ جاتی ہے یا نہیں؟ میرے نزدیک اس کا جواب اثبات میں ہے اور اسی بنا پر نصاب میں قدرے اصلاح وترمیم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، واضح رہے کہ ہماری یہ گفتگو صرف دارالعلوم دیوبند اور اس سے متعلقہ مدارس کے نصاب کے سلسلے میں ہے، اور ہندوستان میں اکثریت ایسے ہی مدارس کی ہے، رہے وہ مدارس جن کا نصاب تعلیم جدید ہے، ان کے بارے میں لب کشائی شاید جرم ہو، حالانکہ غالباً وہ زیادہ محتاج اصلاح ہیں۔

ہمارے ناقص تجربے میں نصاب میں ضرورت اصلاح کی دو بنیادی علتیں ہیں، ایک تو طلبہ کی استعدادوں کا بالعموم کمزور ہونا، اور زیادہ محنت کا متحمل نہ ہونا، دوسرے بعض کتابوں میں خلط مبحث اور لفظی گورکھ دھندوں کا زیادہ ہونا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے مختلف اسباب وموثرات کے باعث تجربہ یہ ہے کہ آج کل نوجوانوں کی صحت عموماً کمزور ہوتی ہے، اور اسی لحاظ سے ذہانتیں، حافظے اور استعدادیں بھی کمزوری کا شکار ہیں، اس بلا میں صرف عربی مدارس کے غریب طلبہ ہی نہیں مبتلا ہیں، بلکہ انگریزی مدارس میں جانے والے صاحبان ثروت کی اولادوں کا بھی کم وبیش یہی حال ہے۔ ولادت کے دن سے جو دواؤں کا سلسلہ جاری ہوتا ہے، تو

شاید کسی مرحلے میں ٹوٹنے کا نام نہیں لیتا، صحت کی کمزوری کی وجہ سے جیسی محنت ومشقت طلب علم کیلئے ہونی چاہئے ویسی ہو نہیں پاتی، اور نصابی کتابوں کا بوجھ کچھ زیادہ ہے، ان سب کتابوں کا تحمل نہیں ہو پاتا جیسے کسی کی قوت ہضم تین روٹیوں کے بقدر ہے، اور اسے پانچ روٹیاں کھلا دی جائیں، تو ظاہر ہے کہ نتیجہ برا ہوگا، اس علت کا تقاضا یہ ہے کہ نصاب میں قدرے تخفیف کردی جائے، ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی جماعتوں سے لے کر انتہائی جماعتوں تک طلبہ پر کتابوں کا بوجھ ان کے تحمل سے زیادہ لدا ہوا ہے، ابتدائی درجات کی کتابیں، طالب علموں کے لئے بالکل نامانوس ہوتی ہیں، اور ان میں سے کئی ایک زبانی یاد کرنی ہوتی ہے، ان درجات میں جب کتابیں زیادہ ہوں گی، تو کسی کا حق کما حقہ ادا نہیں ہوگا، نیچے کی تعلیم اس طرح ناقص رہ جاتی ہے، استعداد نہیں بن پاتی کہ انھیں اوپر کے درجوں میں ڈھکیل دیا جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ استعداد میں مزید کورے ہو جاتے ہیں۔

اور اوپر کے درجات میں اتنی اتنی کتابیں ایک ایک جماعت میں ہیں کہ اگر ایک جماعت کی سب کتابیں ایک استاذ کے حوالے کردی جائیں تو وہ اس کے لئے ناقابل تحمل ہو جائیں گی، حالانکہ پہلے سے وہ انھیں پڑھے اور سمجھے ہوئے ہے، تو طلبہ جن کو پہلی بار ان کتابوں سے سابقہ پڑا ہے، ان کیلئے کتنی دشواری ہوگی، اس طرح طالب علم کسی ایک کتاب پر پورے طور سے محنت نہیں کر پاتا، نہ سمجھ پاتا، نہ یاد رکھ پاتا۔

میرا تجربہ ہے کہ طالب علم اپنے درجے کی سب کتابوں پر کما حقہ محنت کرنا چاہے، اور ان کی استعداد بنانا چاہے، تو محض ضروری حاجات کے بعد دن رات کے باقی کل حصے کو لگا دے تو شاید اس سے عہدہ برآ ہو سکے، اس لئے یہ سمجھ میں آتا ہے، کہ جس طرح دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی دور میں، بلکہ بہت بعد تک جماعتوں میں کم کتابیں ہوا کرتی تھیں، اسی کو لوٹا دیا جائے۔ دارالعلوم دیوبند کے امتحان سالانہ کی پرانی رپورٹوں کے حوالے سے پتہ چلتا ہے اکثر جماعتوں میں بیک وقت تین چار کتابوں

سے زائد نہیں ہوتی تھیں، سوانح قاسمی میں ۱۲۸۵ھ کی روداد کے حوالے سے تحریر ہے کہ ”وقتِ واحد میں تین کتابوں سے زیادہ پڑھنے کی اجازت کسی طالب علم کو نہیں دی گئی تھی، ج:۲ص:۲۸۶۔“

اور تاریخ دیوبند میں سید محبوب رضوی مرحوم لکھتے ہیں کہ:

> ”باستثنائے دورۂ حدیث جس میں دس کتابیں پڑھائی جاتی ہیں کسی طالب علم کو ایک وقت میں چار کتابوں سے زیادہ اسباق پڑھنے کی اجازت نہیں ہے، البتہ کسی کتاب کے ختم ہوجانے پر اسی گھنٹہ میں دوسری کتاب مل سکتی ہے، چنانچہ ابتدائی کتابوں کی جماعتوں میں اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے، اور اس طرح ایک سال میں طالب علم آٹھ کتابیں پڑھ لیتا ہے۔“ طبع اول ص:۱۱۴

اسی لحاظ سے اب جماعتوں میں کتابوں میں کچھ تخفیف کر دینی مناسب ہے۔

عربی کے ابتدائی تین درجات میں ایک وقت میں محض تین کتابیں رکھی جائیں، اور ضرورت کے لحاظ سے سال کے دو حصے کر دیئے جائیں، تین پہلے حصے میں، تین دوسرے حصہ میں، اس طرح پانچ یا چھ کتابیں ایک سال یعنی نو ماہ کی مدت میں ہوں گی، کیونکہ تعطیلات وغیرہ خارج کر کے تعلیمی سال زیادہ سے زیادہ نو ماہ کا بنتا ہے۔ نو ماہ میں ابتدائی درجات کیلئے پانچ چھ کتابیں کم نہیں ہیں۔

عربی کے اس کے بعد والے درجات میں دورۂ حدیث کے پہلے پہلے تک ایک وقت میں چار گھنٹے ہوں تو مناسب ہے، خواہ دو کتابیں ہوں یا تین کتابیں، یا چار، اور دورۂ حدیث کو دو سال میں تقسیم کر دیا جائے، اس طرح کتابوں کا بوجھ کم ہوجائے گا، اور محنت کرنے والے اپنی طاقت کے بقدر محنت کریں گے تو ان شاء اللہ خاطر خواہ نتیجہ نکلے گا۔

دوسری بنیادی علت بعض نصابی کتابوں میں خلطِ مبحث کا ہونا ہے، اس سلسلے میں عرض ہے کہ بلاغت میں ”مختصر المعانی“، علم کلام میں ”شرح عقائد“ منطق میں ”قطبی“، نحو میں ”شرح جامی“ فلسفہ میں ”میبذی“ اور اصول فقہ میں کسی قدر

''نورالانوار'' اس زمرہ میں آتی ہیں، کہ ان میں کم وبیش خلط مبحث اور لفظی گورکھ دھندے پائے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے طالب علم اصل فن سے دور ہوجاتا ہے، ان میں سے اکثر کی متبادل کتابیں تلاش کرنی چاہئیں۔

''مختصر المعانی'' کے بجائے، **دروس البلاغة**، اور **البلاغة الواضحة**، یا اور کوئی ان دونوں سے بہتر کتاب رکھی جائے، عقائد میں ''**عقيدة الطحاويه**'' کافی ہے، جی چاہے تو اس کے ساتھ عقائد نسفی (متن) پڑھادیا جائے، نحو میں شرح جامی اور کافیہ کے بجائے مفصل (**للزمخشری**) دوسال میں پڑھادی جائے، یا یہ کہ پہلے کافیہ سادہ انداز میں بغیر **فإن قيل**، **قلنا** کے پڑھادی جائے، اس کے بعد مفصل پڑھائی جائے۔

منطق وفلسفہ قدیم کا فن اب تقریباً خارج از بحث ہے، شرح تہذیب، قطبی سلم العلوم اور میبذی، یہ سب کتابیں اس طور سے پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں کہ استاذ بھی شاید یہی سمجھتا ہے کہ یہ پڑھانے کی چیزیں نہیں ہیں، اور طالب علم تو ابتداء ہی فرض کرلیتا ہے کہ ان کتابوں کا کوئی تعلق سمجھنے سے نہیں ہے، ان کتابوں کے پڑھنے پڑھانے میں وقت کے ساتھ دماغ کا بھی ضیاع ہے، منطق کی اصطلاحات جاننے کیلئے جماعت ثالثہ میں مرقات ذرا محنت سے پڑھادی جائے، میبذی تو بالکل لغو کتاب ہے۔

نصاب میں اتنی ترمیم مناسب معلوم ہوتی ہے، لیکن اس اصلاحی اہتمام سے کہیں زیادہ اہتمام اس کا کرنا چاہئے کہ اساتذہ صحیح طور پر مطالعہ کرکے کتاب کو خود سمجھیں اور پھر شفقت ومحبت کے ساتھ طالب علموں کو پڑھا کر مطمئن کریں، اور طالب علموں کو مکلّف کیا جائے کہ وہ اپنی وسعت وطاقت کے بقدر کوشش اور محنت میں دریغ روانہ رکھیں، اگر اس کا اہتمام نہ کیا گیا تو صرف نصاب کے بدلنے کا نتیجہ بے سود ہوگا۔

(مجلّہ المآثر ص: ٦٧ تا ٧٦، اکتوبر تا دسمبر ١٩٩٤ء)

☆☆☆☆☆

علم وعلماء اور نصابِ تعلیم

عرصۂ دراز سے ہم اپنے ملک میں علم اور علماء کا ماتم سنتے چلے آرہے ہیں، اور کہا جاتا ہے کہ اب علم باقی رہا نہ علماء، یعنی ایسے علماء نہیں رہے جو زمانہ سے باخبر ہوں، دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کر سکتے ہوں، یہ ماتم آج سے نہیں، اس کی ابتداء اس وقت سے ہوگئی تھی جب ہندوستان سے مغلیہ حکومت کا چراغ گل ہوا، اور مسلمان اچانک ایک گہری تاریکی اور ہمہ گیر مایوسی کے شکار ہوگئے تھے، جب کہ اس وحشت اور ظلمت کے دور میں اگر کوئی روشنی مسلمانوں کے حق میں ہوسکتی تھی تو وہ علماء ہی کے پاس مل سکتی تھی، اگر کوئی راستہ تھا تو علماء ہی کے بتانے سے معلوم ہوسکتا تھا اور خود باقی ماندہ علماء اپنے فریضے سے غافل نہیں تھے جہاں تک ان کی وسعت وطاقت تھی، انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو ان کے دین ومذہب کو سنبھالنے کی جدوجہد کی، لیکن نئ حکومت جو اپنے جلو میں نئ روشنی، نئ تعلیم، نیا طرزِ زندگی لئے، جبر وتشدد، الحاد واباحیت اور تشکیک وارتیاب کے طوفان عظیم کے ساتھ پھیلتی اور بڑھتی چلی جارہی تھی، اس کی رَو میں ملک کا بڑا حصہ بہتا چلا گیا، ان کی نظر میں علماء اور ان کی تحفظِ دین کے سلسلے کی ساری کاوشیں بے وقعت تھیں۔

۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی گرتی ہوئی حکومت نے آخری سنبھالا لیا، دہلی اور اس کے آس پاس کے حلقوں میں لال قلعہ کی محدود بادشاہی نے انگریزوں سے آخری پنجہ آزمائی کی مگر اس میں اس نے شکست کھائی، اس شکست کے نتیجے میں جو تھوڑی سی رہی سہی امید تھی اس کا بھی خاتمہ ہوگیا، اس جنگ میں دلی کے قریبی علاقہ تھانہ بھون اور شاملی کے میدان میں علمائے دین نے بھی حوصلہ مندانہ حصہ لیا، مشہور بزرگ حاجی

امداد اللہ رحمہ اللہ کی قیادت میں مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی اور دوسرے بہت سے علماء نے میدان کارزار میں نمایاں خدمت انجام دی، مگر جب اس میں ناکامی ہوئی اور ایک طرف سے علماء کا قتل عام شروع ہوگیا تو اندیشہ ہوا کہ علماء کے ختم ہوجانے سے دین ہی کا خاتمہ ہوجائے گا، اس دور کے اہل اللہ اور اہل علم کے قلوب میں اللہ کی طرف سے یہ تدبیر آئی کہ ایک عوامی طرز کا دینی مدرسہ قائم کیا جائے جس سے عوام کا گہرا ربط ہو، اور وہاں بیٹھ کر نئی نسل کی تربیت کی جائے، تاکہ وہ دین سے دور نہ ہونے پائے اور آئندہ اسلام کے تحفظ وبقا کا انتظام ہوسکے، یہی خیال تھا جو دیوبند کی سرزمین پر دارالعلوم کی شکل میں نمودار ہوا اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد سہارنپور اور مرادآباد میں اسی طرز کے مدرسے قائم ہوتے چلے گئے، اور پھر جابجا ان کی شاخیں کھلنے لگیں، مرکز دیوبند قرار پایا، یہاں علماء ومشائخ کی ایک ایسی جماعت اکٹھی ہوگئی جس کی نظیر چشم فلک نے کم دیکھی ہوگی، ان حضرات نے یکسوئی اور خلوص کے ساتھ اسلامی علوم اور دینی اعمال واخلاق اور روحانیت کی حفاظت وصیانت کو اپنا فرض سمجھا، دارالعلوم دیوبند محرم ۱۲۸۳ھ مطابق مئی ۱۸۶۶ء میں قائم ہوا، اس کے دس سال بعد سرسید مرحوم نے علی گڈھ میں ایک کالج کی بنیاد ڈالی ، اور مسلمانوں کو انگریزوں کی اطاعت فرمانبرداری اور انقیاد وخود سپاری کا سبق زور وشور سے پڑھانے لگے، مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ ان کے ساتھ ہوگیا۔

ان دونوں کے بعد علماء کا ایک طبقہ اور اٹھا جس نے قدیم وجدید دونوں کو آمیز کرکے دین کی خدمت کرنی چاہی، انھوں نے دین ودنیا کا ایک معجون مرکب تیار کرنا چاہا، ان کا مرکز لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نام سے وجود میں آیا۔ یہ تین گروہ برصغیر ہندوپاک میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے میدان عمل میں اترے تینوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا، ہر ایک نے دوسرے سے کچھ فائدہ اٹھایا مگر ان کا امتیاز وتشخص علیٰحدہ قائم رہا، ہر ایک کے خیالات الگ تھے، طریقۂ کار علیٰحدہ تھا۔

ان تینوں جماعتوں کا مرکز نظر اور نصب العین اس اعتبار سے تو متحد تھا کہ مسلم حکومت کے سقوط سے یکا یک ذلت وادبار کی جو گھٹا مسلمانان ہند پر چھا گئی تھی ، ہر ایک چاہتا تھا کہ مسلمان اس سے کسی طرح نجات حاصل کریں ، اور قدیم عزت وشوکت حاصل کریں ، سرسید مرحوم کا خیال تھا کہ اب حکومت بدل گئی ہے اور حکومت ہی عزت وسربلندی کا سرچشمہ ہے ، اسی سرچشمہ سے لگے لپٹے رہنے میں عزت حاصل ہونے کا امکان ہے ، اسی کا ساتھ دینا چاہئے ، اسی سے سربلندی حاصل ہوگی ، یہ طبقہ قدیم طرز کے علماء کے بالکل جانب مقابل سفر کر رہا تھا ، اس طبقہ والوں کو علم دین کے تقدس کا احترام ضرور تھا ، مگر وہ اس کو بالکل ثانوی اور ضمنی حیثیت سے قبول کرتے تھے ، ان کے نزدیک انگریز چونکہ فاتح قوم تھی اس لئے اس کی تقلید کرنی اور اس کی تہذیب کو اختیار کرنا ضروری تھا ، تا کہ جن راستوں سے وہ غلبہ وفتح مندی کی منزل تک پہونچے ہیں مسلمان بھی اسی راستے سے کامیابی اور عروج حاصل کریں ، یہ لوگ علماء کو آثار قدیمہ سے زیادہ مرتبہ دینے کو تیار نہ تھے ، جنھیں یادگار کے طور پر محفوظ تو رکھا جا سکتا ہے ، مگر ان سے کوئی کام نہیں لیا جا سکتا ۔

علماء دیوبند کا عقیدہ یہ تھا کہ ذلت وپستی کا علاج یہ نہیں ہے کہ طاقت کی پیروی کی جائے ، بلکہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے دینی علوم ، شرعی اعمال ، عقائد اور اخلاق وروحانیت میں پختگی حاصل کریں ، اپنے ظاہر وباطن کو شریعت کے مطابق رکھیں ، خواہ بظاہر اس میں دنیا کی ذلت محسوس ہو ، مگر اس سے حق تعالیٰ کی رضا ومحبت حاصل ہوگی ، پھر اس نے چاہا تو دنیا میں بھی عزت حاصل ہوگی ۔

اہل ندوہ نے ان دونوں نظریوں کو جمع کرنا چاہا ۔ یہ انگریزوں اور انگریزی تہذیب سے فی الجملہ متاثر تھے ، ان لوگوں کے نزدیک علوم اسلامیہ کے ساتھ مغربی علوم وفنون کی بھی بڑی اہمیت تھی ، وہ غالباً یہ سوچتے تھے کہ یہ فاتح قوم اگر اسلام اور اسلامی علوم کے حق میں مطمئن ہوجائے اور اس کے اشکالات واعتراضات دور

ہوجائیں تو ایک صالح انقلاب دنیا میں آجائے، اس وقت یورپ سے گوناگوں علوم وفنون اپنی سحر طرازیوں کے ساتھ سیلاب کی طرح امنڈ رہے تھے اور نگاہیں ان سے خیرہ ہورہی تھیں، حال یہ ہوگیا تھا کہ جس علم وفن پر یورپ کی مہر لگی ہوئی نہ ہوتی وہ قطعاً قابل قبول نہ ہوتا، اور خواہ کیسا ہی گھٹیا فن ہو اور کتنی ہی غلط بات ہو اگر یورپ کی مہر تحسین وتصدیق اس پر ثبت ہے تو وہ بالکل قابل قبول، درست اور مستحسن تھی، یہ لوگ بھی اس بلائے عظیم سے کسی نہ کسی درجے میں متاثر تھے، ان کا خیال تھا کہ علماء عصر حاضر کے تقاضوں سے بے خبر ہیں، علوم جدیدہ سے ناواقف ہیں، قدیم علوم کے حصار میں بند ہیں، یورپ سے ہر روز نت نئے اعتراضات اسلام کے خلاف تیر کی طرح برستے چلے آرہے ہیں، لیکن علماء کو ان اعتراضات کی خبر ہی نہیں، تو جواب کیا دیں گے۔ نئی نسل انگریزی علوم کی طرف مائل ہوتی چلی جارہی ہے، اس کے دل ودماغ میں یہ اعتراضات راسخ ہوتے چلے جارہے ہیں، انھیں مطمئن کرنے کی علماء میں صلاحیت نہیں ہے، اس لئے ایسے باصلاحیت اصحاب علم ہونے چاہئیں، جو دینی علوم کے ساتھ جدید علوم سے بھی ماہرانہ واقفیت رکھتے ہوں، عربی زبان کے ساتھ انگریزی زبان پر بھی عبور رکھتے ہوں، وہ چاہتے تھے کہ اسلامی علوم میں رسوخ کے ساتھ حکمراں جماعت کے بھی علوم وفنون اور زبان سے علماء آراستہ ہوں، اس طرح وہ برابری کا رتبہ حاصل کرسکیں گے اور اسے اپنے دین ومذہب کے حق میں مطمئن کرسکیں گے نیز اس کی نگاہ میں جو ذلت مسلمانوں اور اسلام کی ہورہی ہے وہ بھی ختم ہوجائے گی۔

انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی حصوں میں پورا مسلم معاشرہ ان تین بڑے کیمپوں میں تقسیم تھا، اور بھی کچھ چھوٹے چھوٹے کیمپ تھے، مگر زیادہ اہم یہی تینوں تھے یہ سب اسلام اور مسلمانوں کی خیرخواہی کے نام پر متفق تھے، آپس میں اشتراک عمل کی صورتیں بھی نکلتی رہتی تھیں تاہم نظریہ اور طریقۂ کار کے اختلاف کی وجہ سے کچھ آویزشیں بھی تھیں، غلط فہمیاں بھی تھیں، ایک دوسرے پر گاہے

گاہے طنز وتعریض کرتے رہتے تھے، لیکن مجموعی اعتبار سے نیک نیت لوگ تھے، قرآن وسنت کو سب تسلیم کرتے تھے مگر ان کے استعمال اور فہم کا طریقہ الگ الگ تھا، لیکن واقعہ یہ بھی ہے کہ طنز وتعریض بلکہ تجہیل وتحمیق کا نشانہ جس قدر وہ علماء بنے جنھوں نے اسلاف کی روایات کو سینے سے لگائے رکھنا چاہا انھیں جس قدر زمانے سے بے خبر بتایا گیا، انھیں جتنا ناقابل اعتناء اور خارج از بحث قرار دیا گیا اس درجہ کسی اور کو نہیں کہا اور سنایا گیا، انھیں غیر بھی کوستے تھے اور وہ لوگ بھی صلواتیں سنانے سے نہ چوکتے تھے جو تھے تو زمرۂ علماء میں مگر روشن خیال سمجھے جاتے تھے، اس دور میں جو مضامین علم اور تعلیم کے موضوعات پر لکھے گئے ان میں اس کی مثالیں بکثرت ملیں گی۔

اس مضمون میں ہم اس کا جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند جو دینی علوم کا مرکز بنایا گیا، اس نے کس معیار کے علماء تیار کرنے کا ارادہ کیا تھا؟ اور کیا اس معیار کے علماء دین وملت کیلئے ضروری اور مفید تھے، یا قوم پر بوجھ اور بے وقعت قسم کے لوگ تیار ہو رہے تھے اور کیا ان پر اعتراضات کی انگلیاں صحیح اٹھ رہی تھیں یا اس میں کچھ قصور انگلیاں اٹھانے والوں کا بھی تھا۔

اس سلسلے میں گذارش ہے کہ دنیا میں جہاں بھی مسلمانوں کی حکومت تھی یا اب ہے، اگر وہاں کے حکمراں مذہب سے کلیۃً آزاد نہیں ہوگئے ہیں تو اس جگہ اسلامی شریعت کامل طور پر نافذ ہو یا نہ ہو، لیکن مملکت کا مذہب اسلام ہی ہوتا ہے، حکومت اسلامی علوم وفنون اور اسلامی شعائر کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھتی ہے اور اس کیلئے باصلاحیت علماء کے وجود کو ضروری سمجھتی ہے، جو اسلامی علوم اور اسلامی اعمال واخلاق کو بالکل صحیح شکل میں باقی رکھیں، ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی حکومت خواہ جیسی بھی رہی ہو مگر اسلام اس کا مذہب تھا، اس نے اسلامی علوم واعمال کی اپنی استعداد کے بقدر سرپرستی کی، علماء ومشائخ کو کام کرنے کے مواقع بہم پہونچائے، حکومت ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتی رہی، جب تک ان کا حکومت سے کوئی سیاسی ٹکراؤ نہ ہوتا وہ اس کے ظلِ

عاطفت میں اپنے فرائض مذہبی انجام دیتے رہتے، لیکن جب یہ حکومت ختم ہوگئی اور بدنہاد انگریزوں کی حکومت ہندوستان میں قائم ہوگئی تو اب مذہبی علوم واعمال، شرعی قوانین واحکام اور اسلامی معاشرہ کے تحفظ وبقا کا مسئلہ اہم بن گیا، حکومت کے دریا کا بہاؤ بالکل سمت مخالف میں تھا، اگر اس کے رحم وکرم پر مذہب کو چھوڑ دیا جاتا تو وہ کب کا ختم ہو چکا ہوتا، اس وقت غیرت مند علماء کی ایک تعداد موجود تھی، اگر پہلے سے کچھ غفلت تھی تو اسے سید احمد شہید اور مولانا اسمٰعیل شہید کی تحریک نے جھنجھوڑ دیا تھا، ان غیور وصاحب ایمان علماء ومشائخ کو انگریزوں سے دوہری تکلیف تھی، اول یہ کہ انھوں نے مسلمانوں کی حکومت غصب کی، اسے برباد کیا، مسلمانوں کو ذلیل وخوار کیا، دوسرے یہ کہ ان کے عزائم سے پتہ چلتا تھا کہ وہ دین اسلام کا بالکلیہ استیصال کردینا چاہتے ہیں، ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف صدیوں سے عداوت سلگ رہی تھی، اور ہندوستان میں حکومت حاصل کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مسلمان ہی تھے، انھیں سے جگہ جگہ مقابلہ ہوا تھا اسلئے ان کا ارادہ بہر حال یہ تھا کہ ہندوستان سے اسلام اور مسلمانوں کی جڑ اکھاڑ دینی ہے، اس صورت حال میں ان علماء کو کیسے گوارا ہوتا کہ اپنے دشمنوں، ظالموں، غاصبوں کی اہمیت تسلیم کرکے ان کے علوم وفنون کو خود حاصل کرتے اور اپنے بچوں کو ان کی گود میں دیدیتے، کیا یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ ایک شخص ہمارے گھر میں آگ لگا رہا ہو اور ہماری تمام تر پونجی کو نذرِ آتش کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اور ہم اس کی خوشامد کریں، اس کے گھر کی ٹھیکریاں چنیں، انھیں سینے سے لگائیں، علماء یہ محسوس کررہے تھے کہ یہ طوفان بلاء پوری امت مسلمہ کو اس کے قیمتی ورثہ سے محروم کردے گا پھر مسلمان نہ مسلمان رہے گا اور نہ کافر، نام کے اعتبار سے مسلمان رہے گا اور حقیقت کے لحاظ سے اس میں اسلام کا نام ونشان نہ رہے گا۔

پھر ۱۸۵۷ء کی تاریخ شاہد ہے کہ انگریزوں نے چن چن کر بے شمار علماء کو قتل کیا، پھانسیوں پر چڑھایا، کالے پانی بھیجا، جن بزرگوں کو موقع ملا، یہاں کے رست خیز

کو دیکھ کر اپنے ایمان کی حفاظت کیلئے انھوں نے حجاز کی طرف ہجرت کی راہ اختیار کی اور جو لوگ بچ رہے تھے ان کے سامنے کوئی راستہ نہ تھا کہ اسلام کی حفاظت کرتے ، لڑائی اور جہاد کا موقع باقی نہ رہا تھا، حکومت کی سرپرستی ختم ہو چکی تھی، علماء کا صفایا کر دیا گیا تھا، دور دور تک علاقے علماء سے خالی تھے، جن ارباب فضل وکمال کی ڈیوڑھیاں درسگاہ علوم بنی ہوئی تھیں اب وہاں خاک اُڑ رہی تھی، اگر کچھ علماء باقی رہ گئے تھے تو وہ یا تو چھپ چھپا کر رہتے تھے اور ان کے سر پر ہر وقت خطرے کی تلوار لٹکتی تھی ، یا پھر وہ لوگ تھے جنھوں نے جنگ کے دوران انگریزوں کی وفاداری کی تھی، ان کا ساتھ دیا تھا، ان کیلئے مخبری کی تھی ، یہ لوگ اپنے کارناموں کے صلے میں جائدادیں حاصل کر کے آزادی اور راحت کا سانس لے رہے تھے مگر ان لوگوں سے کیا توقع ہو سکتی تھی کہ وہ دین ومذہب اور قوم وملت کی صحیح خدمت کریں گے، ایسی حالت میں کوئی بتائے کہ کس طرح کے علماء کی ضرورت تھی؟

اس دور میں ایسے علماء کی ضرورت تھی جو اللہ ورسول کے نام پر اپنی جان ومال اور عزت وناموس کو قربان کر دینے کا سچا جذبہ رکھتے ہوں، جنھیں دینی علوم میں اس درجہ رسوخ ہو کہ دین ومذہب کی ہر ضرورت کی تکمیل اپنے علم کی بدولت کر سکتے ہوں ، جو حکومت کے دباؤ سے آزاد ہوں ، ایسے بااخلاق اور صاحب نفس زکیہ ہوں کہ ان سے دین وایمان اور اخلاقِ فاضلہ سیکھے جاسکتے ہوں اور خود بھی دینی جذبہ سے سرشار ہو کر لوگوں کی اخلاقی اور باطنی تربیت کر سکتے ہوں، ایسے مجاہد ہوں جو ظالم وغاصب حکومت سے ٹکر لے سکیں اور اس کی جڑوں کو کمزور کر سکیں، ان میں محدث وفقیہ بھی ہوں، ان میں مناظر ومبلغ بھی ہوں، ان میں مصنف وخطیب بھی ہوں، ان میں ایسے مخلص وبے نفس بھی ہوں کہ کسی دیہات ، کسی گاؤں میں بے تکلف بیٹھ کر مسلمانوں کی خدمت بجا لاسکیں، ان میں ایسے متقی اور متدین لوگ بھی ہوں جن کے اوپر عامۃ المسلمین کو اعتماد ہو، تاکہ جہاں جس طرح کے آدمی کی ضرورت ہو وہ ضرورت پوری کی جاسکے۔

اسی طرح کے بلند مقاصد کو سامنے رکھ کر دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی گئی، یہ صرف تعلیم وتدریس کا ایک ادارہ نہیں ہے جہاں استاذ نے کتاب پڑھادی اور طالب علم نے کتاب پڑھ لی اور بس، یہاں درحقیقت اسلام کے شیروں کی پرورش ہوتی تھی، یہاں کی فضاؤں میں ایسے مردمومن نشوونما پاتے تھے جن کی نگاہوں سے تقدیریں بدل جایا کرتی ہیں، سوانح قاسمی میں مولانا مناظر احسن گیلانی نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کا ایک ارشاد نقل کیا ہے، شیخ الہند، دارالعلوم کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے براہ راست شاگرد اور ان کے خصوصی تربیت یافتہ ہیں، وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

> ”حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو کیا درس وتدریس، تعلیم وتعلم کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں ۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے، تاکہ ۵۷ء کی تلافی کی جائے، ج:۲ص:۲۲۶“

حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کے اس اجمالی ارشاد میں وہ تمام تفصیلات پنہاں ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا، ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑا نصب العین تھا جس کیلئے افرادِ کار کے ساتھ بڑے سرمایہ اور منصوبہ بند پلان کی ضرورت تھی مگر یہ سب کچھ اللہ کے بھروسے پر کیا گیا، اور غریب مسلمانوں سے تحصیل چندہ کی طرح ڈالی گئی تاکہ انھیں اس مرکز اور اس کے واسطے سے دین سے مربوط کیا جاسکے، اس میں نہ کبھی کسی حکومت سے مدد چاہی گئی، نہ کسی نواب رئیس پر اعتماد کیا گیا۔

بتایا جائے کہ دین ومذہب کے تحفظ وبقا کے لئے یہ باتیں اہم تھیں یا نہیں؟ کیا ان کے ضروری ہونے میں کسی کو کلام ہوسکتا ہے، اگر ایسا نہ کیا گیا ہوتا تو ہر شخص اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائے کہ پھر انگریزوں کے سیلاب بلا کے مقابلے میں سینہ سپر ہوکر اسلام اور مسلمانوں کے دینی علوم اور اعمال کی بقا کے لئے اور کیا راستہ ہوسکتا تھا، اب تو

یہ کہہ دینا آسان ہے کہ علماء حالات حاضرہ سے بے خبر ہیں، علوم جدیدہ سے ناواقف ہیں، یورپ سے آئے ہوئے اعتراضات کے جواب نہیں دے سکتے لیکن جس وقت یہ حضرات سینہ سپر ہو کر کھڑے تھے کیا کسی طرح عقل و ہوش رکھتے ہوئے باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ حالات سے بے خبر تھے، اگر یہ بے خبر ہوتے تو کشتی ڈوب چکی ہوتی، اندلس کا نقشہ سرزمین ہند پر قائم ہو جاتا، نہ علی گڈھ کا وجود اس حالت میں ہوتا، نہ ندوہ کا جس حالت میں اب وہ باقی ہے، نام کے مسلمان بھی ختم کئے جا چکے ہوتے۔

فرض کیجئے کہ یہ حضرات بھی علوم جدیدہ کی تحصیل میں لگ جاتے، تو سوچئے تو سہی کس سے سیکھتے، استاذ یہی انگریز تو ہوتے جنھوں نے ان کے دین و مذہب کی گردن پر تلوار رکھ رکھی تھی، اول تو یہ کہ ان کی غیرت کے خلاف تھا، اور اگر اپنی غیرت کا گلا گھونٹ کر سیکھتے تو ظاہر ہے کہ ہمیشہ کے لئے ان کی استاذی کا قلادہ ان کی گردن میں ہوتا، اور ہمیشہ کے واسطے ان کا ممنون کرم ہونا پڑتا، ان حضرات کو یہ فن نہیں آتا تھا کہ اپنے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کریں انھیں کی شان میں شوخ چشمی اور گستاخی کو فخر وکمال سمجھیں، اس کے بعد ان کی مرعوبیت کا بھی وہی عالم ہوتا جو عام طور سے انگریزی خواں طبقہ میں دیکھا جاتا ہے اور جب کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ ہوتا تو دو ایک نسل کے بعد دلوں سے اسلام ہی نکل جاتا، پھر کیا ان سے دین کی حفاظت کا کام ہوتا، یہ علوم جدیدہ سے انھیں بے خبر علماء کی صحبتوں، ان کے مواعظ ان کی تصانیف کا اثر ہے کہ جو لوگ انگریزیت میں کودے تھے اور اس میں لت پت ہو گئے تھے ان بزرگوں کی برکت سے اس سے صاف ستھرے ہو کر نکل آئے اور اس کے بعد ان میں یہ صلاحیت پیدا ہوئی کہ انگریزوں کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کے جواب دے سکیں، ورنہ کیا انگریزی داں طبقہ جواب دینے کی ہمت کر سکتا تھا اور اگر ہمت بھی کرتا تو سرسید مرحوم کی طرح معذرت یا تحریف سے کام لیتا اور بجائے اس کے کہ اسلام کی ترجمانی ہوتی، اس کی صورت ہی مسخ ہو کر رہ جاتی، سچ پوچھئے تو ان حضرات نے بہت تدبر اور ہوش مندی کا

ثبوت دیا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ توفیق الٰہی ان کی دستگیر ہوئی کہ ان حضرات نے علوم جدیدہ کی جانب رُخ نہیں کیا ورنہ جن لوگوں نے اس کی طرف رُخ کیا، جو حشر ان کا ہوا وہی ان کا بھی ہوتا۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ **دارالعلوم دیوبند** کے نصاب میں علوم جدیدہ کا شمول کیوں نہیں ہوا؟ اس سوال کا جواب دارالعلوم کے بانی مکرم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی علیہ الرحمہ کی زبان سے سن لیا جائے، اس سے اندازہ ہوگا کہ زمانہ کے مقتضیات سے یہ لوگ کس قدر باخبر تھے، اور جو کچھ کرتے تھے نہایت غور و تدبر کے بعد کرتے تھے، ۱۹/ ذیقعدہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۹/ جنوری ۱۸۷۴ء میں دارالعلوم کے فارغ طلبہ کو سند اور انعام دینے کے لئے ایک جلسہ منعقد ہوا تھا، اس میں حضرت نانوتویؒ نے تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ:

> ”اب ہم اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے کہ درباب تحصیل یہ طریقہ خاص کیوں تجویز کیا گیا، اور علوم جدیدہ کو کیوں نہیں شامل کیا گیا، منجملہ دیگر اسباب کے بڑا سبب اس بات کا تو یہ ہے کہ تربیت عام ہو یا خاص، اس پہلو کا لحاظ چاہئے، جس طرف ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو، سو اہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علوم قدیمہ کو سلاطین زمانۂ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی، ہاں علوم نقلیہ (یعنی خالص دینی و اسلامی علوم) کا یہ تنزل ہوا کہ ایسا تنزل کبھی کسی کارخانہ میں نہ ہوا ہوگا، ایسے وقت میں رعایا کو مدارس علوم جدیدہ کا بنانا تحصیل حاصل نظر آیا، صرف بجانب علوم نقلی (یعنی خالص دینی و اسلامی علوم) اور نیز ان علوم کی طرف جن سے استعداد علوم مروجہ اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے (انعطاف) ضروری سمجھا گیا“
>
> (سوانح قاسمی ص: ۲۷۷، ج: ۲)

یہاں قدرتاً یہ سوال ذہنوں میں پیدا ہو سکتا تھا کہ ان نقلی علوم کے ساتھ جہاں

بعض علوم عقلیہ منطق وفلسفہ کی گنجائش نکالی گئی وہیں علوم جدیدہ کو بھی کیوں نہیں شامل کیا گیا، اس کا جواب دیتے ہوئے حضرت نانوتویؒ نے ارشاد فرمایا کہ:

> ”زمانۂ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعث نقصان استعداد رہتی ہے،“ سوانح قاسمی ص:۲۸۳ ج:۲

مطلب یہ ہے کہ جن علوم عقلیہ کی گنجائش دارالعلوم کے نصاب میں نکالی گئی ہے، وہ تو علوم نقلیہ کے خادم اور معاون کی حیثیت سے ہیں، ان سے ذہنی ورزش ہوتی ہے اور علمی استعداد بڑھتی ہے لیکن علوم جدیدہ جن کی ایک الگ حیثیت ہے ان کو درس میں شامل کرنے کا مطلب یہ ہوتا کہ نہ دینی علوم میں رسوخ پیدا ہوتا اور نہ علوم جدیدہ میں ہی کوئی قابل ذکر قابلیت پیدا ہوتی، کیونکہ ان دونوں کا سمت سفر الگ الگ ہے، پھر بقول مولانا مناظر احسن گیلانیؒ یہ ہوتا کہ:

> ”استاذوں کے ایک حلقہ میں جن علوم ومسائل کی قدر وقیمت طلبہ پر واضح کی جاتی، معاً دوسرے حلقے میں پہونچنے کے ساتھ ہی ان کے وقار ووزن سے طلبہ کو خالی الذہن کرنے کی کوشش ہوتی، اثبات ونفی کے اس قصے میں اگر ہر دو کی نفی ہوتی رہے، تو ان دو متخالف طریقۂ تعلیم کا خود ہی سوچئے (نقصان استعداد کے علاوہ) دوسرا انجام ہی کیا ہوسکتا ہے۔“ (سوانح قاسمی ص:۲۸۴ ج:۲، بتصرف)

اس کے علاوہ یہ بھی خطرہ تھا کہ، اور اب یہ خطرہ واقعہ بن کر سامنے آچکا ہے کہ علوم دینیہ میں چونکہ معاش کی ضمانت نہیں ہے، بلکہ اسے تحصیل معاش کے ذریعے کے طور پر استعمال کرنا مذموم قرار دیا گیا ہے، اس کے برخلاف انگریزی علوم کسی نہ کسی درجے میں معاش کی ضمانت دیتے ہیں یا اس کی توقع پیدا کرتے ہیں اس لئے طالب علم کی زیادہ توجہ ان معاشی علوم ہی کی جانب ہوجاتی ہے اور وہ دینی علوم اور اس کے آثار وعلائم سے برکنار ہوجاتا ہے، مولانا گیلانیؒ فرماتے ہیں کہ:

> ”جدید علوم والسنہ کو چونکہ حکومت کی سرپرستی وپشت پناہی حاصل تھی، اس کی وجہ سے یہ

> بھی دیکھا گیا کہ اسلامی و دینی علوم کے جن آثار کی توقع پڑھنے والوں سے کی جاتی ہے بجائے ان کے اکثریت میں وہی رنگ غالب آجاتا ہے جو رنگ خالص مغربی علوم وفنون کی تعلیم پانے والوں کی خصوصیت ہے، رنگ ڈھنگ، وضع قطع، طریقۂ فکر و بیان سب ہی میں پایا گیا کہ وہ مغربی علوم کے طلبہ کے طفیلی بنے ہوئے ہیں، ''**الناس علیٰ دین ملوکھم** ''بات تو پرانی ہے لیکن ہر نئے زمانے میں اس پرانی بات کا تجربہ کیا گیا ہے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق مہتمم دارالعلوم سے دارالعلوم کے نصاب سے متعلق ایک دن اسی سلسلہ میں گفتگو ہوئی ،تو پہلی دفعہ اسی ''پیر دانا'' نے نوجوانی کے زمانہ میں فقیر کو سمجھایا تھا کہ توازن باقی رکھنا دشوار ہو جائے گا، طلبہ پر عموماً انگریزیت غالب آجائے گی، دین کی ٹوٹی پھوٹی خدمت دارالعلوم کے طلبہ سے اس وقت جو بن آتی ہے تم دیکھو گے کہ اس سے بھی وہ محروم ہو جائیں گے، وقت جیسے جیسے گذرتا چلا گیا، مشاہدہ سے تجربہ کاروں کے خیال کی تائید ہوتی چلی جارہی ہے۔'' سوانح قاسمی ۲۸۳، ص:۲

کہنے اور لکھنے والوں نے جب یہ بات کہی اور لکھی تھی آج بھی وہی نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، جن مدارس نے انگریزی زبان اور اس کے علوم کو اہمیت دی ہے وہاں عموماً دیکھا جاتا ہے کہ طلبہ ان مدارس سے چھلانگ لگا کر انگریزی جامعات میں جا کودتے ہیں، ہر سال کھیپ کی کھیپ ان مدارس سے نکل کر دنیاداری کے ان چہ بچوں میں جا گرتی ہے اور جو باقی رہ جاتے ہیں، ان میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ بجائے دین کو نصب العین بنانے کے زیادہ تر کوشش دنیا ہی کی ہوتی ہے خود اگر بقدر خواہش دنیا حاصل کرنے کا موقع نہیں مل پاتا تو اپنی اولاد کو ادھر جھونک دیتے ہیں یہ ایسے مشاہدات ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مذکورہ بالا تفصیلات اور حضرت نانوتویؒ کی اس تقریر سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ دارالعلوم کے قیام کا نصب العین کیا تھا؟ اور وہ کس معیار کے علماء تیار کرنا چاہتا تھا

اب دیکھنا چاہئے کہ وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ دارالعلوم کو خدمت دین کرتے ہوئے سوا سو سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا ہے اور اس کے ذریعہ دین کی اتنی خدمات علم وفن اور زندگی کی مختلف شعبوں میں نمایاں ہوچکی ہیں اور ایسے ایسے اساطین علم وفضل، بلند پایہ محدثین وفقہاء، مخلص صوفیہ ومشائخ، بہترین مناظر ومبلغ اور کامیاب مصنف واہل قلم اتنی بڑی تعداد میں تیار ہوچکے ہیں اور عظیم کارنامے انجام دے چکے ہیں، اور اب تک دیتے چلے جارہے ہیں کہ کوئی آنکھ والا ان کے دیکھنے سے انکار نہیں کرسکتا، یہ دارالعلوم اور ان کے ہمرنگ مدارس ہی کا فیض ہے کہ آج ہندوستان کے قریہ قریہ میں باوجود مخالفانہ طاقتوں کی تمامتر زور آزمائیوں کے نہ صرف اسلام زندہ ہے بلکہ اسلامی شعائر زندہ وتابندہ ہیں، علماء کی اتنی بڑی تعداد ہرطرف بکھری اور پھیلی ہوئی ہے کہ شاید کوئی خطہ ان سے خالی ہو، اور ان میں سے اکثر اپنی اپنی صلاحیت واستعداد کے مطابق خدمت دین انجام دے رہے ہیں، دینی خدمت کا کون سا میدان ایسا ہوگا جہاں علمائے دیوبند کی خدمات جلیلہ کے روشن نقوش نہ جگمگا رہے ہوں، اب تو جو لوگ اعتراض کی وادی میں گھوم رہے ہیں وہ درحقیقت زمانے سے اپنی بیخبری کا ثبوت پیش کررہے ہیں، ہاں جیسے زندگی کے ہر شعبے میں انحطاط نظر آرہا ہے، علماء ومدارس بھی اس کے شکار ہیں، ان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے، اور یہ کام بھی ہورہا ہے، جس پیمانے پر ہورہا ہے وہ ناکافی محسوس کیا جاتا ہے تاہم اس وقت دین اور دینی علوم کا جو چرچا ہے وہ انھیں مدارس اور انھیں علماء کی برکت ہے جو دارالعلوم دیوبند کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے ہیں۔

ضرورت تو نہیں تھی لیکن جی چاہتا ہے کہ چند شہادتیں بھی اس سلسلے میں پیش کردی جائیں، یہ شہادتیں سید محبوب رضوی کی کتاب ''تاریخ دیوبند'' سے اخذ کی گئی ہیں، لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ لاہور کے مشہور روزنامہ سیاست نے لکھا تھا کہ:

> ''جہاں تک تحفظ دین، تردید مخالفین اور اصلاح مسلمین کا تعلق ہے، دارالعلوم دیوبند

> کے غیر محدود مدرسین ومبلغین کا حصہ سارے ہندوستان سے بڑھ چڑھ کر ہے، مثال کے طور پر ان غیر محدود کوششوں کو ملاحظہ کرلیا جائے جو آریہ سماج نے اسلام کے خلاف کیں، تو آپ کو روزِ روشن کی طرح نظر آئے گا کہ ان مساعی کے مقابلہ میں سب سے نمایاں طریق پر جو سینہ سپر ہوا وہ مدرسہ عالیہ دیوبند ہی ہے اور دعویٰ سے کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں دین حنیف، علوم عربیہ، تفسیر وحدیث اور فقہ کے چرچے بعونہٖ تعالیٰ بہت حد تک دیوبند کے وجود مسعود کی وجہ سے قائم ہیں۔''

(سیاست لاہور، ۲۷/جون ۱۹۲۳ء)

کلکتہ کے اخبار ''عصرِ جدید'' نے علمائے دیوبند کی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> ''دارالعلوم دیوبند اسلام کی جو مذہبی اور تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے، اور مغربی تہذیب وتمدن کے سیلاب سے جس طرح اس نے اسلامی ہند کی روحانی عمارت کو محفوظ رکھا ہے ہندوستان کے طویل وعریض براعظم کا ایک ایک گوشہ اس کی گواہی دے سکتا ہے، ایسے وقت میں جب کہ علوم جدیدہ کی روشنی نے ظاہر بیں نظروں کو خیرہ کردیا تھا جب کہ دنیوی عزت اور مناصب کی کشش اچھے اچھے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی جب کہ لوگ مذہب سے بے پروا اور مذہبی تعلیم سے غافل ہوچکے تھے اور **قال اللہ و قال الرسول** کی مقدس آواز نئی تعلیم کے نقار خانہ میں دب گئی تھی اور مغربی تعلیم وتمدن کے شور وغوغا سے مغلوب ہوچکی تھی، اس نازک وقت میں دیوبند اور صرف دیوبند تھا جو قرآن وحدیث کے علم کو سنبھالے ہوئے کھڑا رہا، ملک کی غفلتوں اور سرد مہریوں کی آندھی نے رہ رہ کر اس کو گرانا چاہا مگر وہ پہاڑ کی طرح قائم رہا، فاتح تہذیب کی خندہ زنی اس کو اپنی قدامت سے منحرف نہ کرسکی، نئی تعلیم کے سیلاب نے چاہا کہ اپنی رَو میں اسے بہالے جائے مگر کس مپرسی کے باوجود وہ ایک طرف اپنے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا، اور دوسری طرف اپنی روحانیت کی روشنی ملک کے ہر ہر گوشہ میں پہونچاتا

> رہا، یہاں تک کہ مسلسل جدوجہد کے بعد آج نہ صرف پشاور اور رنگون بلکہ قفقاز، موصل، بخارا اور اسلامی دنیا کے ہر حصہ سے فدائیانِ قرآن وحدیث آآ کر پروانہ وار اس کے گرد مجتمع ہیں۔“ (عصر جدید، ۱۳/۱اکتوبر ۱۹۳۶ء)

اب سے تقریباً اسّی سال پہلے ہندوستان کے ایک بڑے تاجر نے لکھا تھا کہ:

> ”میں دیکھتا ہوں کہ ہندوستان کے اکثر حصوں میں جہاں کہیں کسی درس گاہ، انجمن یا مدرسہ ومکتب میں کسی ذی استعداد عالم کی ضرورت ہوتی ہے، تو دارالعلوم دیوبند ہی سے بلایا جاتا ہے اور وہیں کے تعلیم یافتہ عالم اور مدرس یہ قابلیت رکھتے ہیں کہ ہر قسم کی کتابیں بخوبی پڑھا سکیں، کلکتہ، بمبئی، دہلی، کان پور، الہ آباد، بنارس، بریلی، آگرہ، میرٹھ، جس جگہ بھی آپ دیکھیں گے آپ کو دارلعلوم ہی کے فیض یافتہ مسند درس پر بیٹھے ہوئے ملیں گے۔“ (دارالعلوم دیوبند کی سیر اور اس کی مختصر تاریخ، مطبوعہ ۱۳۳۵ھ)

اگر ہم خدمات جلیلہ کے اس اجمال کو ان علماء کے اسماء گرامی اور ان کی سیرت وسوانح کی تفصیل میں دیکھنا چاہیں تو اس کے لئے ایک مستقل دفتر کی ضرورت ہے، دارلعلوم کے فضلاء میں اکثریت اصحاب درس علماء کی ہے جن میں ایک بڑی تعداد فن تدریس میں شہرت ومقبولیت کی حامل ہیں، یہ مبالغہ نہیں بلکہ واقعہ ہے کہ دارالعلوم میں جو نصاب درس اختیار کیا گیا اور اس کو جس انداز سے پڑھایا جاتا ہے، طالب علم اگر فطری استعداد وذہانت کا ضروری حصہ رکھتا ہو تو وہ بیشتر میدانوں میں کامل نکلتا ہے، یہ جامعیت کسی اور نصاب کو نصیب نہیں، استعداد علمی کا یہ حال سب اہل علم جانتے ہیں کہ جس نے دارالعلوم دیوبند کا نصاب سمجھ کر پڑھ لیا اسے کوئی بھی اور کہیں کا بھی دینی وعلمی نصاب دیدیا جائے وہ کامل اعتماد کے ساتھ اس کا درس دے گا اور طلبہ ان شاء اللہ مطمئن رہیں گے، اس کے برخلاف جدید اور جدید تر نصاب کے پڑھے ہوئے حضرات دارالعلوم کے نصاب میں چند قدم بھی شاید نہ چل سکیں۔

دارالعلوم دیوبند کے نصاب کے علاوہ دوسرے نصابوں کی پہونچ بس یہاں

تک ہے کہ کچھ انشاء پرداز، کچھ عربی بولنے والے، کچھ اردو کے ادیب پیدا کر دیئے اور بس! لوگوں نے نعرے تو بہت خوشنما لگائے، جدید ترین اور بہترین نصاب کا نعرہ، جدید طریقۂ تعلیم و تربیت کا نعرہ، قرآن فہمی اور ذوق فصاحت و بلاغت کا نعرہ، علوم جدیدہ حاصل کر کے یورپ میں تبلیغ کا نعرہ اور نہ جانے کتنے کتنے نعرے جن سے فضا گونج اٹھی، اقصائے ہند میں غُل مچ گیا، دیوبند کو کمتر گردانا گیا، مگر جب نتائج سامنے آئے تو اکثر نعرے ہوا ہو گئے، مایوسی، جھنجھلاہٹ اور شکایات کا طومار نعرہ لگانے والوں کے حصہ میں آیا اور جن طالب علموں کو علم و فضل کے بام ثریا تک پہونچانے کا وعدہ کیا گیا تھا، ان کا انجام یہ ہوا کہ عام طور سے ان میں دین سے دوری پیدا ہو گئی، طلب دنیا کا جذبہ کچھ زیادہ ہی ان میں دیکھا گیا کچھ مؤرخ و مصنف ہو گئے، بلاشبہ ان میں بعض نمونے کے انسان بھی بنے، بعض بڑی قد آور شخصیتیں تیار ہوئیں، جن سے دنیا کو بہت نفع پہونچا، لیکن یہ مستثنیٰ افراد و اشخاص تھے اور سچ پوچھئے تو ایسے حضرات کی تربیت و تشکیل سیرت میں اصحاب دیوبند کا اچھا خاصا دخل رہا ہے، مگر ایسے مدارس کے طلبہ و علماء کا عمومی حال کیا تھا، علامہ شبلی نعمانی اپنے ایک مکتوب میں تحریر کرتے ہیں، جو مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانیؒ کے نام لکھا گیا ہے کہ:

> ”اس میں شبہ نہیں کہ طلبہ میں تقدس کا اثر نہیں ہے، آپ نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ ایک دفعہ ندوہ کے لڑکے ڈیپوٹیشن کے ٹور پر بھیکن پور (مولانا شیروانی کا وطن) بھی گئے تھے، ان کی وضع سے آپ نے سمجھا کہ علی گڈھ کے لڑکے ہیں، یہ میری موجودگی سے قبل کا زمانہ ہے، اس کی وجہ میں نے بہت سوچا، اس کے سوا کوئی نہیں کہ ابتداء سے آج تک کوئی پرنسپل مقدس اور بااثر نہیں ملا، ایک زمانہ میں مولوی فاروق صاحب مرحوم تھے وہ خود بے پروا تھے، مولوی..........صاحب خود پابند تھے، لیکن اثر کچھ نہ تھا خود ان کا لڑکا..........ڈاڑھی ترشواتا تھا، اور وہ کچھ نہ کہتے تھے، اس کے نمازِ فجر نہ پڑھنے کی شکایت میں نے ان سے کی تو فرمایا کہ رات کو مطالعہ زیادہ دیکھتا ہے اس لئے

> صبح سو جاتا ہے، میں اول جب حیدر آباد سے آیا تو دیکھا کہ دار الاخبار (ریڈنگ روم) میں طلبہ نے نواب محسن الملک وغیرہ کی تصویریں لگا رکھی ہیں، نماز نہ پڑھنے پر گوشت کا پیالہ بند کیا جاتا تھا، لیکن ہر روز دس پانچ بند رہے، اس کی تدبیر صرف یہ ہے کہ کوئی مقدس بزرگ ہاتھ آئیں۔‘‘ (مکاتیب شبلی ص:۱۸۵، ج:۱)

آپ اندازہ کیجئے جس ادارہ کا ابتدائی حال یہ ہو اس سے کس قسم کی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں، مقدس بزرگ تو دیوبند میں ملا کرتے تھے مگر وہاں سے ہمارے روشن خیال علماء کو ایک طرح کی جیسے ضد تھی، علامہ شبلی ہی ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ’’دار العلوم (ندوہ) کی کل میں نہایت ذلیل پُرزے لگائے گئے ہیں، کیا قوم کو اس قدر امیدیں دلا کر دیوبند وغیرہ سے بھی گھٹیا مال دینا چاہئے۔‘‘ (ص:۱۱۴، ج:۱)

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں:

> ’’ہم خدا کو کیا جواب دیں گے، کیا ندوہ کا یہی دعویٰ تھا کہ دیوبند کی فرسودہ عمارت کو ہم کعبہ بنائیں گے۔‘‘ (ص:۱۴۹، ج:۱)

اور فرماتے ہیں کہ:

> ’’میں پوچھتا ہوں کہ آخر جب ندوہ بھی دیوبند ہے تو قوم کا روپیہ کیوں تباہ کیا جاتا ہے۔‘‘ (ص:۱۵۱، ج:۱)

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں دیوبند کی کس قدر تحقیر دل میں جاگزیں ہے، گویا دیوبند سرزمین ہند پر ایک جرم ہے، گناہ ہے، ایک فرسودہ عمارت، گھٹیا مال تیار کرتا ہے، قوم کا روپیہ اس پر تباہ ہوتا ہے، لیکن اس کے بعد بھی مقدسین کی تلاش ہے جن کا طلبہ پر اثر ہو۔ علامہ شبلی بمبئی تشریف لے گئے، انھیں ندوہ کے لئے زمین ہموار کرنی ہے، اس کیلئے غالباً مال فراہم کرنا ہے، لیکن اس میں دشواری محسوس کر رہے ہیں، انھیں اس جنس کی ضرورت ہے جو علماء دیوبند میں اور قدیم نصاب تعلیم کے فاضلین میں تو بکثرت مل سکتی ہے، مگر جس نصاب تعلیم کو رائج کرنے کی وہ کوشش فرما رہے ہیں اس میں وہ جنس عنقا

ہے، اس کی ضرورت ہے مگر دیکھئے کہ اس کا تذکرہ کس انداز میں کر رہے ہیں، لکھتے ہیں:

> ’’ندوہ کیلئے یہاں مولویوں کا جادو درکار ہے، کسی مشہور واعظ کو بلوانا پڑے گا۔‘‘

وعظ کی ضرورت ہے مگر مولویوں اور واعظ کے لئے کیا لہجہ اختیار کیا گیا ہے تحریکات کا آغاز اکثر غنیمت ہوتا ہے بعد والے اسی کو نمونہ بناتے ہیں، نئے طرز تعلیم اور نئے مدرسوں کی ابتداء ہی اس رنگ میں نظر آ رہی ہے تو اس سے کیا خیر کی توقع کی جاسکتی ہے۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

> ’’ندوہ کا دعویٰ تھا کہ قدیم وجدید یا بالفاظِ دیگر دیوبند اور علی گڈھ کا مجموعہ ہوگا، لیکن جس طرح آدھا تیتر آدھا بٹیر نہ اچھا تیتر ہوتا نہ اچھا بٹیر، ندوہ میں نہ علی گڈھ کی پوری خوبیاں آئیں نہ دیوبند کی، فی الواقع ندوہ نے علی گڈھ اور دیوبند کی خوبیاں صحیح طور پر اخذ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی، جب ندوہ کی بنیادیں ذرا گہری ہوئیں، اس نے اپنے آپ کو دوسرے اداروں کے مقابلے میں حریفانہ حیثیت سے پیش کیا............ اربابِ ندوہ کا دعویٰ تھا کہ وہ قوم کے دونوں بڑے تعلیمی اداروں سے اشتراک عمل کریں گے، لیکن ندوہ میں دونوں کی مخالفت ہوتی رہی، علی گڈھ کی نسبت جو کچھ مولانا شبلی ندوہ آ جانے کے بعد کہتے رہے اس کا ذکر آگے آئے گا، دیوبند کی نسبت بھی ان کا طرز اسی طرح حقارت آمیز اور استہزاء سے بھرا ہوا ہے۔‘‘ (مثال اوپر گزر چکی ہے)

پھر لکھتے ہیں کہ:

> ’’واقعہ یہ ہے کہ مولانا شبلی نہ صرف کالج والوں سے ناراض تھے بلکہ وہ طبقۂ علماء کی نسبت بھی بڑی بری رائے رکھتے تھے، ان کے دلی خیالات اس زمانے کے ایک خط میں جب وہ ندوہ سے علیٰحدہ ہوئے تھے، ٹپک پڑے ہیں۔‘‘ ’’میرا نصب العین ایک مذہبی عام انجمن ہے، ندوہ ہوسکتا تھا، وہ مولویوں میں پھنس گیا، اور یہ فرقہ کبھی وسیع الخیال اور بلند ہمت نہیں ہوسکتا‘‘

عجیب بات ہے کہ جس فرقہ کی بلند ہمتی کی بنیاد پر دین اسلام کا فلک بوس قصر اب بھی قائم ہے، اسی کے بارے میں کس تیقن کے ساتھ فیصلہ فرمارہے ہیں کہ یہ کبھی بلند ہمت نہیں ہوسکتا،

شیخ محمد اکرام اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:

> ”ندوہ کا علی گڈھ اور دیوبند کی نسبت اس قدر حقارت سے بھرا ہوا طرزِ خیال تھا تو چنداں جائے حیرت نہیں کہ ندوہ میں نہ جدید کی مادیت آئی اور نہ قدیم کی روحانیت، اوراس کا علمی معیار روز بروز تنزل کرتا گیا۔“

پھر یہ لکھتے ہوئے کہ علمی تصنیف وتالیف کی بعض منزلوں میں ندوہ کو اب بھی دیوبند پر چشم نمائی کا حق حاصل ہے اور وقت کا تقاضا بھی اسی سمت اشارہ کرتا ہے جدھر ندوہ قوم کو لے جانا چاہتا تھا، آگے تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ”لیکن کیا وجہ تھی کہ علم وروحانیت کا وہ پودا جسے بعض اللہ والوں نے دہلی سے ستّر میل دور ایک قصبے میں لگایا تھا پھولتا پھلتا رہا اور لکھنوی ندوۃ العلوم کا تناور درخت چند دن کی بہار دکھانے کے بعد زمین پر آگیا۔ اے عقل چہ می گوئی، اے عشق چہ می فرمائی۔“
>
> (موج کوثر ص:۱۹۲)

مولانا شبلی ندوہ سے مایوس ہوکر مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کی طرف متوجہ ہوئے اوراس کو آریہ سماجیوں کے گروکل کے طرز کا مدرسہ بنانا چاہا، وہ لکھتے ہیں:

> ”اس کو گروکل (۱) کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہئے، یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح نظر ہو۔“ (مکاتیب شبلی ص:۳۳، ج:۲)

---

(۱) آریہ سماج والوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت کیلئے سنسکرت زبان کو ذریعہ تعلیم بناکر گروکل کے نام سے مدارس قائم کئے تھے، علامہ شبلی فرماتے ہیں کہ ”آریہ گروکل قائم کررہے ہیں جو سنسکرت کی تعلیم کیلئے مخصوص ہے اور جس کا مقصد صرف اپنے مذاہب اور لٹریچر کی اشاعت ہے، اس گروکل میں جو لڑکے داخل ہوتے ہیں ان سے عہد لیا جاتا ہے کہ دنیا کا کوئی کام نہیں کریں گے، ۲۴ر برس کی عمر تک ان کو تعلیم دی جاتی ہے، ان کو نہایت سادہ اور خشک غذا دی جاتی ہے، سونے کو لکڑی کا تختہ ملتا ہے، اپنے ہاتھ سے سب کام کرنا پڑتا ہے۔ (مقالات شبلی ج:۷، ص:۱۴۷) مولانا شبلی نے اسی نمونہ پر مدرسۃ الاصلاح کو بنانا چاہا لیکن اس میں کس حد تک کامیابی ہوئی، خود اربابِ اصلاح سے پوچھنے کا یہ سوال ہے۔

مدرسۃ الاصلاح اب بھی چل رہا ہے، اس کا ایک مخصوص نصاب تعلیم ہے، اب معلوم ہوا ہے کہ اس میں کچھ اور جدت پیدا کی گئی مگر کیا وہ ندوہ کے برابر بھی پہونچ سکا، اور کیا علامہ شبلی کے خواب کی وہ تعبیر بن سکا، اربابِ اصلاح اگر ہمت کریں تو وہی جواب دیں۔

پھر اصلاح سے کچھ ہنگاموں کے بعد ایک ٹیم علیٰحدہ ہوئی، اس نے بلریا گنج ضلع اعظم گڈھ میں پڑاؤ ڈالا اور ''جامعۃ الفلاح'' کے نام سے اصلاح کا نیا ایڈیشن تیار کرنا چاہا، اس ادارہ کی بنیاد میں جماعت اسلامی کی روح گھلی ہوئی ہے، اور جماعت اسلامی اپنے بانی اور داعی کی ''ذہنی غلامی'' کے اثر سے علماء ومشائخ کے مقابلہ میں انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے زیادہ قریب ہے، اس کا اثر جامعۃ الفلاح میں یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ دین کے نام پر دین کی تعلیم کے لئے قائم ہونے والا ادارہ خالص انگریزی تعلیم کی طرف تیزی سے بڑھتا چلا جارہا ہے، اب صورت حال یہ ہے جامعۃ الفلاح کے طلبہ وفضلاء پر کالج اور یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے، نعرہ لگایا جاتا ہے اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا مگر فی الحقیقت اسلام کا چہرہ مسخ کیا جاتا ہے، اب اس ادارہ سے مسلمانوں کی دلچسپی اس لئے نہیں ہے کہ وہاں سے دین سیکھ کر اور دیندار بن کر طالبعلم نکلے گا، بلکہ انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں کی کوہ کنی، اور وہاں کی حد سے بڑھی ہوئی گراں تعلیم سے بچ کر ان کی ڈگریاں حاصل کرنے کا یہ ایک مختصر اور سہل راستہ ہے، کیونکہ متعدد یونیورسٹیوں نے اس کی سند کو کسی خاص درجہ تک منظوری دے رکھی ہے، طالب علم اس میں اس لئے داخل ہوتا ہے کہ کم خرچ میں یہاں کی سند حاصل کر کے اس لائق ہو جائے کہ ملک اور بیرون ملک کی یونیورسٹیوں میں آگے کی تعلیم کیلئے داخلہ لے، ورنہ ابتداء تعلیم سے ہی اگر اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں جانا پڑے تو اس کے اخراجات بہت زیادہ ہوں گے اسی امید پر یہاں کے مصارف جو عام عربی مدارس سے بہرحال زائد ہیں طالب علم اور ان کے سرپرست گوارا کر لیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ

طلبہ اس کو مدرسہ کہنے کے بجائے فلاح کالج کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

جامعۃ الفلاح سے انجمن طلبہ قدیم کی طرف سے اس کا ایک ترجمان ماہنامہ ''حیاتِ نو'' نکلتا ہے، اس کے ایک شمارہ کے اداریہ میں مدیر نے تحریر کیا ہے کہ:

> ''آج خلیجی ممالک کی اہمیت بڑھ جانے کی وجہ سے عربی زبان کی طرف اشتیاق بڑھ گیا ہے، دوسرے یونیورسٹیوں سے مدارس کا الحاق ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگ اسی جذبہ کے تحت اس مقدس وادی کا رخ کرتے ہیں، نیت کے خالص نہ ہونے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دھیرے دھیرے اس کا تقدس پائمال ہوتا اور اس کی حرمت داغدار ہوتی جارہی ہے۔''

مدیر موصوف نے یہ بات بالکل صحیح لکھی ہے مگر اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ طلبہ کو تصحیح نیت کا وعظ سنا دیا جائے بلکہ ان تمام رخنوں اور سب سوراخوں کو بند کردینا چاہئے جن سے بری نیت کا زہر رستا ہے۔ ایک طرف تو اربابِ انتظام بطور فخر کے ترغیب کیلئے اعلان کرتے ہیں کہ فلاں مدرسے کی فلاں سند کو فلاں یونیورسٹی نے منظوری دیدی ہے، لہٰذا اے لوگو! آؤ اس مدرسہ میں داخل ہو جاؤ، پھر جب یہی نیت لے کر طالب علم آئے اور اس نیت بد کے اثرات ظاہر ہونے لگ جائیں تو اس کے خلاف وعظ کہنا شروع کردینا، دنیا کی کون سی منطق اس طرز عمل کو درست قرار دے گی

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہٗ
بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

ان حالات کو دیکھنے کے بعد یہ بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے کہ دین کی حفاظت وصیانت کیلئے اللہ تعالیٰ نے علمائے دیوبند کو منتخب فرمالیا تھا، ان لوگوں نے طعنے سہے، دلخراش طنز برداشت کئے مگر اپنی جگہ پر مضبوطی سے قائم رہے، لوگوں نے کم حوصلہ اور بے ہمت ہونے کا الزام لگایا، اگر یہ بے ہمت اور کم حوصلہ ہوتے تو میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتے، ہاں اب البتہ دیکھا جاتا ہے لوگ اس بے معنیٰ شور وغوغا سے متأثر ہوکر اپنے بزرگوں اور اسلاف کے طریقہ کار میں زمانے کے تقاضوں کے عنوان سے ترمیم

وتنسیخ کرنے لگ گئے ہیں، اسلاف نے خاموشی کے ساتھ کام کرنا اپنا شعار قرار دیا تھا، جتنا کرتے اپنے زبان وقلم سے اس کا عشر عشیر بھی ظاہر نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اس فن ہی سے ناواقف تھے، آہستہ آہستہ رجال کار تیار کرتے رہے اور انھیں مختلف علاقوں میں بھیجتے رہے، اپنے طرز کے مدارس کی بناڈالتے رہے، ان میں فارغین کو کام پر لگاتے رہے، انھیں اس کی فکر نہ تھی اور نہ پروا کہ ہمارے کام کا تعارف ہو، اس کی نشر واشاعت ہو، عرب عجم اس سے واقف ہوں، انگریزوں کے جیسے اور فنون سے یہ بزرگ ناواقف تھے، پروپیگنڈہ کے فن سے بھی نابلد تھے، ان کیلئے بس یہی کافی تھا کہ جس کیلئے کام کررہے ہیں وہ جانتا ہے، پھر کوئی مخلوق نہ جانے تو کیا مضائقہ ہے، دارالعلوم دیوبند میں عرب وعجم، بخاراوسمرقند، ترکی، انڈونیشیا، ملیشیا اور افریقہ کے نہ جانے کتنے طلبہ پڑھتے رہے، پڑھ پڑھ کر نکلتے رہے اور اب بھی دوسرے ممالک کے طلبہ باوجود بین الاقوامی سیاست کی پیچیدہ دشواریوں کے پڑھ رہے ہیں، لیکن انھیں کس نے جانا، دارالعلوم نے کسی کے لئے اشتہار نہیں چھاپا، اس کے برخلاف دوسرے مدارس میں اگر ایک نومسلم آگیا، یا ایک عرب طالب علم آگیا تو اس کی اس درجہ نمائش کی گئی جیسے انھوں نے کوئی بہت عظیم کامیابی حاصل کرلی ہو۔

سلسلۂ کلام ذرا دراز ہوگیا، عرض کرنے کا منشاء یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند کا جو نصاب کسی قدر تغیر وترمیم کے ساتھ جو ابتداء سے اب تک رائج ہے اور اس پر ایک سو تیس سال سے زیادہ مدت گزر چکی ہے اسے پڑھ پڑھ کر علماءِ کبار کی جو کھیپ متواتر نکلی اور نکلتی رہی اس کی جامعیت، اس کی بلند نظری، اس کی خدمات جلیلہ تو اب بحث وتحقیق سے بالاتر ہے، جن لوگوں نے اس نصاب تعلیم کو کسی حیثیت سے ناقص گردانا وہ بھی اس کے دل سے معترف ہیں، دیوبند اور اس کے زیر اثر چلنے والے مدارس نے جیسے اہل فن علماء بالخصوص حدیث وتفسیر، فقہ وسلوک اور احسان وتزکیۂ باطن میں پیدا کئے ان کی نظیر ملنی مشکل ہے، یہاں نامناسب نہ ہوگا اگر ''موج کوثر'' سے شیخ محمد اکرام کا قدرے

طویل اقتباس نقل کردیں، یہ ایک ایسے شخص کا اعتراف ہے، جو نئی تعلیم اور نئی روشنی کا حامل ہے مگر ذہن ودماغ متوازن رکھتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ”دیوبند کا قیام جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے بیس پچیس سال بعد ہوا، (دار العلوم دیوبند کا قیام جنگ آزادی کے نو سال بعد ۱۸۶۶ء میں ہوا ہے) لیکن جلد ہی اس نے قوم کے تعلیمی نظام میں معزز جگہ حاصل کرلی اور آج قدیم طرز کی اسلامی درس گاہوں میں سب سے اہم گنا جاتا ہے، اس کی ترقی کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کا بیج اچھا، اور اچھے ہاتھوں سے بویا گیا تھا، دیوبند کا مدرسہ حقیقۃً شاہ عبد العزیز اور شاہ ولی اللہ کے درس کی نمایاں خصوصیتوں کا حامل ہے، اس میں فرنگی محل کی طرح منطق اور نحو وصرف اور فقہ ہی پر سارا زور صرف نہیں ہوتا، بلکہ حدیث کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے، جو شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشینوں کی خصوصیت تھی، اس خاندان سے شاہ عبد الغنی نے فیض حاصل کیا تھا اور مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ان سے، اسی طرح حاجی امداد اللہ صاحب، مولانا سید احمد بریلوی کے ایک خلیفہ (۱) کے مرید تھے، اور مولانا سید احمد، شاہ عبد العزیز کے نامور خلیفہ تھے، اس طرح دیوبند میں شروع ہی سے شاہ عبد العزیز اور ان کے تلامذہ کے درس کی خصوصیات تھیں، مسلک ولی اللّٰہی سے فیضیاب ہونے کے علاوہ مدرسہ کے منتظمین درس وتدریس کے جدید طریقوں اور اور نئے تعلیمی نظام سے بھی ناواقف نہ تھے، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے استاذ مولانا مملوک علی دہلی کالج کے پروفیسر تھے اور ان دونوں بزرگوں نے دہلی کالج میں تعلیم پائی تھی، پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب صاحب ایک عرصہ تک سرکاری محکمۂ تعلیم میں معزز عہدوں پر مامور رہے تھے، اور مولانا محمود حسن کے والد ماجد مولانا ذو الفقار علی سرکاری مدارس کے انسپکٹر تھے، دیوبند نے ندوہ کی طرح اصلاح نصاب کے بلند بانگ دعوے تو نہیں کئے لیکن اس میں اصلاحیں کیں، نصابِ تعلیم میں مذہبی علوم کے علاوہ تاریخ، ہندسہ اور طب کا بھی انتظام کیا، ابتدائی درجوں میں اردو اور

---

(۱) حضرت حاجی صاحب کے شیخ میاں جی نور محمد صاحب، اور ان کے شیخ حاجی عبد الرحیم صاحب یہ دونوں حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلیفہ تھے۔

فارسی کی تعلیم بھی ضروری ہے، اس کے علاوہ دارلعلوم کو خوش قسمتی سے ایسے اساتذہ ملے جنھوں نے قوم کی نظروں میں اس کا وقار بڑھایا، مثلاً مولانا محمود حسن محدث، مولانا انور شاہ محدث اور مولانا شبیر احمد عثمانی، یہ لوگ زہد وتقویٰ، راست گوئی، بے ریائی اور بے حرصی میں اسلاف کے بہترین علماء وصلحاء کے نمونہ تھے، خود غرضیوں اور کج بحثیوں سے قطعاً پاک، نتیجہ یہ کہ مخالفین بھی ان کی عزت کرتے، مولانا شبلی سے مولانا محمود حسن کو اختلافات تھے، لیکن مولانا شبلی ایک خط میں ان کے متعلق لکھتے ہیں ”میری نسبت چاہے ان کی جو رائے ہو لیکن وہ کوئی رائے دیانت کے خلاف نہ دیں گے“

گزشتہ پچاس سال کے حالات دیکھتے ہوئے یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں کہ دیوبند نے قوم کی بڑی مذہبی اور علمی خدمت کی ہے، دیوبند کا نصاب ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ناکافی سہی اور علمائے دیوبند کو حالات زمانہ اور مغربی مستشرقین یا دور حاضر کے مصری علماء کی تصنیفات سے اتنی واقفیت نہ سہی جتنی بعض علمائے ندوہ کو ہے، لیکن دیوبند کا پیمانہ بہت وسیع ہے، وہاں سے ہزاروں علماء اور طلبہ فارغ التحصیل ہوکر نکلتے ہیں جنھوں نے ملک کے کونے کونے میں اسلامی علوم کے چراغ روشن کئے، مذہب کی اشاعت کی، بدعتوں اور مضر اخلاق خرابیوں کی اصلاح کی، یہ درست ہے کہ وہ جدید ضروریات کے لحاظ سے کئی باتوں میں بہت باخبر نہیں لیکن آخر ان میں تقویٰ و پرہیز گاری اور روحانیت دوسروں سے زیادہ ہے، صرف اسی کا فیض ملک کے دور دراز حصوں میں پہونچانا ملک اور قوم کی قابل قدر خدمت ہے .... علامہ رشید رضا مصری ندوہ کے سالانہ جلسے کی تقریب میں ۱۹۱۲ء میں ہندوستان آئے تھے تو آپ دیوبند بھی تشریف لے گئے، اور اس دارالعلوم کے متعلق آپ نے فرمایا کہ اگر میں اس دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے نہایت مایوس واپس جاتا، اس دارالعلوم نے مجھ کو بتادیا کہ ہندوستان میں ابھی علوم عربیہ اور تعلیمات مذہبی اعلیٰ پیمانے پر ہیں۔

دارالعلوم دیوبند نے بغیر کسی شور وغل کے تھوڑی ہی مدت میں جو اعتبار ومرتبہ حاصل کرلیا ہے وہ اس کے منتظمین کی قابلیت اور نیک نیتی کا واضح ثبوت ہے اور اس پر انھیں فخر کا جائز حق ہے۔ (موج کوثر ص: ۲۰۸)

یہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے زیر سایہ تربیت پانے والے ان علماء ومشائخ کے کارنامے اور خدمات ہیں، جنھوں نے اپنی عبقریت، اپنی بلند قامتی اور اپنے علمی وعملی بلند پائیگی کی وجہ سے تاریخ کے صفحات پر اپنی جگہ بنالی ہے، انھیں نہ زمانہ بھول سکتا ہے، نہ تاریخ نظر انداز کرسکتی ہے بلکہ ان کے احوال وکوائف کو تاریخ فخر کے ساتھ بیان کرتی ہے، اب یہ تاریخ کے انمٹ نقوش ہیں جنھیں لیل ونہار کی گردشیں بھی محو نہیں کرسکتیں، مگر دارالعلوم کی آغوشِ تربیت سے کچھ کیا بہت سے ایسے جواں مرد بلکہ شیر دل بھی بن کر نکلے ہیں جنھیں نہ تاریخ نے یاد رکھا، نہ زمانے کے حافظہ میں انھیں جگہ مل سکی، یہ وہ بوریہ نشیں ہیں جو چھپروں کے نیچے بیٹھے کوردہ دیہاتوں میں اپنی زندگی بسر کرلے گئے، ان کے حوصلے بہت اونچے نہ تھے ان کی امنگیں پُر جوش نہ تھیں، ظاہر ہے کہ پڑھنے کیلئے جو طلبہ مدرسہ میں داخل ہوتے ہیں ذہن وصلاحیت کے اعتبار سے سب عبقری اور عالی دماغ نہیں ہوتے، سو دو سو طلبہ میں گنتی کے چند طلبہ ذہین وذکی ہوتے ہیں جو بعد کو خدمات کے ذریعہ ایک شہرت عام حاصل کرتے ہیں، بہت سے ایسے ہوتے جو دماغی صلاحیت کے اعتبار سے کمزور اور علمی لیاقت کے لحاظ سے ناقابل التفات اور معاشی معیار سے پست ہوتے ہیں، انھیں اساتذہ بھی بعض اوقات ناقابل اعتنا سمجھتے ہیں، اور دوسرے لوگ بھی ناکارہ خیال کرتے ہیں، وہ کسی طرح گرتے پڑتے اپنی تعلیم مکمل کرتے ہیں، اور کتنے ایسے بھی ہوتے ہیں، جو کبھی معاشی کمزوری سے، کبھی دماغی کوتاہی سے تعلیم مکمل نہیں کرپاتے، مگر جب وہ نکلتے ہیں تو کسی دیہات میں، کسی ناخواندہ بستی میں، کسی اجاڑ گاؤں میں چند بچوں کو لیکر بیٹھ جاتے ہیں، اپنی اسی کمزور صلاحیت لیکن طاقتور ایمان کو لے کر بچوں کو اپنے سامنے بیٹھا لیتے ہین، اور ان کے معصوم دل ودماغ پر ابتدائی حرف شناسی کے ساتھ ایمان وعقیدہ کی پختگی کا بھی نقش بٹھا دیتے ہیں، یہ لوگ گمنام رہتے ہیں، گاؤں کے لوگ انھیں مولوی صاحب یا میاں جی کہتے ہیں، انھیں صرف گاؤں کے لوگ جانتے ہیں، یا پھر وہ جانتا ہے جس کا جاننا سب پر بھاری ہے، یہ

معمولی غذا کھا کر، معمولی تنخواہ لے کر، کبھی مکتب اور کبھی کسی کے برآمدہ کی نا قابل پناہ چھت کے نیچے اپنی زندگی گذار لیتے ہیں، مگر دین وشریعت اور ایمان وعمل کی جڑیں مضبوط کرجاتے ہیں، انھیں کبھی شہرت کی آرزو نہیں ہوتی یہ خود کو بڑے کارناموں کا اہل نہیں سمجھتے اور نہ اپنے کام کو کارنامہ سمجھتے، سیدھے سادے لوگوں میں رہتے، پانچوں وقت کی امامت کرتے، کبھی کبھی کوئی کتاب پڑھ کر سنا دیتے، بہت باصلاحیت ہوتے تو چند بے ربط جملوں پر مشتمل سیدھے سادے بول میں تقریر کرلیتے، جمعہ پڑھاتے، عید بقرعید کی نماز پڑھاتے، نکاح پڑھاتے، لوگوں کی قربانیاں ذبح کرتے۔

دنیا والوں کے نظریہ کے اعتبار سے یہی چھوٹے چھوٹے کام کرتے ہیں، نہ لچھے دار تقریریں کرتے، نہ لمبے لمبے اسفار کرتے، نہ کانفرنسوں اور جلسوں میں شرکت کرتے، نہ اشتہارات واخبارات میں القاب وآداب کے ساتھ ان کے نام چھپتے، نہ تجویزیں پیش کرتے، نہ ریزولیشن پاس کرتے، دنیا ان سے ناواقف رہتی، لیکن یہ اپنی گمنامی میں چھوٹے چھوٹے بچوں پر محنت کرتے، ناخواندہ بوڑھوں اور جوانوں پر محنت کرتے ان کے دم سے دیہاتوں مین دین کے چراغ جگمگاتے رہتے ہیں، دارالعلوم دیوبند نے اپنی آغوش تربیت میں ایسے گمنام سپاہیوں کی کھیپ تیار کی ہے، لیکن کون انھیں جانتا ہے۔

آج بھی اگر ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے بے شمار گاؤں، دیہاتوں اور قصبات میں کوئی ہمت والا جائے اور تعلیم دینے والے میاں جی حضرات کا جائزہ لے، تو وہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جائے گا کہ ہر جگہ دارالعلوم دیوبند اور اس کے ہم مسلک وہم مشرب مدارس کے فیض یافتہ بہت قلیل مشاہرہ پر خوشی خوشی بچوں کی تعلیم وتربیت میں مصروف ہیں، خاکسار کو یوپی بہار کے بکثرت گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے اور ہر جگہ میں نے انھیں مدارس کے فارغین کو مصروف عمل پایا، بلند بانگ دعوؤں والے مدارس کے فارغین کہیں نظر نہ آئے، یہ لوگ بڑے مدارس میں قدرے نظر آئیں گے،

ورنہ کسی سرکاری محکمے میں کلرک، کسی ایمبیسی میں ترجمان یا سعودی یا خلیجی ممالک میں تحصیل زر میں مصروف نظر آئیں گے، تحصیل زر کی یہ دوڑ فضلاء دیوبند میں بھی آگھسی ہے تاہم عرب میں بھی ایک بڑی تعداد ان کی مصروف خدمت دین وایمان ہے۔

لیکن ان معروضات سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ دارلعلوم نے علماء کا جو معیار تجویز کیا تھا مجموعی اعتبار سے وہ معیار پورے طور پر باقی ہے، ہم نے جو داستان سنائی ہے یہ ۱۳۰؍سال کی مدت پر محیط ہے، ہمارا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے نصاب تعلیم، طریقۂ تعلیم، معیار تعلیم میں کوئی نقص نہیں ہے، انسانی کوشش کون سی ایسی ہوگی جو نقائص سے خالی ہوگی بے شک اس مدت صدوسی سالہ میں فراز کے ساتھ نشیب بھی بہت ہے، حسن کے ساتھ قبح بھی لگا ہوا ہے، کمال کے پہلو میں نقص بھی ہے، ایک طرف بلند پایہ علماء ومشائخ ہیں تو دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جن کا وجود اہل علم کے لئے باعث ننگ ہے، لیکن یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر مستقل گفتگو ہو سکتی ہے، یہ درحقیقت اپنا احتساب ہے جو ہر فرد اور ہر قوم پر فرض ہے، اور یہ مصلحین کا موضوع ہے۔

☆☆☆☆☆

مدارس پر گرم نگاہیں

اسباب اور علاج

قدیم طرز کے دینی مدارس، جہاں دینی تعلیم ہوتی ہے، جہاں قرآن وحدیث اور دوسرے علوم اسلامیہ میں مہارت پیدا کی جاتی ہے، اور ساتھ ہی اسلامی تربیت سے طلبہ کو آراستہ کیا جاتا ہے، جو حکومتوں کی خوشامد اور کاسہ لیسی سے آزاد ہیں اور آزاد رہنا چاہتے ہیں، اس وقت شاید سارے عالم میں عموماً اور ہمارے ملک میں خصوصاً اربابِ حکومت کے مرکزِ نگاہ بنے ہوئے ہیں، انھیں ان مدارس میں وہ تمام چیزیں نظر آتی ہیں، جن سے ان کے دامن بالعموم پاک ہیں، اور وہ بات نظر نہیں آتی جو ان کا طرۂ امتیاز ہے۔

شکوک وشبہات، بدگمانیوں اور تہمت طرازیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو مدارس اور مدارس کے طلبہ واساتذہ پر حملہ آور ہوتا ہے، ایسے حالات پیدا کئے جارہے ہیں کہ یہ مدارس ہراساں ہوکر یا تو خود کو فنا کردیں، یا اپنی راہ بدل دیں، باطل کی حکومتیں ان مدارس کو اپنے لئے خطرہ محسوس کررہی ہیں، اور جب سے سوویت یونین (روس) میں بکھراؤ پیدا ہوا ہے، اور افغانستان میں طالبان کو بالادستی حاصل ہوئی ہے، اس وقت سے یہ حکومتیں اور بوکھلا گئی ہیں، طالبان کی حکومت کو تو پارہ پارہ کرکے افغانستان کو خانہ جنگی کی آگ میں جھونک ہی دیا گیا ہے، اور جہاں جہاں یہ مدارس مصروف خدمت ہیں، ان پر بھی نگاہیں گرم ہیں۔

خیر! باطل اور کفر کی نگاہیں تو ہمیشہ حق پر اور اسلام پر گرم رہی ہیں اور یہ کچھ اتفاقی واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ خدائی انتظام ہے، ہر ایک حق کے پیچھے ایک باطل لگا ہوا ہے،

اور اس میں بڑی مصلحتیں ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوّاً شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْراً O وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ O اور اسی طرح بنائے ہم نے ہر نبی کیلئے دشمن شریر آدمیوں کو اور جنوں کو، جو کہ سکھلاتے ہیں، ایک دوسرے کو ملمع کی ہوئی باتیں فریب دینے کیلئے، اور اگر تمہارا رب چاہتا تو وہ لوگ یہ کام نہ کرتے، تو تم چھوڑ دو وہ جانیں اور ان کا جھوٹ (سورہ انعام)

اس سے معلوم ہوا کہ حق کی مخالفت پر، جھوٹی ملمع سازی کر کے ایک دوسرے کو فریب دینے کی کوشش پر کمر بستہ رہنا اہل باطل کا شیوہ ہے، اور تکوینی طور پر سب کچھ مشیت الٰہی کے ماتحت ہوتا ہے، عارف باللہ مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں:

> ”اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کے دشمن اس واسطے بنائے کہ عداوت سے بہت کام ہوتا ہے، کیونکہ یہ دنیا دارالابتلاء (آزمائش کی جگہ) ہے، چنانچہ ابتلاء ہی کیلئے اللہ تعالیٰ نے شیطان اور نفس کو پیدا فرمایا، مگر یہ ابتلاء اس وقت تک تام نہیں ہوتا جن تک کہ اچھی طرح دشمنی نہ کی جائے، اس لئے شیاطین الانس کو بھی پیدا فرمایا، اور یہی کفار اور فساق وفجار ہیں، جو دین کو ناپسند کرتے ہیں اور وہ دراصل یہ شیطان کے اولیاء اور شیطان ہی کے مقرب ہیں، اس کی باتوں کو سنتے اور کان لگاتے ہیں، اور ہر نبی کیلئے اس کا ہونا اس لئے ضروری ہے کہ نبی ہدایت کیلئے مبعوث ہوتا ہے، تو جب تک اس کے بالمقابل کوئی ضلالت پھیلانے والا نہ ہو، یہ ابتلاء کیونکر کامل ہوسکتا ہے، اور یہ بھی ضروری ہے کہ جو لوگ انبیاء علیھم السلام کے طریقے پر ہیں، اور اس کام کو کر رہے ہیں، ان کے دشمن بھی شیاطین الجن اور شیاطین الانس ہوں، اس واسطے ہم ان لوگوں سے کہتے ہیں کہ تم جو ہم سے عداوت کرتے ہو تو یہ انبیاء علیھم السلام کی سنت ہے، اور اس میں ہمارا فائدہ ہے، لہٰذا اب تم بھی کوشش کرو اور ہم بھی کوشش کریں گے۔“

ہماری کوشش کیا ہوگی ؟ ہم بھی کوئی سازش کریں گے ؟ یا کوئی جھوٹا سچا پروپیگنڈہ کریں گے؟ اور جس ہتھیار سے ہمارا دشمن ہم پر حملہ آور ہے، بعینہ وہی ہتھیار ہم بھی اٹھائیں گے؟ حضرت مصلح الامت اس کا جواب دیتے ہیں کہ نہیں بلکہ انبیاء علیھم السلام اور ان کے ماننے والے اس عداوت اور اس سازش کی وجہ سے:

> ''ان دشمنوں کے مقابلہ کیلئے تیار ہوجاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف ظاہر و باطن میں رجوع ہوجاتے ہیں اور اپنی دعوت وتبلیغ میں خوب اچھی طرح مستعد ہوجاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں کہ ان لوگوں کی عداوت اور اس کے ضرر سے بچائے، اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بڑی قدرت ہے، پس جس طرح ادھر شیاطین ہیں، تو اُدھر فرشتے ہیں، ہر طرح کی نصرت وتائید ان کے ساتھ ہوتی ہے۔''
>
> (مجموعہ تالیفات مصلح الامت ج:۳، ص:۲۸۳)

بہرکیف دشمنوں کی عداوت تو ایک ناگزیر امر ہے، اس کا خاتمہ ممکن نہیں ہے، لیکن اس عداوت اور سازش کے ضرر سے خود کو بچانا ایک اہم کام ہے، سازش کا جواب سازش نہیں ہے، پروپیگنڈہ کی کاٹ ہماری تعلیمات میں پروپیگنڈہ نہیں، جھوٹ کا جواب جھوٹ نہیں ہے، اگر اسلامی حکومت ہوتی، اسلامی قانون ہوتا تو برائی کی سزا دی جاتی، اور موجودہ صورتحال میں جب معاملہ دوسرا ہے، برائی کا جواب برائی نہیں ہے، پھر کیا ہے؟ اہل مدرسہ کو کیا کرنا چاہئے؟ اس کی تلاش ہونی چاہئے، کیا ہو رہا ہے؟ اس کا احتساب کرنا چاہئے۔

کیا کرنا چاہئے اس کی طرف اشارہ اوپر کی سطروں میں موجود ہے، وہ یہ کہ دشمنوں کے مقابلے کیلئے تیار ہوجائیں، کس طرح مقابلہ کریں۔ طریقہ یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کی طرف ظاہر و باطن میں رجوع ہوجائیں، اور اپنی دعوت وتبلیغ میں، اور اپنے فریضے کی ادائیگی میں خوب اچھی طرح مستعد ہوجائیں اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں۔''

ظاہر و باطن میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ احکام

شریعت کی پابندی دل وجان سے کریں، خواہ ان کا تعلق احکام ظاہر سے ہو، جیسے عبادات، نماز، روزہ وغیرہ اور معاملات مثلاً لین دین، خرید وفروخت، اور خواہ ان کا تعلق باطن سے ہو، جیسے محبت وعداوت، اخلاص وریا، زہد وحرص وغیرہ، دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ تقویٰ اور خوف خدا کو اپنا شعار بنائیں۔

دوسرے یہ کہ اپنے فریضے کی ادائیگی میں، تعلیم وتربیت میں، دعوت وتبلیغ میں، امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں خوب مستعد ہوجائیں، اوراس میں کسی طرح کی سستی اور لاپرواہی سے کام نہ لیں، سہولت پسندی، عیش کوشی سے دوررہیں۔

تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ سے خوب دعائیں مانگیں، اگر یہ تینوں باتیں مجموعی اعتبار سے حاصل ہوجائیں تو نصرت الٰہی ہرطرف سے حفاظت کرے گی، اور کسی دشمن کا کید اوراس کی سازش نقصان نہ پہونچا سکے گی، اور اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے: وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئاً اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (سورہ آل عمران) اگر تم نے صبر واستقامت سے کام لیا اور تقویٰ کو اختیار کیا، تو ان کی سازش تمہیں کوئی نقصان نہ پہونچا سکے گی، بلاشبہ جو کچھ یہ لوگ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

صبر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی گھبرا کر اپنا فریضہ چھوڑ نہ دے اور نہ کسی غلط اور ناجائز طریقے کو اختیار کرے، بلکہ شریعت کے مطابق ڈٹا رہے تو اس صبر وتقویٰ کی وجہ سے وہ ایک مضبوط چٹان کی طرح ہوجائے گا، اہل باطل کی سازشیں آئیں گی اور ٹکرا کر چکنا چور ہوجائیں گی۔

یہ طریقۂ کار فرد کیلئے بھی متعین ہے، اور اجتماعی ماحول کیلئے بھی، جب اس صبر اور تقویٰ میں رخنہ پڑے گا، سازشوں کو نقصان پہونچانے کی راہ ملے گی، دشمنوں کی دشمنی تو رہے گی، لیکن اگر ان تمام رخنوں کو بند کردیا جائے، جن سے سازشوں کو گھسنے کا موقعہ ملتا ہے تو کتا بھونکتا رہے گا اور قافلہ چلتا رہے گا۔

مدارس دینیہ جو اسی غرض سے قائم کئے جاتے ہیں کہ اسلامی شریعت کا، علمی اور عملی ہر طریقے سے تحفظ ہو سکے، ان کو کامل طور پر وہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے، جو اللہ اور رسول کی منشاء کے مطابق ہو، ہر ممکن جدوجہد کرنی چاہئے کہ احکام شریعت مدرسہ کے ہر شعبہ میں زندہ اور کارفرما ہیں، اہل مدرسہ میں تقویٰ اور تدین کا رنگ چھایا رہے، خواہ مالیات کا شعبہ ہو یا تعلیم وتربیت کا، خواہ باہمی تعلقات کا مسئلہ ہو یا ذاتی وانفرادی زندگی کا شعبہ ہو۔

اس نقطۂ نظر سے ہم اپنا جائزہ لیتے ہیں، تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خطائیں ہی خطائیں ہیں، کوتاہیاں ہی کوتاہیاں ہیں، عہدوں کیلئے لڑائیاں ہیں، ایک ایک مدرسہ میں بعض اوقات کئی کئی گروپ ہوجاتے ہیں، جن میں کشمکش رہتی ہے، اساتذہ ٹولیاں بنا کر افتراق میں مبتلا ہوتے ہیں، طلبہ الگ من مانی کرتے ہیں۔ چونکہ ان مدارس کا قیام اور ان کی بقاء کا تعلق عالم اسباب میں عوامی چندوں سے ہے، تو چندوں میں اتنا انہماک ہوتا ہے کہ بعض اوقات حرام وحلال کی حدیں ٹوٹ جاتی ہیں، اور اس سلسلے میں نامناسب امور کا اتنا ارتکاب ہوتا ہے اور انھیں اتنا غیر اہم سمجھا جاتا ہے جیسے ان کیلئے شریعت کی کوئی ہدایت ہے ہی نہیں، کمیشن پر چندہ کرنا ایک دستور سا بن گیا ہے، حالانکہ شرعاً وہ جائز نہیں ہے، چندہ کرنے والے کمیشن پر چندہ کرتے ہیں اور زکوٰۃ ہی میں سے اپنا کمیشن وضع کر کے بقیہ رقم مدرسہ کے حوالے کرتے ہیں، کیا یہ طریقہ جائز ہے؟

پھر بہت سے مدارس میں تعلیم کی مدت میں طلبہ اور اساتذہ سب کو چندہ کے کام میں لگا دیا جاتا ہے، اس سے تعلیم کا ناقابل تلافی نقصان ہوتا ہے، اور مزاج بگڑ جاتا ہے، یہ تو چندے کے حصول کا مسئلہ ہے، اس کے خرچ کا مسئلہ بھی کچھ کم نازک نہیں ہے، مصارف کی بے احتیاطیوں سے ارباب مدارس خوب واقف ہیں۔

ایک افسوسناک اور قابل اصلاح صورت حال یہ ہے کہ عموماً دینی مدارس کے اہل انتظام کالجوں اور یونیورسٹیوں کی ریس میں تعلیم سے زیادہ تعمیر کا جذبہ رکھتے ہیں،

کارکنوں کی تنخواہیں تو کم، بہت کم ہوتی ہیں، لیکن تعمیر میں بے تحاشا دولت صرف کی جاتی ہے، اور بعض اوقات بالکل بے ضرورت! ان کی طویل وعریض عمارتوں کا اور کوئی نقصان ہو یا نہ ہو، ہمارے اس ملک میں جہاں تعصب کا الاؤ ہر طرف جل رہا ہے، مدارس کی ان بلند وبالا خوبصورت عمارتوں پر فرقہ پرستوں کی نگاہیں پڑتی اور ان میں خطرے کی علامتیں ڈھونڈھتی ہیں، نہیں ملتیں تو زبردستی تہمت تراشی کرتی ہیں، حالانکہ اگر بقدر ضرورت عمارتیں بنوائیں اور انھیں سادہ انداز پر رکھیں، تو تعلیمی وتربیتی مواقع پر خرچ کرنا آسان ہو، اور ان پر ناجائز نگاہیں بھی نہ پڑیں۔

کیا اچھا ہوتا کہ اربابِ مدارس بہت زیادہ شاندار عمارتیں نہ بناتے تو بہت سے فتنوں سے محفوظ رہتے، قرآن کریم میں سورہ کہف میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ وخضر **علیہما السلام** کا واقعہ ذکر فرمایا ہے، اس میں تذکرہ ہے کہ ایک نئی کشتی کو حضرت خضر نے عیب دار بنا دیا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر اعتراض کیا تو آخر میں اس کے متعلق جو بات حضرت خضر علیہ السلام نے فرمائی وہ یہ تھی: **أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُّ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَ هُمْ مَلِكٌ يَّأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْباً**، رہا کشتی کا معاملہ! تو وہ چند مسکینوں کی تھی، جو دریا میں کام کرتے تھے، میں نے چاہا کہ اس میں عیب پیدا کر دوں، (کیونکہ) سامنے ایک بادشاہ ہے، جو ہر (اچھی) کشتی کو چھین لیتا ہے۔

غور کیجئے! یہ مدارس ہمارے لئے اس کافرانہ ملک اور حکومت میں نجات کی کشتیاں ہیں، انھیں بوسیدہ ہی رہنا ٹھیک ہے، تاکہ کسی کی بری نظر ان پر نہ پڑے، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمہ نے **تذکیر بسورۃ الکھف** میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> ”کشتی والے نمونے سے جیسا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے خود ہی تصریح کی، یہ بتانا مقصود تھا کہ ایسے مواقع بھی کبھی پیش آجاتے ہیں، جن میں ظالم کو اس کی ظالمانہ

> چیرہ دستیوں سے ہٹانے کے درپے ہونا وقت کے اقتضاء کے مطابق نہیں ہوتا، بلکہ ایسے زمانہ میں مصلحت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ ظالم اپنی ظالمانہ کاروائیوں کا نشانہ جس چیز کو بنانا چاہتا ہے، اسی میں بظاہر کچھ ایسے نقائص اور عیوب چاہئے کہ عمداً اور قصداً پیدا کر دیئے جائیں، جن کی وجہ سے ظالم کی حرص و آز کی نگاہوں سے تو وہ چیز گر کر اس کے سامنے سے ہٹ جائے، لیکن بذات خود وہ شئ بھی باقی رہ جائے، اور جو کام اس سے نکل رہا ہو، اس میں خلل پیدا نہ ہو، (ص:۲۴۳)

ہندوستان میں اسلامی مدارس کا جال بچھا ہوا ہے، جن بزرگ ہستیوں نے مدارس کا یہ سلسلہ شروع کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے ان مدارس کو عصری اسکولوں کے شانہ بشانہ کبھی کھڑا کرنا نہیں چاہا، بلکہ بقول مولانا مناظر احسن گیلانی:

> ”انتہائی کس مپرسی کے حالات میں گمنام قصبوں اور دیہاتوں کی مسجدوں کے گوشوں میں کچھ پڑھنے پڑھانے والے سمٹ گئے تھے، تعلیمی نصاب نقائص وعیوب سے معمور تھا، نہ عصری تقاضوں کے مطابق علوم وفنون کی کتابیں اس میں شریک تھیں اور نہ دنیا کی موجودہ علمی زبانوں میں کسی زبان کو اس نصاب میں جگہ دی گئی۔“ (ص:۲۵۲)

> ”لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ مذکورہ بالا عیوب ونقائص سے پاک کر کے ان مدارس کو بھی عصری جامعات اور کلیات کے مطابق بنا دیا جاتا......تو دینی فتنے کے پچھلے تاریک وتار دنوں میں بچھی کچھی نجات کی کچھ کشتیاں لوگوں کو جو میسر آرہی ہیں، جو ایمان وعمل صالح کی زندگی کے ساتھ قبر کے کناروں تک پہونچنے میں اب تک کامیاب ہوئے ہیں، کیا ہم نجات کی ان کشتیوں کو پا سکتے تھے؟“ (ص:۲۵۴)

مولانا کی یہ گفتگو مدارس کے ہمہ جہتی مسائل پر ہے، میں یہاں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تعمیرات کے لحاظ سے مدارس اگر پست اور کمتر درجہ کی عمارتوں پر مشتمل ہوں، اور شاہراہ عام کے بجائے ان کیلئے ذرا گمنام جگہوں کا انتخاب کیا جائے، تو موجودہ سیاسی اور حکومتی صورت کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہوگا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ

انھیں کوئی نہ جانے، مگر یہ ضرور ہے کہ غیر متعلق لوگ کم جانیں تو بہتر ہے، حکومت کی نگاہ ترحم ہو یا نظر غضب، دونوں ہمارے مدارس کیلئے مضر ہیں۔

نظر ترحم کی ایک مثال حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ کے قلم سے ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں کہ:

> ''مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی وزارت تعلیم کے زمانے میں ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ گورنمنٹ آف انڈیا ہندوستان میں ایک نمونہ کی عربی درسگاہ قائم کرنا چاہتی ہے، جو ماڈل عربک کالج کے طور پر عربی مدارس کی رہنمائی اور قیادت کرے...... مولانا آزاد کے نزدیک اس کیلئے دارالعلوم (ندوۃ العلماء) سے زیادہ کوئی مدرسہ موزوں نہ تھا، انھوں نے فرمایا کہ اگر ندوۃ العلماء کے ذمہ دار اس تجویز کو قبول کرلیں گے، تو حکومت عمارتوں کی تکمیل کردے گی، یہ تجویز آئی تو ندوۃ العلماء کی ذمہ دار بڑی کشمکش میں پڑ گئے، ایک طرف دارالعلوم کے (ایک خاص مقصد کا وسیلہ ہونے کے لحاظ سے) موت وحیات کا مسئلہ تھا، دوسری طرف مولانا آزاد کی تجویز کو رد کردینا بھی مشکل تھا، جو ایک بزرگ خاندان کی حیثیت رکھتے تھے......ندوہ کے خادم وامین اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اس تجویز کے قبول کرنے کے بعد ندوہ، ندوہ نہیں رہے گا، ایک عربک کالج بن جائے گا، اور ملت کے ہاتھ سے نکل جائے گا...... اس تجویز کو قبول کرنا ندوۃ العلماء کی محضر قتل پر دستخط کرنے کے مرادف ہے، لیکن مولانا آزاد سے اس مسئلے پر بات کون کرے، اور مخمصہ سے نکلنے کی سبیل کیسے نکالی جائے۔'' آخر قرعہ فال مولانا مسعود علی کے نام نکلا اور یہ مشکل کام ان کے سپرد ہوا کہ وہ دہلی جائیں اور مولانا آزاد سے ایسی گفتگو کریں کہ ان کے جذبہ کی ناقدری بھی نہ ہو اور معذرت بھی ہوجائے.......
>
> مولانا آزاد سے ملاقات ہوئی، انھوں نے اپنے معمول کے مطابق کہا کہ مولانائے مسعود کیسے آئے؟ کہنے لگے کچھ بزرگوں کے

> لوحِ مزار کی عبارت کے بارے میں غور وخوض ہو رہا ہے، مولانا محمد علی مونگیری کے لوح مزار پر بانی ندوۃ العلماء لکھنا تجویز ہوا ہے، اسی طرح مولانا شبلیؒ کے لوح مزار کی کوئی عبارت بتائی، جس سے ان کی ندوۃ العلماء تحریک کو ترقی دینے کا اظہار ہوتا تھا، کہنے لگے کہ اندیشہ ہے کہ ہمارے اور آپ کے لوح مزار پر قاتلِ ندوۃ العلماء لکھا جائے، مولانا نے بڑے استعجاب سے پوچھا کہ کیوں؟ کیا معاملہ ہے؟ کہنے لگے جو تجویز آپ نے پیش کی ہے، اس کا مآل تو یہی ہے کہ ندوۃ العلماء ختم ہو جائے اور ہم اور آپ اس کے قاتل ٹھہریں، آج تو آپ منصب وزارت پر ہیں، آپ کی موجودگی میں اس کا خطرہ نہیں ہے، لیکن کون آتا ہے اور کیا ہوتا ہے، مولانا کی شہرۂ آفاق ذہانت کیلئے اتنا اشارہ کافی تھا، وہ دور تک بات سمجھ گئے، اور فرمایا کہ آپ لوگوں کا فیصلہ صحیح ہے اور اس تجویز پر کوئی اصرار نہیں۔ (پرانے چراغ ج: دوم)

حکومت کی مہربانیاں کیا اثر رکھتی ہیں، اس واقعہ سے بخوبی واضح ہے، کاش یہ اہل مدارس اس پر غور کرتے، اور اپنے آپ کو حکومت کے سائے سے بچائے رکھتے، مدارس میں جو کام ہوتا ہے، وہ کہیں نہیں ہوتا، یہاں انسانیت سازی ہوتی ہے، مردم گری ہوتی ہے، کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ اور مدارس دینیہ کے طلبہ میں واضح فرق ہے، مگر جو روش اب مدرسوں میں آتی جا رہی ہے، اس کے نتیجے میں یہ فرق کم ہوتا جا رہا ہے۔

عمارت کچی ہو، معمولی ہو، تعلیم پکی ہو، تربیت غیر معمولی ہو، کارخانہ مخفی ہو، جو مال ڈھل کر نکلا ہے، وہ عمدہ ترین ہو، لیکن اب تو حال یہ ہے کہ عمارت نہایت پختہ اور خوش نما ہے، مگر تعلیم و تربیت اسی لحاظ سے کچی ہے، کارخانہ تو لوگوں کی نگاہ میں آ گیا، شہرت بھی بہت ہو گئی، مگر ردی مال نکل کر بازار میں آ رہا ہے۔

مدرسہ کا سارا کام اللہ کے لئے ہو، جس کو جاننا چاہئے وہ جانتا ہے، شہرت کا جذبہ نہ ہو، پروپیگنڈہ کا شوق نہ ہو تب مزاج اسلامی ہے، اور اگر جذبہ نمود ہی کام کرا رہا ہے تو مواخذہ کا اندیشہ ہے۔

مدارس کا تحفظ بہت اہم ہے، اور نہایت ضروری، اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جلسے کئے جائیں، تنظیمیں بنائی جائیں، قراردیں پاس کی جائیں، احتجاج اور مظاہرے ہوں، حکومت کے کانوں تک اپنی فریاد پہونچائی جائے، یہ دورِ حاضر کی جمہوریت کا طریقہ ہے، لیکن یہ طریقہ جمہوری ہے، اسلامی نہیں۔ مجبوری میں حدود کے اندر رہ کر اسے اختیار کیا جا سکتا ہے، مگر اس پر اکتفاء کرنا درست نہیں، دوسروں کے عیبوں کو دیکھنے سے زیادہ اپنے معائب کو دیکھنا ضروری ہے، ڈھانچہ موجود ہو، اس میں روح نہ ہو تو آہ وواویلا مچا کر کتنی دیر تک گِدھوں کو روکا جا سکتا ہے، مدارس میں تعلیم وتربیت کا اہتمام نہ ہو .... جو کہ ان کا اصل موضوع ہے .... روحانیت سے خالی ہو، آپسی اختلافات نے ماحول کا ستیاناس کر رکھا ہو، ایک دوسرے کی حق تلفی میں باک نہ ہو، تو کیا اس کھوکھلے جسم پر نگاہیں نہ پڑیں گی۔

مدرسہ تین عناصر سے مرکب ہے، اساتذہ، طلبہ اور اہل انتظام، ان تینوں میں باہمی توافق وتناصر ہو، ایک دوسرے کے حقوق کی رعایت ہو، غلطیوں سے درگزر کرنے کا حوصلہ ہو، حرص مال اور حب جاہ سے برکنار رہیں، طلبہ کی طرف سے اطاعت گزاری اور اساتذہ ومنتظمین کی جانب سے شفقت ومحبت اور جذبۂ خیر خواہی ہو، نصاب تک تعلیم کی تکمیل ہو، اخلاق وانسانیت کی دولت سے تینوں عناصر مالا مال ہوں تو ان شاء اللہ غیبی طور پر ان کے تحفظ کا انتظام ہوگا۔

وماذٰلک علی اللہ بعزیز

☆☆☆☆☆

حضرات اساتذہ کیلئے چند رہنما اصول

یہ ایک مکتوب ہے، ایک عربی مدرسہ کے حضرات اساتذہ کے نام لکھا گیا۔

حضرات احبابِ کرام واساتذۂ مدرسہ!

السلام علیکم ورحمة اللّٰه وبرکاتهٗ

مزاج گرامی!

آپ حضرات سے بہت عرصہ ہوا کہ ملاقات نہیں ہوئی، اور اِدھر مستقبل قریب میں بھی ملاقات کے آثار نہیں محسوس ہوتے، حضرت اقدس ناظم صاحب مدظلہٗ نے مدرسہ کی بابت چند کلمات تحریر فرمائے تھے، اس سے تأثر ہوا، تو بے اختیار جی چاہا کہ حضرت کی خدمت میں جو لکھنا ہے وہ تو خیر ہے ہی، آپ حضرات سے بھی چند باتیں عرض کردوں، گو کہ میری ایسی کوئی حیثیت نہیں ہے کہ آپ حضرات کو براہ راست مخاطب کرسکوں، میں بھی ایک مدرسہ کا مدرس ہوں، آپ حضرات بھی میری طرح مدرسہ اور علم دین کی خدمت گزاری میں لگے ہوئے ہیں، جو باتیں میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں، ان کا میں اس سے زیادہ محتاج ہوں، جتنے آپ حضرات محتاج ہیں، ہاں یہ جانتا ہوں کہ آپ حضرات کو مجھ سے محبت ہے، اور خصوصی محبت ہے، اور میں بھی دل سے آپ کی قدر کرتا ہوں، بس یہی چیز ہے جس نے براہ راست تخاطب پر آمادہ کیا ہے، مجھے امید ہے کہ میری کسی بات سے آپ کو ناگواری نہیں ہوگی، کیونکہ محبت، تلخیوں کو بھی گوارا بلکہ خوشگوار بنا دیتی ہے۔

(۱) سب سے پہلی بات تو مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ آپ حضرات معلم و مربی ہیں، جن لوگوں سے متعلق تربیت کا کام ہو، انھیں دوسروں کی تربیت سے پہلے خود اپنی

تعلیم وتربیت پر نگاہ رکھنی ضروری ہے، آپ کسی وقت یہ تصور دل میں نہ لائیں کہ آپ کی تعلیم وتربیت ہو چکی ، اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ نہیں ، علم میں اضافہ کی کوشش کرتے رہنا چاہئے ، اور اخلاق تو ایسی چیز ہے کہ زندگی بھر اس میں کوئی نہ کوئی عیب دکھائی دیتا رہے گا ، پوری توجہ کے ساتھ اپنے علم واخلاق کو بڑھانے اور سدھارنے کی محنت میں لگے رہئے۔ علماء واساتذہ کیلئے اخلاق کی بنیاد دو چیزیں ہیں، تواضع اور ترکِ حسد۔ یہ بنیاد اوروں کیلئے بھی ہے، مگر طلبہ واساتذہ کیلئے اس کی حیثیت خصوصی بنیاد کی ہے، تواضع کا مطلب یہ کہ آدمی اپنی کوئی فضیلت دوسروں پر نہ سمجھے، اور اس کی اصل یہ ہے کہ آدمی غلام اور بندہ ہے، غلاموں کی نگاہ ہمیشہ اپنے مالک پر ہوتی ہے، مالک کے سامنے ہوتے ہوئے ، کوئی غلام ، اپنے جیسے غلام پر فوقیت جتلانے کی جرأت نہیں کرتا ، اور یہ تو آپ اپنے شاگردوں میں بھی دیکھتے ہیں کہ آپ کے سامنے کسی طالب علم کو جرأت نہیں ہوتی کہ دوسرے طالب علم پر برتری ظاہر کرے، اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو آپ کے غصہ کی حد نہیں رہتی، بس یہی حال ہمارا اللہ کے سامنے ہونا چاہئے ، اللہ تعالیٰ مالک ہیں اور ہم غلام ہیں، اور ہمہ وقت اللہ کی نگاہ میں ہیں، ایسی حالت میں یہ بات بہت نازیبا ہے کہ ہم کسی پر بڑائی ظاہر کریں، اس ضابطہ میں وہ بھی شامل ہیں، جو ہم سے عمر، علم اور مرتبے میں بڑے ہیں، اور وہ بھی داخل ہیں، جن کو عرفاً ہمارے برابر سمجھا تا ہے، اور وہ بھی شامل ہیں جو ہم سے چھوٹے ہیں، یعنی طلبہ واولاد وغیرہ۔ البتہ یہ ہے کہ ہر ایک کے ساتھ تواضع کا رنگ جدا جدا ہوگا۔ لیکن بہر حال اپنے کو جھکا کر رکھنا ہی عبدیت ہے، آدمی کو جب یہ تصور قائم ہو جاتا ہے کہ سب سے چھوٹا میں ہی ہوں ، تو بہت سے رذائل خود بخود دفع ہو جاتے ہیں، تواضع کی ضد کبر ہے، کبر سے غصہ، غیظ وغضب ، جوش انتقام ، ظلم وغیرہ پیدا ہوتے ہیں ، تواضع آجائے تو یہ دشمنانِ دین واخلاق اپنے آپ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں، تواضع ہر حسن خلق کی بنیاد ہے، اور حسن خلق پر اللہ کی رحمت برستی ہے، اور بد خلق سے اللہ کی رحمت دور ہو جاتی ہے، اور ہم کو

مدرسہ میں رہ کر اللہ کی رحمت کی کس قدر ضرورت ہے، وہ محتاج بیان نہیں ہے، یہاں پر ہماری کوئی آمدنی تو ہے نہیں، سوائے اس کے کہ لوگوں کے ذریعے ہماری روزی مہیا کرائیں، اور ہمارے کام کے لئے اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ڈالیں کہ وہ اپنے بچوں کو ہمارے سپرد کر جایا کریں۔ پس جو کچھ ہم کو مل رہا ہے۔ خواہ وہ ہماری معاش ہو، یا ہمارے طلبہ ہوں، یہ سب براہ راست اللہ کی رحمت کا کرشمہ ہے، اس میں ہماری قوت بازو کا کوئی دخل نہیں ہے، جب یہ ہے تو ہم پر قطعی لازم ہے کہ صرف وہی کام کریں، جس سے اللہ کی رحمت برسا کرے، اور ہر اس کام سے دور رہیں، جس سے نزول رحمت میں رکاوٹ ہوتی ہو۔

اور حسد کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی دوسرے کی نعمت کا زوال چاہے، یہ فی الحقیقت اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنا ہے، خواہ دل سے خواہ زبان سے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں کو فلاں نعمت سے کیوں نوازا۔ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنا کس قدر مہلک ہے، کوئی مسلمان اس سے ناواقف نہیں ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ یہ مرض علماء واساتذہ میں بڑا طاقتور ہوتا ہے، اگر ان دونوں دشمنوں سے نجات مل جائے تو مدرسہ کی فضا جنت بن جائے۔

(۲) تعلیم وتدریس ایک ایسا منصب ہے، جو خدا کی طرف سے سونپا جاتا ہے، اس کا عوض اور معاوضہ اللہ کے ذمے ہے، اسی لئے بعض ائمہ کے نزدیک تعلیم پر اجرت لینا سرے سے جائز نہیں ہے، لیکن انسانی کمزوری کو دیکھتے ہوئے، ایک دنیاوی معاوضہ بھی طے کر دیا جاتا ہے، تعلیم کسب معاش ہرگز نہیں ہے، اسی لئے تعلیم وتدریس کا مدار اس ضرورت پر کبھی نہیں رکھنا چاہئے، یہ اہل انتظام کی ذمہ داری ہے کہ بقدر وسعت اس کی تکثیر کا اہتمام کریں، لیکن اساتذہ کو تعلیم تو خالصاً لوجہ اللہ دینی چاہئے، اور اس کے بعد جو کچھ بقدر قُوتِ لَا یَمُوْت مل جائے، اللہ تعالیٰ کا اس پر شکر گزار ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ اپنے خادموں کو کبھی رسوا نہیں کریں گے، مال کی بہتات تو نہیں ہوگی، لیکن واقعی ضروریات بھی کبھی بند نہیں ہوں گی۔ حرص وطمع سے الگ ہو کر بے نیازی کے

ساتھ دین کی خدمت کیجئے، زیادہ دن نہیں گزرے گا کہ دنیا قدموں پر نثار ہونے لگے گی۔ مجھے اس کا خوب تجربہ ہے، مال کی حرص نے علماء کے وقار کو پامال کر رکھا ہے، عوام میں ان کا پانی اتر گیا ہے، اگر یہ مستغنی ہوتے، اپنے فقر وفاقہ پر صبر ورضا کے ساتھ دین کی خدمت کرتے ہوتے تو کسی کی مجال نہ تھی کہ انھیں توہین وذلت کی نگاہ سے دیکھتا۔

(۳) اساتذہ نائب رسول ہیں، اور طلبہ مہمان رسول ہیں، اب یہ سوچئے کہ اگر یہ طالب علم حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے، بلکہ انھیں الگ کر کے خود اپنے بارے میں سوچئے کہ ہم اگر طالب علم بن کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ہم آپ کی طرف سے کیا سلوک پاتے۔ یا ہم آپ سے کیا سلوک چاہتے، رسول اللہ ﷺ کا برتاؤ تو اپنے شاگردوں اور صحابۂ کرام کے ساتھ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے، دنیا جانتی ہے کہ آپ نے ہمیشہ اپنے لوگوں کے ساتھ شفقت کا معاملہ کیا ہے، حضرت انسؓ جنھوں نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت دس سال کی عمر سے کی ہے، نہ جانے کتنا کتنا کام بگڑتا رہا ہوگا، مگر فرماتے ہیں کہ مارنا تو درکنار حضور اکرم ﷺ نے کبھی مجھے ڈانٹا اور گھڑکا تک نہیں، اگر کوئی دانٹتا تو اسے منع کر دیتے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا تھا کہ میرے بعد تمہارے پاس دور دراز سے آدمی علم حاصل کرنے آئیں گے، ان کے سلسلے میں خیر اور بھلائی کی نصیحت کرتا ہوں، اس کو تم قبول کرو، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہئے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، جب اپنے مہمان کا اکرام کرنا ایمان کا تقاضا ہے تو رسول اللہ ﷺ کے مہمانوں کا کس قدر ضروری ہوگا، ان کو ایذا ہوگی، تو رسول اللہ ﷺ کو ایذا ہوگی، اور ان کو راحت ملے گی تو رسول اللہ ﷺ خوش ہوں گے، اس سلسلے میں اساتذہ سے بہت کوتاہیاں ہوتی ہیں، اول تو طلبہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، یہ بدترین جرم ہے، یہ گو بچے ہیں، نادان ہیں، ناواقف ہیں، لیکن دل میں ان کی تحقیر ہرگز نہیں ہونی چاہئے، یہ جس کام کیلئے آئے ہیں، اس نے ان کا مرتبہ بڑھا دیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے

بچوں کے ساتھ جو شفقت کی ہے، ہم جو طلبہ کے ساتھ برتاؤ کریں تو وہی شفقت اس میں جھلکنی چاہئے، ورنہ نیابت چھن جائے گی، نائب رسول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہی کام کیا جائے جو اصل اور منیب کے منشاء کے مطابق ہو، ہمارے بزرگوں نے اس کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ واقعات تو بے شمار ہیں لیکن میں صرف ایک واقعہ تحریر کرتا ہوں، جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارے اکابر طلبہ کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے۔

دیوان عبد الرشید جونپوری قدس سرہٗ سلسلۂ قلندریہ کے بہت بڑے شیخ ہیں اور بہت بڑے عالم بھی، انھوں نے زندگی بھر خانقاہ کے ساتھ مدرسہ کا بھی سلسلہ بھی جاری رکھا، انتقال کے وقت وصیت کی کہ ان کی قبر میں وہ پتھر رکھ دیا جائے جس پر طلبہ اپنے جوتے اتارا کرتے تھے، مجھے اس کی برکت سے نجات کی امید ہے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، خیال فرمایئے ان کے دل میں طالب علم کی کیا وقعت تھی؟ ایک واقعہ اور سن لیجئے! حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ قدس سرہٗ طلبہ کو پڑھا رہے تھے، صحن مسجد میں سبق ہو رہا تھا کہ اچانک بارش شروع ہوگئی، سب طلبہ کتابیں لے کر اندر بھاگے، اندر پہونچ کر تپائیاں درست کر کے دیکھا تو ایک عجیب منظر نظر آیا، وقت کا یہ محدث اعظم، استاذ العلماء، مرجع الخلائق، شیخ طریقت، ولی کامل اپنے طالب علموں کے جوتے اٹھا اٹھا کر سائے میں رکھ رہا ہے کہ وہ بھیگنے نہ پائیں، اللہ اکبر کس قدر تواضع تھی، اور دل میں کیسی طلبہ کی عظمت تھی، یہ نمونے اگر عام ہو جائیں تو ہماری کتنی خرابیاں دور ہو جائیں۔

دوسرے یہ کہ طلبہ سے ان کے تحمل سے زیادہ کام نہ لیا جائے، نہ علم کے سلسلے میں اور نہ خدمت کے سلسلے میں، ان سے کوئی ایسی فرمائش نہ کی جائے جس کو وہ نہ سمجھ سکیں، یا سمجھ لیں تو کرنے میں انھیں دشواری ہو۔ وہ ہمارے غلام نہیں ہیں، عموماً حضرات اساتذہ کو اس کا اہتمام نہیں ہوتا، کبھی طلبہ سے ناصاف گفتگو میں کوئی فرمائش کر دیتے ہیں، وہ اسے سمجھ نہیں پاتے، اور مارے ڈر کے پوچھ نہیں پاتے، اور بعد میں انھیں زجر وتوبیخ اور بعض اوقات ضرب وتنبیہ کا نشانہ بننا پڑتا ہے، یاد رکھئے کہ طلبہ کی

غلطیوں کو آپ معاف کریں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کی غلطیوں کو معاف کریں گے، اور اگر آپ ان کی ہر غلطی پر گرفت کریں گے اور سزا دیں گے تو اللہ تعالیٰ بھی ایسا ہی کریں گے، طلبہ کی تعلیم میں بے حد تحمل ہونا چاہئے، مارنا بالخصوص نابالغ بچوں کو بہت ناپسندیدہ امر ہے، بچوں کو زدوکوب سے نہیں پیار ومحبت سے پڑھانا چاہئے، زدوکوب کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ان کا دل تعلیم سے اچاٹ ہوجاتا ہے، نہ جانے کتنے لوگ اپنے اساتذہ کی مار پیٹ کی وجہ تعلیم سے بھاگ نکلے، اس کا حساب کون دے گا، میں مطلقاً مارنے کا انکار نہیں کرتا، لیکن بقدر ضرورت ہو اور بے تحاشا مارنے کی ضرورت میں تسلیم نہیں کرتا، اور میں کیا، اللہ اور رسول تسلیم نہیں کرتے، ہم انھیں تعلیم دیتے ہیں، اور ثواب کی امید رکھتے ہیں، ہم انھیں مارتے ہیں اور بے تحاشا مارتے ہیں، اور تمام ثواب کو آگ لگا دیتے ہیں، اوپر سے ظلم کا گناہ لادلیتے ہیں، ان بچوں کی طرف سے کوئی ہم سے سوال کرنے والا نہیں ہے۔ یاد رکھئے کہ ان کا وکیل اللہ ہے، اللہ کا رسول ہے، اللہ کے دربار میں اگر رسول نے دعویٰ دائر کردیا تو بچنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی، اگر ہم کو یہ خیال ہو کہ یہ بچے رسول اللہ ﷺ کے مہمان عزیز ہیں تو ہمیں ہرگز جرأت نہ ہوگی کہ ان پر ہاتھ اٹھائیں، اگر کوئی طالب علم ہماری شفقت کے باوجود نہیں پڑھ سکا تو انشاء اللہ ہم سے اس کا مواخذہ نہ ہوگا، اور اگر ہماری سختی اور مار پیٹ کی وجہ سے تعلیم سے ہٹ گیا تو دوہرا مواخذہ ہوگا، ایک بے جا سختی کا، دوسرے اس کی تعلیم کے خراب ہونے کا، اور اساتذہ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ ان کا بے تحاشا پیٹنا کسی ہمدردی کی وجہ سے ہوتا ہے، عموماً ایسا شفائے غیظ کیلئے ہوتا ہے، اس چیز سے میں بہت خطرہ محسوس کرتا ہوں۔

مشہور شاعر علامہ اقبال مرحوم نے مثنوی ''رموزِ بے خودی'' میں اپنے بچپن کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک سائل بھیک مانگتا صدا لگاتا ہوا ان کے دروازے پر آیا، یہ گدائے مبرم یعنی اڑیل فقیر تھا، دروازے سے ٹلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا، اس کے بار بار چیخ کر صدا لگانے پر علامہ اقبال نے طیش میں آکر اسے مارا، اور اس مار پیٹ میں فقیر کی

جھولی میں جو کچھ تھا، زمین پر گر گیا، علامہ کے والد اس حرکت پر بہت آزردہ اور کبیدہ خاطر ہوئے، اور دل گرفتہ ہو کر بیٹے سے کہا کہ قیامت کے دن جب خیر الرسل ﷺ کی امت سرکار کے حضور جمع ہوگی تو یہ گدائے دردمند تمہارے اس برتاؤ کے خلاف حضور رسالت مآب ﷺ سے فریاد کرے گا، اس وقت

اے صراطت مشکل از بے مرکبی　　من چہ گویم چوں مرا پُرسد نبی
حق جوانے مسلمے باتو سپرد　　کو نصیبے از دبستانم نبرد
درملامت نرم گفتار آں کریم　　من رہین خجلت وامید وبیم
از تو ایں کارِ آساں ہم نشد　　یعنی آں انبارِ گل آدم نشد
اندکے اندیش ویاد آرا اے پسر　　اجتماع امت خیر البشر
باز این ریش سفیدِ من نگر　　لرزہ ٔ امید وبیمِ من نگر
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن　　پیش مولیٰ بندہ را رسوا مکن

☆ یعنی اے اقبال! بغیر سواری کے راستہ قطع کرنا مشکل ہے۔ مجھ سے نبی ﷺ پوچھیں گے، تو میں کیا کہوں گا، ☆ وہ پوچھیں گے کہ حق تعالیٰ نے تم کو ایک جوان مسلمان بیٹا سپرد کیا تھا، لیکن اسے میرے دبستان سے کوئی حصہ نہیں ملا۔ ☆ نبی کریم ﷺ تو نرم گفتاری سے مجھے ملامت کریں گے، لیکن میں شرمندگی اور امید وبیم میں غرق ہوں گا، ☆ تم سے اتنا آسان کام بھی نہ ہو سکا کہ، یعنی مٹی کا ڈھیر تمہاری تربیت میں رہ کر آدمی نہ بن سکا، ☆ میرے بیٹے! ذرا اس وقت کو سوچو تو سہی، جب خیر البشر ﷺ کی امت اکٹھا ہوگی، ☆ پھر میری سفید داڑھی کو دیکھو اور امید وبیم کے درمیان میرے لرزنے کو دیکھو، ☆ باپ کے اوپر یہ نازیبا ظلم مت کرو، مولیٰ کے سامنے اس بندہ کو رسوا مت کرو۔

واقعی معاملہ سخت ہے، یہ بچے اگر کل قیامت کے دن دامن گیر ہوں گے تو جان مشکل میں پڑ جائے گی، ان کے ساتھ طاقت کا استعمال کم سے کم کرنا چاہئے، ہاں! روحانی طاقت، یعنی اخلاق وانسانیت سے زیادہ کام لینا چاہئے، اس سلسلے میں حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی کا قصہ بھی بہت عجیب ہے۔ یہ مولانا فضل حق، ہدیہ سعیدیہ کے مصنف، زبردست عالم ہیں، منطق وفلسفہ اور ادب کے امام ہیں، ان کے والد گرامی مولانا فضل امام صاحب بھی بڑے عالم تھے۔ منطق کی مشہور کتاب ''مرقات'' انھیں کی

تصنیف ہے، طلبہ پر بے حد شفقت فرماتے تھے، ان کے ایک شاگرد مولانا غوث علی شاہ تھے، بڑے آزاد مزاج اور دنیا جہاں کے سیاح! وہ بیان کرتے ہیں کہ جب ہم رامپور گئے تو مولانا فضل حق صاحب سے ملاقات ہوئی، ایک روز پچھلی باتوں کا ذکر آگیا، اپنے والد بزرگوار (مولانا فضل امام صاحب) کو یاد کرکے روتے رہے، ہم نے کہا، مولوی صاحب، آپ کو وہ دن بھی یاد ہے کہ مولوی صاحب نے تھپڑ مارا تھا اور آپ کی دستارِ فضیلت دور جاگری تھی، ہنسنے لگے اور فرمایا کہ خوب یاد ہے، وہ عجیب زمانہ تھا، اور وہ قصہ اس طرح تھا کہ مولانا فضل امام صاحب نے ایک طالب علم سے فرمایا کہ جاؤ فضل حق سے سبق پڑھ لو، وہ تھا غریب آدمی، بدصورت، عمر زیادہ علم کم، ذہن کند، یہ نازک طبع، ناز پروردہ، جمال صورت و معنیٰ سے آراستہ، چودہ برس کا سن وسال، نئ فضیلت، ذہن میں جودت، بھلا میل ملے تو کیسے ملے، اور صحبت راس آئے تو کیوں کر آئے، تھوڑا سبق پڑھا تھا کہ بگڑ گئے، جھٹ اس کی کتاب پھینک دی، اور برا بھلا کہہ کر نکال دیا، وہ روتا ہوا مولانا فضل امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اور سارا حال بیان فرمایا، فرمایا: بلاؤ اس خبیث کو، مولوی فضل حق صاحب آئے اور دست بستہ کھڑے ہوگئے، مولانا صاحب نے ایک تھپڑ دیا اور ایسے زور سے دیا کہ ان کی دستار فضیلت دور جا پڑی اور فرمانے لگے، تو ظالم عمر بھر بسم اللہ کے گنبد میں رہا، ناز و نعمت میں پرورش پائی، جس کے سامنے کتاب رکھی اس نے خاطر داری سے پڑھایا، طالب علموں کی قدر و منزلت تو کیا جانے، اگر مسافرت کرتا، بھیک مانگتا اور طالب علم بنتا تو حقیقت معلوم ہوتی ارے طالب علمی کی قدر ہم سے پوچھو، خیر بھلا جانو گے، اگر ہمارے طالب علموں کو کچھ کہا، یہ چپ کھڑے روتے رہے، کچھ دم نہیں مارا، خیر قصہ رفع دفع ہوا، لیکن پھر کسی طالب علم کو کچھ نہیں کہا۔ میرا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو بچوں کے ساتھ شفقت و محبت کا برتاؤ کیا جائے، انھیں خوفزدہ نہ کیا جائے، نہ جانے ان میں کل کون کیا ہونے والا ہے، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ایک استاذ نے طالب علمی کے زمانہ

میں انھیں تھپڑ رسید کیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد کسی نے دیکھا کہ ان کا وہ ہاتھ سوکھا ہوا ہے، دریافت کرنے پر انھوں نے بتلایا کہ عبدالقادر کو اس ہاتھ سے تھپڑ مارا تھا، اس کی یہ سزا ملی ہے۔ اس نے شیخ سے جا کر عرض کیا، شیخ ان کی قبر پر تشریف لے گئے، اور بارگاہ الٰہی میں بہت کچھ مناجات کی، جب ان پر سے یہ سزا ہٹی، بچپن میں بسا اوقات اندازہ نہیں ہوتا کہ کل اس طالب علم کا کیا رتبہ ہوگا، یہاں بہت احتیاط کرنے کی ضرورت ہے، بات ذرا لمبی ہوگئی، لیکن دیکھتا ہوں کہ حضرات اساتذہ اس باب میں بے اعتدالی کا شکار ہو جاتے ہیں، اسی لئے ذرا تفصیل کے ساتھ عرض کر دیا اور بعض لوگ تعلیم وتربیت کے حق میں دوسری کوتاہی کرتے ہیں، وہ یہ کہ طلبہ سبق یاد کریں یا نہ کریں، نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں، اخلاق خواہ ان کے کیسے ہی ہوں، وہ سرے سے روک ٹوک کرتے ہی نہیں، یہ بھی غلط ہے، انھیں اپنی اولاد کی طرح پالنا پوسنا چاہئے، ان سے غلطی ہو رہی ہو تو روکنا چاہئے اور بار بار چاہئے، یہ نہیں کہ ایک دو مرتبہ روکا پھر اکتا گئے، نہیں بلکہ جتنی بار ان سے غلطی ہو اتنی بار ٹوکئے، مگر نرمی سے اور ایسا بھی نہ ہو کہ بالکل پیچھے پڑ جانا محسوس ہو۔ تربیت کا مسئلہ ذرا نازک ہے، تاہم روک ٹوک کرتے رہنا چاہئے، اس سے برائی سمٹتی ہے، اور اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو برائی کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جائے گا، کچھ اور لکھنا چاہتا تھا، مگر یہاں آ کر طبیعت بند ہوگئی، قلم رک گیا، بہت سوچا کہ اور کیا لکھنا چاہئے، مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اب تک بے تکلف لکھا تھا، اب تکلف ہوتا، اس لئے اس تحریر کو ختم کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ حضرات کی شان میں کوئی نازیبا بات میرے قلم سے نکل گئی ہو تو اسے معاف کریں گے، آپ حضرات کیلئے دعا گو ہوں اور دعاؤں کا ملتجی ہوں۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
۱۳/ ذوقعدہ ۱۴۱۶ھ

☆☆☆☆☆

دارالعلوم دیوبند

داخلہ امتحان کے افسوسناک نتائج

ہندوستان کے طول وعرض میں مدارس عربیہ کا ایک وسیع حلقہ ہے، ان میں بیشتر تعداد ان مدارس کی ہے، جن کا فکری وتعلیمی رابطہ دارالعلوم دیوبند سے ہے، ان مدارس سے طلبہ ایک متعین معیار تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد تکمیل کیلئے دارالعلوم دیوبند حاضر ہوتے ہیں، دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں ام المدارس ہے، دارالعلوم دیوبند کی بنیادوں میں جس قدر تقویٰ کا نور، للّٰہیت کا حسن، خداترسی کی پاکیزگی، علم وعمل کی جامعیت، احسان وسلوک کا جمال، اعلاء کلمۃ اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کا جلال، درس وتدریس کے برکات، علوم نبوت کے انوار اور زہد وعبادت کے آثار جذب ہیں، اس کا اثر یہ ہے کہ طلبہ وعلماء کے قلوب بے اختیار اس کی طرف کھنچتے ہیں ہندوستان کے کسی گوشے کا طالب علم ہو وہ اپنے تصور میں دارالعلوم دیوبند کو بسائے رکھتا ہے۔ وہ دارالعلوم سے مربوط دوسرے مدارس میں تعلیم حاصل کرتا ہے، لیکن تکمیل کا خاکہ اس کے ذہن میں دارالعلوم ہی سے وابستہ ہوتا ہے، چنانچہ شعبان آتے ہی طلبہ کھنچ کھنچ کر دیوبند روانہ ہونے لگتے ہیں۔ داخلہ شوال میں ہوتا ہے لیکن امتحان داخلہ میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے وہ اپنا گھر بار چھوڑ کر دارالعلوم ہی کی ڈیوڑھی پر حاضر ہوجاتے ہیں۔ بہت سے طلبہ اپنی اپنی جگہ رہ کر امتحان کی تیاری کرتے ہیں۔

شوال میں ایک بڑی تعداد داخلہ کے امیدواروں کی دارالعلوم پہونچ جاتی ہے، عموماً طلبہ تکمیل کی آخری دو جماعتوں میں داخلہ کے لئے پہونچتے ہیں، داخلہ کے

امتحانات تحریری ہوتے ہیں، یہ وقت طلبہ کیلئے بڑی کشمکش کا ہوتا ہے، وہ بڑی امیدوں کے ساتھ ہزاروں روپئے مجموعی اعتبار سے خرچ کر کے دار العلوم میں سعادت سمجھ کر داخلہ کے لئے حاضر ہوتے ہیں، لیکن امتحان میں کامیاب ہونے والے کتنے ہوتے ہیں؟ اس سلسلے میں ماہنامہ دار العلوم دیوبند کے شمارہ مارچ ۱۹۹۶ء کے حرف آغاز میں جو رپورٹ دی گئی ہے وہ خاصی چونکا دینے والی ہے، اور ان مدارس کے لئے ایک زبردست لمحۂ فکریہ ہے، جو اپنے یہاں سے تیار کر کے طلبہ کو دار العلوم بھیجتے ہیں، لکھتے ہیں:

> ''صورت حال یہ ہے کہ امتحانات داخلہ کے لئے مرتب کئے گئے سوالات کے پرچے، دار العلوم دیوبند کے سالانہ امتحانات کے معیار کے مقابلہ میں آسان ہوتے ہیں، ابتدائی درجات ہی نہیں بلکہ اونچی جماعتوں کے پرچوں میں بھی یہ رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ لیکن اس سہولت کے باوجود نتائج امید افزا نہیں رہے، سال ہفتم (موقوف علیہ) کے ۸۰۰/امیدواروں میں سے صرف ۲۲۵/امیدوار کامیاب ہوئے، قریب قریب یہی تناسب دوسری جماعتوں کے امیدواروں کا بھی ہے، جس کے نتیجے میں ۳۵۰۰/امیدواروں میں سات آٹھ سو کے درمیان کامیاب رہے۔''

نتائج کی یہ صورتحال خاصی تشویشناک ہے، امتحان کے پرچے دار العلوم کے معیار سے کمتر تھے، اس کے باوجود کامیابی کا تناسب صرف ۲۰/فیصد ہے اور ناکام ہونے والے ۸۰/فیصد۔ اس میں بعض مدارس کا استثناء بھی ہے کہ ان کے امیدوار زیادہ تر کامیاب ہوئے ہیں، لیکن مدارس چونکہ مقصد کے اعتبار سے متحد ہیں، اسلئے اہل مدارس کو اس سلسلے میں نہایت فکرمندی سے غور کرنا چاہئے۔ صرف اس لئے نہیں کہ دار العلوم کے امتحان داخلہ میں طلبہ ناکام ہو رہے ہیں، بلکہ اس لئے کہ اتنی کمزور استعداد کے طلبہ بھی آخر دوسرے مدارس میں جا کر فارغ ہو ہی جاتے ہیں۔ اور یہ بھی عالم کہلاتے ہیں۔ اس سے علم کا معیار کتنا گر جائے گا اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے، علم دین ایک امانت ہے، اس کے حاملین جب اتنے کمزور ہوں گے تو پھر اس کی بقا کی صورت کیا ہوگی؟

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ہمارے مدارس تعلیم اور تربیت دونوں اعتبار سے انحطاط کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ ان مدارس میں ایسی افسردگی اور جمود کا احساس

ہونے لگ گیا ہے، جیسے ان میں روح باقی نہیں رہی، شاید یہ مدارس اساتذہ کے لئے ذریعۂ معاش، طلبہ کیلئے قیام وطعام کی پناہ گاہ اور منتظمین کیلئے چھوٹے پیمانے پر حکومت کا سامان بن کر رہ گئے ہیں۔ مقاصد کے اس انتشار میں اصل روح یعنی تعلیم وتعلم کی فضا مردہ ہو کر رہ گئی ہے، بس پڑھنے پڑھانے کی ایک رسم رہ گئی ہے، طلبہ کو اپنی تعلیم سے جیسا شغف ہونا چاہئے اور اس کیلئے جیسی یکسوئی اور قربانی کی ضرورت ہے، اس کا کہیں پتہ نہیں۔ سبق کی حاضری کا اہتمام نہیں، مطالعہ ومذاکرہ کی پابندیاں ان پر گراں ہیں۔ اکثر طلبہ پر کھیل کود، آرائش وزیبائش، فضول سیر وتفریح کا ذوق غالب ہے، بعض مدارس میں تو یہ حال ہے کہ بس سبق کے وقت کتاب ہاتھ میں لیتے ہیں، اور سبق ختم کر کے کتاب رکھ دیتے ہیں، پھر دوسرے دن اسی وقت کتاب کھلتی ہے، بعض مدارس میں تعلیم صرف صبح کے وقت ہوتی ہے، باقی اوقات طلبہ آزاد ہوتے ہیں، اس طرح ان کا مزاج بالکل فاسد ہو کر رہ جاتا ہے۔ پیسوں کی بہتات ہو گئی ہے، تو دور دراز کے طلبہ بھی ہر وقت گھر جانے یا دوسرے شہروں میں جانے کا پروگرام بناتے رہتے ہیں۔ اور تو اور خود دارالعلوم کے طلبہ کی ایک خاصی تعداد ہر روز دلی یا سہارنپور کی ٹرین یا بس میں بیٹھی سرگرمِ سفر رہتی ہے۔ اب سے پچیس، تیس سال پہلے دور کا طالب علم مدرسہ میں آجاتا تھا تو سالانہ امتحان ہی پر گھر جانے کا منصوبہ بناتا تھا، اور اب تو تعلیم کے دس ماہ میں کم از کم تین مرتبہ گھر جاتا ہے، اور ہر مرتبہ ہفتوں سبق سے غیر حاضر رہتا ہے، ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں اگر ذہن ودماغ غنیمت بھی ہو، جب بھی ٹھوس استعداد نہیں بن سکتی۔ ایسے طلبہ صرف دارالعلوم کے امتحان داخلہ میں نہیں، بلکہ علم کے ہر میدان میں ناکام رہیں گے۔ عجیب بات ہے کہ طالب علم، مدرسہ میں صرف تحصیل علم کیلئے قدم رکھتا ہے، اس کے علاوہ اس کا کوئی اور مقصد نہیں ہوتا، مگر اسی کیلئے اس کو یکسوئی نہیں ہو پاتی۔ باقی دوسرے بہت دھندوں میں مبتلاء رہتا ہے۔ بڑے مدرسوں میں جہاں طلبہ زیادہ رہتے ہیں وہاں تو باقاعدہ کھیل کی ٹیمیں بنی ہوئی ہیں۔ مقابلے ہوتے ہیں۔

دنیا میں جہاں جہاں کھیل ہوتے ہیں، ان کی خبریں معلوم کی جاتی ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن کا بالالتزام مشغلہ ہوتا ہے۔ غرض ہر وہ کام ہوتا ہے جو تعلیم کی یکسوئی کے لئے قطعاً مضر ہوتا ہے۔ اس سلسے میں اہل مدارس کو بطور خاص توجہ دینی چاہئے۔ مدارس میں تعلیمی جدوجہد کا ماحول بنانا چاہئے۔ اس باب میں بڑی ذمہ داری اہل انتظام اور اساتذہ کی ہے۔

مدیر رسالہ دارالعلوم دیوبند مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قاسمی نے حرف آغاز میں ضروری مشورے بھی دیئے ہیں، یہ مشورے بہت قیمتی ہیں اور ان پر عمل درآمد بہت ضروری ہے۔

یہاں چھوٹا منہ بڑی بات کی مثل صادق آئے گی، ورنہ میں عرض کرتا کہ دارلعلوم کے امتحانات داخلہ کا انتظام گو بہت معقول اور قابل قدر ہے، تاہم اس میں کچھ جھول اور کمی محسوس ہوتی ہے، جو طلبہ ذیلی مدارس میں ایک معتد بہ عرصہ گزار کر دیو بند جاتے ہیں، ان کے اساتذہ ان کی صلاحیت واستعداد سے خوب واقف ہوتے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ کسے کامیاب اور کسے ناکام ہونا چاہئے، لیکن اب کی بار جو نتائج سامنے آئے، ان میں حیرتناک بات متعدد اہل مدارس سے سننے میں آئی کہ جس طالب علم کو قطعاً کامیاب ہونا چاہئے تھا، وہ غریب تو رہ گیا، اور جن کے بارے میں داخلہ کا امکان نہ تھا، وہ نہ صرف یہ کہ داخلہ میں کامیاب ہوئے، بلکہ انھیں اچھے نمبرات حاصل ہوئے۔ کہا جا سکتا ہے کہ استثنائی طور پر کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے لیکن جب اس طرح کی مثالیں زیادہ ہو جاتی ہیں، تو احساس ہونے لگتا ہے کہ شاید نظام امتحان میں کچھ جھول ہے، یہ تقصیر امتحان کی کاپیاں جانچنے کے سلسلے میں بھی ہو سکتی ہے، اور امتحان ہال میں طلبہ کی نگرانی کے سلسلے سے بھی ہو سکتی ہے۔ اربابِ دارالعلوم کو اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہئے۔ (ماہنامہ انوار العلوم، جہانا گنج، اپریل ۱۹۹۶ء)

☆☆☆☆☆

مہتمم دارالعلوم دیوبند

کے نام ایک خط اور ان کا جواب

گزشتہ مضمون میں آپ نے دارالعلوم دیوبند کے امتحان داخلہ کے سلسلے میں مؤلف کے تأثرات ملاحظہ کئے، اسی سے متأثر ہوکر یہ خط مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مدظلہٗ کو لکھا گیا، یہ مکتوب اور حضرت مہتمم صاحب کا جواب دونوں پیش کئے جارہے ہیں۔ مرتب

مخدومنا المکرّم حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم دیوبند! زیدمجدکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاجِ گرامی

یہ حقیر بندہ، دارالعلوم دیوبند کا ادنیٰ منتسب، بہت عرصہ سے جناب والا کی خدمت میں کچھ عرض کرنا چاہتا تھا، لیکن اتنا چھوٹا منہ رکھتا ہے کہ جناب والا کے شایانِ شان اس سے کوئی بات ادا ہو، اس کا تصور بھی نہیں ہوسکتا، اس لئے ہمت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اس سال خصوصیت سے دارالعلوم دیوبند کے امتحانِ داخلہ کے نتائج کچھ ایسے سامنے آئے کہ باوجود کسی لیاقت اور استحقاق کے نہ ہونے کے کچھ عرض ومعروض کرنے کی ہمت ہو چلی تھی، اسی دوران رسالہ دارالعلوم دیوبند کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ اس کے حرفِ آغاز نے مزید تحریک پیدا کی، اور ہمت دلائی، اس لئے چند باتیں خدمت میں عرض کرنے کی جرأت کررہا ہوں، یہ کسی معاند کی عیب چینی یا کسی ناتجربہ کار کی اٹکل پچو باتیں نہیں ہیں، اور نہ کسی مدعی کی لاف وگزاف ہے، کہ اسے ناقابل اعتنا سمجھا جائے۔ اس لئے بجا طور پر مجھے امید ہے کہ ان معروضات پر ضرور غور

فرمائیں گے۔

یہ حقیر تقریباً ۲۵ ر سال سے علم دین کی خدمت میں لگا ہوا ہے، اور تدریس سے وابستہ ہے، اور ہر سال بلا انقطاع طلبہ کو تیار کر کے درجۂ ہفتم کیلئے بھیجتا ہے، اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میرے پڑھائے ہوئے طلبہ تقریباً نوے، پچانوے فیصد دارالعلوم سے کامیاب ہو کر نکلے ہیں، اور یہ بھی اللہ کا شکر ہے کہ ان میں تقریباً اسی تناسب سے علم دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ اتنے تجربہ کے بعد اگر میں کچھ عرض کروں، تو انشاء اللہ بات بیجا نہ ہوگی۔

(۱)............سب سے پہلے مجھے امتحانِ داخلہ کے بارے کچھ عرض کرنا ہے، دارالعلوم دیوبند میں پہلے امتحانِ داخلہ تقریری ہوا کرتا تھا، بعد میں اسے موقوف کر کے امتحانِ داخلہ تحریری کر دیا گیا، اور یہ خیال کیا گیا کہ امتحان تقریری کی صورت میں، بعض خرابیاں داخلہ کے سلسلے میں راہ پا جاتی تھیں، ان کا اس سے انسداد ہو جائے گا، اور بہت کچھ انسداد ہوا بھی، اس سلسلے میں دارالعلوم میں بہت سے احتیاطی اقدامات کئے گئے تاہم کچھ نہ کچھ کمی کوتاہی کا رہ جانا فطری امر ہے۔ لیکن امتحان کے نتائج جب سامنے آتے ہیں، تو بعض چیزیں بہت زیادہ قابل توجہ معلوم ہوتی ہیں، اور اس سال اس کا احساس زیادہ شدت سے ہوا۔ ہم لوگ کئی کئی سال تک طلبہ کو پڑھا کر بھیجتے ہیں۔ ان کی استعداد سے بخوبی واقف ہوتے ہیں، سالہاسال کے امتحانات کے ریکارڈ ہمارے سامنے ہوتے ہیں۔ ہم لوگوں کے توقعات کے خلاف جب ان کے نتائج آتے ہیں، تو اچنبھا ہوتا ہے، کہ ایک طالب علم کو ہم جانتے ہیں کہ پڑھنے میں اچھا ہے، امتحان کا پرچہ بھی اچھا لکھتا ہے، لیکن نتیجہ نکلا تو معلوم ہوا کہ فیل ہے، یا تقابل میں گر گیا، اور بعض دوسرے، جن کو محض ان کے شوق کی بنا پر دارالعلوم بھیج دیا جاتا ہے، وہ داخلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اگر اس طرح کے واقعات استثنائی ہوں، تو زیادہ قابلِ التفات نہیں ہوتے، لیکن جب معاملہ اس سے آگے بڑھ جاتا ہے، تو خیال ہوتا

ہے کہ امتحان کے نظام میں کچھ خلل ضرور ہے، جس کی اصلاح ضروری ہے۔

اس سال کی بات عرض کروں کہ میرے مدرسہ سے ۱۵/ طالب علم دارالعلوم میں ہفتم کے امتحانِ داخلہ میں شریک ہوئے، جن میں چار کی استعداد عمدہ ہے، اور پانچ کی استعداد کمزور ہے، اور باقی متوسط ہیں۔ جن کی استعداد کمزور ہے ان میں سے چار کا داخلہ دارالعلوم میں ہوگیا۔ اور شاید چاروں کا امدادی داخلہ ہے۔ چار جیدالاستعداد طلبہ میں ایک کا امدادی داخلہ ہوا، دو کا غیر امدادی، اور ایک کا ہوا ہی نہیں، بعد میں کسی استاذ کی سفارش سے ہوا۔ متوسط طلبہ میں تین کا داخلہ نہیں ہوا، باقی کا کچھ کا امدادی اور کچھ کا غیر امدادی ہوگیا۔ یہ تو میرے مدرسہ کا حال ہے، قریب پاس کے دوسرے مدارس مثلاً مدرسہ منبع العلوم خیر آباد، اور مدرسہ انوارالعلوم جہانا گنج کے بارے میں بھی یہی معلوم ہوا کہ جن طالب علموں کے داخلہ کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی ان کا داخلہ ہوگیا، اور اچھے طلبہ رہ گئے، اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہفتم میں داخلہ کیلئے ایک ایسے مدرسہ سے اس سال کثیر تعداد میں طلبہ گئے، جہاں جلالین شریف نہیں پڑھائی جاتی ہے، اور یوں بھی وہاں کا معیار تعلیم کچھ زیادہ بلند نہیں ہے، اس کے باوجود وہاں کے طلبہ کی کامیابی کا تناسب غالباً ہر جگہ سے زائد تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ جو طلبہ باقاعدہ ہر کتاب پڑھ کر گئے۔ انھوں نے محنت بھی خوب کی، میں جانتا ہوں کہ دارالعلوم جانے والے طلبہ رمضان کس طرح محنت میں گزارتے ہیں۔ خود میرے پاس محنت کرنے والوں کی ایک جماعت پورے ماہِ مبارک میں مقیم رہتی ہے۔ مگر یہ تو رہ جائیں، اور جنھوں نے جلالین شریف پڑھی نہیں اور پڑھی تو چند پاروں سے آگے نہیں بڑھے۔ وہ کامیاب ہوجائیں۔

اس صورت حال سے اندیشہ ہوتا ہے کہ کچھ کمی ضرور ہے، اس سال خصوصیت سے مجھے دو باتوں کا احتمال ہورہا ہے جن کے اہتمام میں کمی ہوئی ہے، یا اہتمام کے باوجود اس پر قابو نہیں پایا جاسکا۔ اول یہ کہ امتحان ہال میں شریکِ امتحان طلبہ کی نگرانی اچھی طرح نہیں ہوئی۔ نگرانی میں تساہل کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ کمزور طلبہ جن کا سہارا

نقل بازی ہوتی ہے، وہ تو اپنا فن آزماتے ہیں اور کامیاب ہو جاتے ہیں اور دوسرے طلبہ جو نقل سے احتراز کرتے ہیں وہ پیچھے رہ جاتے ہیں، دوسری بات غالباً یہ ہوئی ہے کہ............اور اسی کا اندیشہ مجھے زیادہ ہے............امتحان کی کاپیاں باقاعدہ غور سے پڑھی نہیں گئیں، آج کل اساتذۂ دارالعلوم نے خوش خطی کو زیادہ اہمیت دے رکھی ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ جو طالب علم خوشخط رہے ہیں۔ خواہ ان کا جواب کسی لائق رہا ہو، کامیاب ہو گئے۔ اور جن کا خط کمزور رہا۔ وہ ناکام ہو گئے۔ پھر یہ کہ کاپیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ شاید آغازِ کار میں ذرا اہتمام سے دیکھ لیتے ہوں۔ اس کے بعد سرسری طور پر نمبر لگا دیا جاتا ہو۔ ہم لوگوں میں کام کرنے کا نہیں کام ٹالنے کا مزاج بنتا جا رہا ہے۔ مجھ کو احساس ہو رہا ہے کہ یہ دونوں باتیں امتحان کے نظام کو متاثر کر رہی ہیں۔

(۲)............دوسرے یہ معلوم ہوا کہ ہے کہ امتحان کے نتائج اور تقابل کے سلسلے میں الگ الگ صوبوں کے الگ الگ قانون ہیں۔ کسی صوبہ کے طالبعلموں کو تقابل میں شامل کیا جاتا ہے، کسی صوبے کے طلبہ بغیر تقابل کے لے لئے جاتے ہیں۔ کسی جگہ کے لئے ریزرویشن ہے اور کسی جگہ کے لئے نہیں ہے۔ کہیں کے طلبہ کم نمبر کے باوجود لے لئے جاتے ہیں۔ اور کہیں کے طلبہ زیادہ نمبر کے باوجود رہ جاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایسا کرنے میں کچھ مجبوری ہو، مگر یہ بات انصاف سے بعید ہے، اس امتیازی سلوک کا انجام یہ ہوگا کہ جن مقامات کو آسانی دی گئی ہے وہاں کے بچے کبھی محنت و کاوش نہیں کریں گے، اور محنت کرنے والے دارالعلوم کے داخلے سے محروم رہیں گے تو ان کا دل دکھے گا۔ دارالعلوم میں داخلہ نہ ملنے کی وجہ سے طلبہ پر جو گزرتی ہے، اس سے جناب والا خوب واقف ہوں گے۔ یہ دونوں باتیں دارالعلوم کے حق میں سخت مضر ہیں۔ میرے خیال میں کوٹہ، ریزرویشن اور امتیازی سلوک ختم کر کے تمام طلبہ کو ایک ضابطہ کے تحت رکھا جائے، تا کہ ہر جگہ کے طلبہ محنت کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔

(۳) تیسری بات، دارالعلوم میں طلبہ کی تعطیلات کا مسئلہ خاصا قابل توجہ

ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے، دارالعلوم میں دورانِ تعلیم سوائے عیدالاضحیٰ کے اور کوئی بڑی تعطیل نہیں ہے، لیکن طلبہ ہیں کہ عیدالاضحیٰ پر تو خیر گھر آتے ہی ہیں، اس کے علاوہ ششماہی امتحان اور دوسرے ہنگامی مواقع پر اس طرح دارالعلوم سے باہر آجاتے ہیں جیسے کوئی بڑی تعطیل ہوگئی ہو۔ گزشتہ سال اساتذۂ دارالعلوم بمبئی کے اجلاس میں چلے گئے، تو طلبہ نے اپنے گھروں کا رُخ کرلیا۔ اور عیدالاضحیٰ کی تعطیل کا یہ حال ہے کہ ابھی ذی قعدہ کی رمق باقی رہتی ہے کہ طلبہ اپنے گھروں میں نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر ایک اچھا خاصا وقفہ گزار کر مدرسہ پہونچتے ہیں، جبکہ مدرسہ میں تعلیم ۵/۶ ذی الحجہ تک ہوتی رہتی ہے، پھر جب یہ طلبہ چھٹی کا اعلان کرتے ہوئے، اپنے سابق مدرسوں میں پہونچتے ہیں، تو وہاں بھی تعطیل کی فضا پیدا کردیتے ہیں، اس کے نتیجے میں تعلیم میں کمزوری آجاتی ہے۔ یہ صورت حال علم کیلئے جتنی مضر ہے محتاجِ بیان نہیں، تعطیلات پر کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے، تعطیل کی کثرت سے محنت ومشقت کا جذبہ سرد پڑجاتا ہے۔ اور علم کی ناقدری ہوتی ہے۔

اسی طرح یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ تعلیم ہورہی ہے، اور طلبہ میرٹھ، دلی اور سہارن پور کا سفر کررہے ہیں، کہیں جلسہ یا مشاعرہ ہے وہاں بھاگے جارہے ہیں، اس کے نتیجے میں بعض ناگہانی حادثات ہوچکے ہیں اور اس طرح پڑھنے پڑھانے کا ماحول بالکل نہیں بن پاتا، وہ طلبہ جو ہم لوگوں کی نگرانی میں خاصی محنت کرچکے ہوتے ہیں، دارالعلوم میں پہونچ کر ان کا دل اچاٹ سا ہوجاتا ہے، اس ماحول کی اصلاح ضروری ہے۔ گو یہ عمل خاصا وقت طلب ہے لیکن اس کو کرنا ضروری ہے، اس کیلئے کیا طریقۂ کار اختیار کیا جائے، آپ حضرات وہاں کے ماحول کے لحاظ سے زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہیں تاہم ضرورت ہوگی تو مناسب مشورے دئے جاسکتے ہیں۔ والسلام

اعجاز احمد اعظمی

۸/ ذی الحجہ ۱۴۱۶ھ

حضرت مہتمم صاحب کا جواب

مکرمی محترمی زید مجدکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر وعافیت ہوں گے!

گرامی نامہ نظر نواز ہوا، خوشی ہوئی کہ آپ نے مادر علمی دارالعلوم دیوبند سے تعلق کی بنا پر اہم امور کی طرف توجہ دلائی، جن میں بعض وہ ہیں جن کا ذمہ دارانِ دارالعلوم دیوبند کو خود بھی احساس ہو رہا ہے، اور ان کے سدِ باب کی طرف توجہ کر رہے ہیں۔

امتحانِ داخلہ کے بارے میں نااہل طلبہ کی کامیابی واہل کی ناکامی کی وجوہ کی طرف توجہ دلائی ہے، طلبہ داخلہ کے لئے تین ہزار سے زائد آئے، مسجدِ جدید کے تہ خانہ اور بالائی منزل کے کچھ حصہ میں امتحان کا نظم کیا گیا تھا، پوری مسجد میں نظم نہیں ہوسکتا تھا، کیونکہ پنجوقتہ نماز ہوتی ہے (کثیر تعداد میں نمازی ہوتے ہیں) اس لئے سیٹوں میں زیادہ فاصلہ نہیں دیا جاسکا، اور نگرانی بھی اتنے بڑے مجمع کی پورے طور سے نہ ہوسکی۔

دوسرے یہ کہ پرچہ بینی کے سلسلے میں اساتذہ کرام سے کثیر تعداد میں پرچوں کی بنا پر کماحقہٗ پرچہ بینی میں تساہل ہوا ہو، بہرحال ان امور کے سدِ باب کی طرف آئندہ پوری توجہ دی جائے گی۔ کوڈ سسٹم ہونے کی بنا پر کسی حد تک نظم قابو میں آیا ہے اور جو خامیاں ہیں، ان کو بھی دور کرنے کی آئندہ سال کوشش کی جائے گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔ بعض صوبہ جات میں رزرویشن اس لئے رکھا گیا ہے کہ ان صوبہ جات میں دینی تعلیم کی طرف رجحان کم ہے، کم تعداد میں طلبہ آتے ہیں، اس لئے وہاں کے طلبہ کو رعایت دی جاتی ہے، اسی طرح تقابلی نمبرات کا معاملہ ہے، بعض مقامات اس سے مستثنیٰ قرار دئے گئے ہیں، مگر یہ مسئلہ انتظامیہ کے زیرِ غور ہے کہ کہ اب اس رعایت کو ختم

ہونا چاہئے۔

تعطیل عید الاضحیٰ کے موقع پر طلبہ کے قبل از وقت جانے اور بعد از وقت آنے پر پابندی عائد کی جاتی ہے، مگر طلبہ کے پاس پیسے ہیں، کنشیشن فارم معینہ تاریخ سے دئے جاتے ہیں، کچھ طلبہ اس سے قبل پورے ٹکٹ پر چلے جاتے ہیں اور تاخیر سے آتے ہیں، اس مرتبہ اعلان لگا دیا تھا کہ تاریخ مقررہ کے بعد آنے والوں کے کھانے بند کردئے جائیں گے، اور سیٹ کاٹ دی جائے گی، اس کا اثر یہ ہوا کہ تقریباً سبھی طلبہ مقررہ تاریخ پر آگئے، چند ہی باقی رہے ہوں گے، دفتر اہتمام کو مطبخ میں کھانا لینے والوں کی روزانہ رپورٹ سے اندازہ ہوتا رہتا ہے، تین ہزار طلبہ کی تعداد ہے سب پر نظر رکھنا مشکل ہوتا ہے۔

آپ نے ازراہِ تعلق جن خامیوں کے ازالے کی طرف توجہ دلائی ہے، اس کے لئے شکر گزار ہوں، اور آپ کے گرامی نامہ کو جناب ناظم صاحب تعلیمات کے پاس بھیج رہا ہوں، کہ وہ ان خامیوں کے ازالے کی طرف خصوصی توجہ فرمائیں، امید ہے کہ آئندہ بھی مفید مشوروں سے نوازتے رہیں گے، دعا گو ہوں، اور دعاؤں کا طالب، دعوات صالحہ میں یاد فرماتے رہیں۔

والسلام

مرغوب الرحمٰن عفی عنہ
مہتمم دارالعلوم دیوبند
۲؍محرم الحرام ۱۴۱۷ھ

☆☆☆☆☆

مدارس کا ماتم (۱)

ایک ہندی مثل ہے،

ان نینن کا یہی بسیکھ وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

''تذکرۃ الرشید'' میں سرگروہ علمائے حق، امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی قدس سرہٗ کی طالب علمی کے متعلق پڑھا تھا کہ دلی میں وہ اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ اپنے استاذ مولانا مملوک العلی نانوتویؒ سے منطق کی مشہور کتاب ''سلم العلوم'' پڑھ رہے تھے۔ اس کا سبق صرف جمعہ کو ہوتا تھا کہ اوراوقات اور ایام میں دوسرے اسباق تھے، ایک جمعہ کو مولانا پڑھانے بیٹھے ہی تھے کہ ایک بزرگ سیدھے سادھے تشریف لائے، مولانا نے فرمایا کہ لو بھائی! حاجی میاں آگئے، آج سبق نہیں ہوگا۔ دونوں طالب علموں کو سبق کا ناغہ بہت گراں گزرا، اس کے بعد بھی کسی جمعہ کو وہی صاحب تشریف لے آئے، استاذ نے پھر ان کی وجہ سے سبق موقوف کردیا۔ مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا یہ عجیب بزرگ ہیں۔ ان کیوجہ سے ہمارے سبق کا ناغہ ہوجاتا ہے۔ یہ بزرگ حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی نوراللہ مرقدہٗ تھے، اور یہ دونوں طلباء بعد میں انھیں کے مرید اور خلیفہ ہوئے۔

لیکن سبق کا اتنا اہتمام تھا کہ ان کی بزرگی کے ادب واحترام کے باوجود ناغہ کی گرانی کو چھپا نہ سکے، ایک منظر یہ تھا۔

اب دوسرا منظر دیکھئے! ایک بڑے عربی مدرسہ کے اساتذہ، اپنے مہتمم سے فرمائش کرتے ہیں کہ، مدرسہ میں تعلیم دووقت ہوتی ہے، فلاں فلاں مدرسوں میں چونکہ

ایک ہی وقت ہوتی ہے، اس لئے یہاں بھی تعلیم ایک ہی وقت ہونی چاہئے۔ عربی مدارس جہاں طلبہ کے لئے اقامت گاہیں ہیں، اور باہر کے طلبہ چوبیس گھنٹے وہاں مقیم رہتے ہیں، ایسے مدرسوں میں ایک وقت کی تعلیم، ان کی تعلیم وتربیت کے لئے کس درجہ مضر ہے محتاجِ بیان نہیں ہے، لیکن جو مدارس گورنمنٹ کے وظیفہ خوار ہیں، وہاں یہ بلا چل پڑی ہے کیونکہ سرکاری ملازمت میں تبدیل ہوجانے کے بعد مدارس عربیہ میں کسی تقدس، پاکیزگی اور تقویٰ وطہارت کے باقی رہنے کا تو سوال باقی ہی نہیں رہ جاتا، جو مدارس سرکاری وظیفوں کی نجاست سے پاک ہیں، ان میں اس تقدس وطہارت کے تصور کی گنجائش ہے لیکن ماحول جب زہریلا ہوجاتا ہے تو صحت منداجسام بھی متأثر ہونے لگتے ہیں۔ سرکاری وظیفہ خوار مدارس کی نقالی میں، مذکورہ بالا مدرسے کے مدرسین نے بھی ایک وقت کی تعلیم کا نعرہ بلند کیا، مہتمم نے مدرسہ کی تعلیم اور طلبہ کی مصلحت اور اپنے اکابر کے طرزِ عمل پر نظر کرتے ہوئے اس سے معذرت کردی، اس کی بھنک طلبہ کو لگ گئی۔ اب اللہ جانے وہ خود سے یا کسی کے ورغلانے سے اس مطالبہ کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے، کہ ہاں ایک وقت تعلیم ہونی چاہئے، اور یہ قصہ اتنا بڑھا کہ مہتمم اور مجلس شوریٰ کو گھٹنے ٹیک دینے پڑے اور مدرسہ کی تعلیم ایک وقت ہوگئی۔

ایک رنگ وہ تھا، ایک رنگ یہ ہے، کتنا فرق ہوگیا ہے۔

ایک طالب علم جو اپنے وطن، اپنے گھربار، اپنے والدین واہل خاندان کو چھوڑ کر صرف اس لئے نکلتا ہے کہ اسے علم حاصل کرنا ہے، یعنی علم دین حاصل کرنا ہے، جس سے اللہ کے احکام، حلال وحرام، فرائض وواجبات، اللہ کی مرضی ونامرضی اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت وسنت کے معلومات کا راستہ کھلے گا۔ جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوں گے۔ فرشتے اس کے قدموں کے نیچے اپنے پَر بچھائیں گے۔ دنیا کی ساری مخلوق حتیٰ کہ سمندر کی مچھلیاں تک اس کیلئے دعاء کریں گی، پھر مدرسہ میں آکر اس پر کوئی انتظامی ذمہ داری نہیں ہوتی، خورد ونوش کا کوئی دردِ سر نہیں ہوتا۔ اسے صرف پڑھنا ہے، وہ

طالب علم کہے کہ میں صرف ایک وقت پڑھوں گا۔ ظہر کے بعد سے کل صبح تک میرا وقت خالی رہنا چاہئے، تاکہ میں آزادی کے ساتھ پڑھنے کے علاوہ جو چاہوں کرسکوں۔ کس قدر ماتم کی چیز ہے۔ یہ طالب علم اگر اس پر واویلا مچائے کہ میرا سبق کم ہوتا ہے، جمعرات کو ایک وقت کی چھٹی کی وجہ سے کتابیں کم ہوتی ہیں۔ سالانہ تعطیل دو ماہ ہونے کہ وجہ سے پڑھائی کا نقصان ہوتا ہے، اس لئے ان چھٹیوں کو بند کیا جائے، اگر طالب علموں کی طرف سے یہ مطالبہ ہو، تو یہ ان کے مزاج اور مقصد سے میل کھانے والی چیز ہے، لیکن یہ کہ فلاں فلاں چھٹیاں ہونی چاہئیں، ایک وقت کی تعلیم ہونی چاہئے، تو یہ الٹی چال ہے، جس میں آدمی اپنے مقصد کی ناکامی کو خود اپنے ہاتھوں بلاتا ہے۔

کوئی ایسا تاجر، کوئی ایسا کاریگر، کوئی ایسا ملازم جو اپنے مقصد کے خلاف رویہ اختیار کرے جس سے اس کی تجارت کو، اس کی صنعت کو، اس کی ملازمت کو نقصان پہونچے، تو اس کو کیا کہا جائے گا؟ اور کون تاجر یا کاریگر یا ملازم ایسا رویہ اپنائے گا، لیکن افسوس وہ جماعت جو علم وعقل کے راستے پر براہ راست چلنے کی مدعی ہے، اس سے کیسی بے علمی اور بے عقلی کی بات صادر ہو رہی ہے، اور اسے حس نہیں ہے کہ، جس شاخ پر وہ بیٹھی ہے، اسی کو کاٹ رہی ہے۔

ارے طالب علمو! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تمہیں یاد نہیں ہے، کہ علم کے تقاضے کیا ہیں، اس کیلئے کیسی محنت وکاوش درکار ہے۔ تم مدارس میں کیا اس لئے آئے ہو کہ پڑھنا لکھنا بالائے طاق رکھ کر بازاروں، اسٹیشنوں اور پلیٹ فارموں پر مٹر گشتی کرو، تم مہمانِ رسول بن کر آئے ہو، اور نائب رسول بن کر تم کو مدارس سے نکلنا ہے، کیا رسول کے مہمان ایسے ہی ہوتے ہیں کہ رسول کے طریقے کو پامال کریں۔ اور غیروں کے طرز وطور کو اپنائیں؟ میں پوچھتا ہوں کہ صبح سے دوپہر تک تم نے اسباق پڑھے، پھر اس کے بعد سے کیا کرو گے؟ تمہارے موجودہ حالات بتاتے ہیں کہ تم نہ کتاب کی طرف رُخ کرو گے اور نہ اس کی فکر کرو گے، تم نے اپنے آپ کو گنوا دیا ہے، تم ان جگہوں پر دکھائی

دیتے ہو، جہاں تم کو کبھی نہیں دکھائی دینا چاہئے اور جہاں ہمیشہ صف اول میں رہنا چاہئے، وہاں سے غائب رہتے ہو، یا پچھڑے رہتے ہو، تمہاری جو کچھ عزت ہے وہ اللہ ورسول کے علم کی وجہ سے ہے، ساری قوم مدارس میں اپنی کمائی کی رقم صرف اس لئے بھیجتی ہے کہ تم اللہ کا علم حاصل کررہے ہو، رسول کی سنت سیکھ رہے ہو، لیکن اس علم سے جب ایسی بے رغبتی اور بے اعتنائی تمہاری طرف سے وجود میں آئے گی تو اس سے بڑھ کر بے وفائی کی مثال ڈھونڈھے سے نہیں ملے گی۔

اور میں ان اساتذہ کی خدمت میں کیا عرض کروں، جنھیں علم اور تعلیم کا نمونہ بننا تھا، جن کی زندگیوں کی چمک سے اسلام کو رونق ہونی تھی، طلبہ ان سے سبق سیکھتے! اب ان کے سارے مسائل سمٹ کر صرف مال میں آگئے ہیں، مال کی چرخی پر سب گھوم رہے ہیں، بڑا دردناک حال ہے، چھوٹے بڑوں کی نقالی کرتے ہیں۔ طلبہ اساتذہ کے نقش قدم پر چلتے ہیں، ہمارے اساتذہ کی راہ بدل گئی۔ اب ''یاد اللہ'' کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ ہے تو صرف تنخواہ کا۔ ہمارے عربی مدارس کہاں جاکر دم توڑیں گے؟ انھیں بگاڑنے کیلئے نہ حکومت نہ اربابِ حکومت، خود اربابِ مدرسہ اپنی حرکتوں سے مصائب کو دعوت دیتے ہیں۔

مقصد کی تبدیلی کی وجہ سے علم دین کا تقدس اور احترام ذہنوں سے محو ہوگیا ہے، ایک دور وہ تھا کہ قرآن وحدیث کی تعلیم پر اجرت لینی اساتذہ کو گوارا نہ تھی۔ مشہور تابعی حضرت مجاہدؒ کا بیان ہے کہ میں عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؓ کے پاس سونا لایا، تو انھوں نے اس کے بارے طرح طرح کے سوالات کرکے واپس کردیا، اور کہا کہ شاید تم تعلیم کی اجرت دینا چاہتے ہو، ابوعبدالرحمٰن سلمیؒ کی خدمت عمرو بن حریث نے کچھ چیزیں اس لئے بھیجیں کہ وہ ان کے بچوں کو تعلیم دیتے تھے تو ابوعبدالرحمٰن سلمی نے یہ کہہ کر واپس کردیا کہ تم ان کو لے جاؤ ہم اللہ کی کتاب کی تعلیم پر اجرت نہیں لیتے۔

(مآثر ومعارف، مؤلفہ قاضی اطہر مبارکپوریؒ، ص: ۱۲۲، بحوالہ طبقات ابن سعد)

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ دارالعلوم دیوبند سے تھوڑی سی تنخواہ پاتے تھے، تو بسا اوقات اس کا حوالہ دیکر روتے تھے، اور فرماتے تھے کہ میں تو دنیا دار ہوں، حدیث پڑھا کر اتنی اتنی تنخواہ لیتا ہوں۔ محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی نور اللہ مرقدہٗ نے کچھ عرصہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں حدیث کا درس دیا، وہاں یہ درس انھوں نے حسبۃً للہ دیا تھا، بعد میں جب یہ سلسلہ موقوف ہو گیا، تو کچھ عرصہ کے بعد حضرات ندوہ کو معلوم ہوا کہ حضرت معاشی تنگی سے دوچار ہیں۔ انھوں نے اتنے دنوں کی معقول تنخواہ حساب لگا کر حضرت کی خدمت میں بھیجی۔ حضرت اس وقت ضرورت مند تھے، لیکن یہ کہہ کر پوری رقم واپس کردی کہ میں نے پڑھانے میں یہ نیت کی تھی کہ محض اللہ کے واسطے پڑھاؤں گا۔

کچھ نمونے یہ ہیں، اور دوسرا منظر یہ ہے کہ تنخواہ کی ’’جوع البقر‘‘ مسلط ہے۔ گویا عام دنیا داروں کی طرح اہل علم نے بھی اپنی اور اپنے خاندان و اولاد کی روزی اور معیشت کا ذمہ دار خود کو قرار دے لیا ہے اور بھول گئے ہیں کہ روزی اور معیشت کا سرا کہیں اور سے جڑا ہوا ہے۔ بس اور کیا عرض کروں۔

ان نینن کا یہی بسیکھ وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

فإلى الله المشتكىٰ

☆☆☆☆☆

مدارس کا ماتم (۲)

ہم نے پچھلے شمارے میں کچھ باتیں دینی مدارس اور ان کے اساتذۂ وطلبہ کے متعلق عرض کی تھیں، ان میں ضمناً ان مدارس کا تذکرہ بھی آ گیا تھا، جو حکومت سے امداد لیتے ہیں، اور ان میں کام کرنے والے اساتذۂ وملازمین حکومت سے تنخواہ پاتے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ ایسے بعض مدارس کے کچھ حضرات مدرسین نے بہت ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے۔

بے شک انھیں ناراض ہونے کا حق حاصل ہے، لیکن ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ ناراض ہونے سے پہلے سوچیں کہ کیا جو بات اس مضمون میں لکھی گئی ہے، وہ یکسر غلط ہے؟ وہ ناراض ہونے والے حضرات بحمد اللہ علماء دین ہیں۔ علم دین انھیں بتاتا ہے کہ صحیح کیا ہے؟ اور غلط کیا ہے؟ اور اللہ کا فضل ہے کہ ابھی بے حسی اتنی عام نہیں ہوئی ہے کہ دل سے غلط اور صحیح کا احساس جاتا رہا ہو، میں نے عرض کیا تھا کہ:

> ’’سرکاری ملازمت میں تبدیل ہوجانے کے بعد مدارس عربیہ میں کسی تقدس، پاکیزگی اور تقویٰ وطہارت کے باقی رہنے کا تو سوال باقی ہی نہیں رہ جاتا‘‘

کیا یہ بات غلط ہے؟ میں بھی مدرسہ ہی کا ایک فرد ہوں۔ میرا سابقہ زیادہ تر مدارس اور اہل مدارس ہی سے رہتا ہے۔ میں اپنے ناراض ہونے والے دوستوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ اپنی نجی مجالس میں مذکورہ باتیں خود نہیں بیان کرتے؟ اور کیا وہ نہیں جانتے کہ سرکاری امداد لینے کیلئے متعلقہ محکموں کی کتنی ناز برداریاں، کتنی منہ بھرائیاں اور کتنی زرنوازیاں کرنی پڑتی ہیں۔ اس کے علاوہ فرضی کاروائیوں، فارم کی بے سروپا خانہ

پُر یوں کی تو کوئی حد نہیں رہتی ۔ یہ بے بنیاد کاروائیاں حکومتی دفاتر واعمال کا شاید مقدر بن چکی ہیں۔ اس کیلئے جاہل وعالم اور دنیاوی یونیورسٹیوں اور دینی درسگاہوں کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہا ہے۔

حکومت کے ساتھ مدارس کی وابستگی آج کوئی نئی بات نہیں ہے، اور اس کے اثراتِ بد بھی کچھ نئے نہیں ہیں جن کا انکشاف کیا گیا ہو۔ درحقیقت یہ ایک سازش ہے، تا کہ مسلمان اپنے دین ومذہب کا نام بھی لیتے رہیں، اور اس سے دور بھی ہوتے رہیں، ہر روز اس سازش کے نئے برگ وبار نکلتے رہتے ہیں ۔ ابھی حال میں گورنمنٹ نے پرائمری اسکولوں کے بچوں کے لئے ماہانہ کچھ نقد اور کچھ غلہ کی امداد جاری کی ہے، اس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ مسلمانوں کے وہ بچے جو دینی مکاتب میں تعلیم حاصل کرتے تھے، اور اپنی بنیادی تعلیم کے ساتھ ضروری مقدار میں ہندی، حساب وغیرہ کا علم بھی سیکھ لیتے تھے، اب ان بچوں کے سرپرست مال کی حرص میں دینی مکاتب سے اپنے بچوں کو اٹھا کر سرکاری پرائمری اسکولوں میں بٹھا رہے ہیں ۔ وہاں جا کر ظاہر ہے کہ بچے دینی تعلیم سے بالکل محروم ہو کر رہ جائیں گے، یہ واقعہ ہو چکا ہے۔ اس واقعی کی سنگینی کیا عرض کروں؟ یہ بچے دین سے کس درجہ ناواقف ہوں گے محتاج بیان نہیں،

ہمارے اسلاف نے مدارس اور علماء کی درباروں اور حکومتوں سے وابستگی کو کبھی پسند نہیں کیا ہے ، اس سلسلے میں علامہ ابن رجب حنبلی نے حدیث مشہور **’’ماذئبان جائعان‘‘ الخ** کی شرح میں خاصی تفصیل ذکر کی ہے۔ اس کا ترجمہ خاکسار نے ’’دینداری کے دو دشمن، حب جاہ اور حب مال‘‘ کے عنوان سے کیا ہے، (اور یہ فرید بکڈپو، دہلی سے شائع ہو چکا ہے) اور واقعہ یہی ہے کہ اس تعلق کی مضرتیں اس کے فوائد سے زیادہ ہیں۔ جب ان بزرگوں نے مسلم حکومتوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے تو غیر مسلم حکومتوں سے تعلق اور ان سے تعاون لینے کو کیونکر پسند کر سکتے ہیں، جن کے ذرائع آمدنی میں حلال وحرام کی کوئی تمیز نہیں ہے، بلکہ حکومت کی مالی آمدنی کا ایک بڑا

حصہ محض سود پر مبنی ہے۔ تو کون کہہ سکتا ہے کہ مدارس دینیہ کی اعانت میں سود کی نجاست شامل نہیں ہوتی۔

بہر حال اس موضوع پر اربابِ انتظام کو اور اس سے زیادہ حضرات اساتذہ و مدرسین کو غور کرنا چاہئے کہ حکومت کا یہ ذرا سا مالی تعاون ہم کو، ہماری تعلیم کو، ہمارے دین و دیانت کو، اور ہمارے طلبہ عزیز کو کہاں لے جا رہا ہے، اگر مال کی فراوانی ہمارے اصل سرمایہ ہی کو کھو دے، تو اللہ کرے ایسی فراوانی نہ ہو۔ قناعت اور زہد اہل علم کا زیور ہے، اس کی ہر قیمت پر حفاظت کرنی چاہئے، ڈرنے کی چیز فقر و تنگدستی نہیں ہے۔ اگر آدمی کا تعلق اللہ تعالیٰ سے صحیح اور استوار ہو، تو ہاتھ تنگ ہو سکتا ہے، مگر دل تنگ نہیں ہوگا۔ لوگ مال کی اہمیت کے لئے ضروریات و حاجات کا حوالہ دیتے ہیں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جب کوئی ضرورت پیش آئے، تو گھبرانے اور اپنی تنگدستی کا رونا رونے کے بجائے، انسان براہ راست بارگاہِ الٰہی میں اپنی ضرورت پیش کرے، اور نہایت الحاح و زاری سے اپنی ضرورت کا سوال اللہ تعالیٰ سے کرے، پھر اطمینان رکھے کہ غیبی دروازہ کھٹکھٹا دیا ہے اور اللہ کا وعدہ ہے کہ یہ دروازہ کھٹکھٹانے والا کبھی محروم نہیں ہوتا۔ مگر حرص اور اپنے اوپر بھروسہ کرنے، اور خود کو روزی کا ذمہ دار سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی دعاء کی توفیق سے محروم ہو جاتا ہے اور کبھی مردہ دلی کے ساتھ دعا کرتا بھی ہے، تو حق تعالیٰ کے وعدہ پر اعتبار نہیں ہوتا، ورنہ یہ دستور نہیں ہے کہ آدمی حق تعالیٰ سے الحاح و زاری کے ساتھ مانگے اور دل میں یقین و اعتماد موجود ہو اور پھر محروم کر دیا جائے۔

☆☆☆☆☆

مدارس سے متعلق ایک خط کا جواب

یہ خط ایک صاحب قلم عالم کے جواب میں لکھا گیا ہے، انھوں نے مدارس اسلامیہ میں پائی جانے والی خرابیوں پر ان کی اصلاح کے لئے ایک مضمون لکھا تھا، ان کا یہ مضمون ؎ نوارا تلخ ترمی زن ۔۔۔ کا مصداق تھا۔ انھوں نے مذکورہ مضمون از راہ حسن ظن اس خاکسار کے پاس بھیجا۔ میں نے اسے پڑھ کر کچھ تنقیدی معروضات پیش کئے۔ اس کے جواب میں انھوں نے ممنونیت کا خط لکھا۔ اور اربابِ انتظام مدارس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس پر کچھ کلام کیا، کچھ اور باتیں بھی تحریر کیں۔ اس سلسلے میں یہ خط لکھا گیا۔

برادرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ
مزاج گرامی

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ مجھے یقین تھا کہ میری گزارشوں پر آپ کو ناگواری قطعاً نہ ہوگی، اسی لئے بے تکلف لکھتا گیا۔ اور بے تکلف پیش بھی کر دیا۔ آپ ماشاء اللہ میری توقع سے بڑھ کر نکلے کہ نہ صرف یہ کہ ناگواری نہیں ہوئی، بلکہ آپ نے خوشی کا اظہار کیا۔ **كثر الله أمثالكم وبارك في علومكم**

مدارس کے ارباب انتظام کی دو حیثیت ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ وہ امین ہوں، جو اغنیاء سے زکوٰۃ کی رقم بطور امانت لے کر اسے فقراء پر خرچ کریں۔ (۱) اس صورت میں ودیعت کے احکام اس رقم پر جاری ہوں گے۔ مثلاً جو رقم مدرسوں کے ذمہ داروں کے قبضے میں آئی ہے، وہ بدستور صاحب اموال کی ملکیت میں رہے گی۔ امین صرف

---

(۱) ہاں ان کی طرف سے خرچ کرنے کے وکیل ہوتے ہیں، یعنی قبضہ تو قبضۂ امانت ہے، اور تصرف میں وکیل ہیں

اس کا نائب ہوتا ہے، پھر جب تک وہ رقم خرچ نہ ہوگی۔ یعنی فقراء کی ملکیت میں نہیں جائے گی، زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، چاہے سال چھ مہینے گزر جائیں، اسی طرح اگر فقراء کی ملکیت سے پہلے صاحب مال۔۔۔ مر گیا تو اس میں وراثت کا قانون بھی جاری ہوگا۔ پھر یہ کہ وہ رقم چونکہ امانت کی ہے، اس لئے اسے بجنسہ محفوظ رکھنا ضروری ہوگا۔ ورنہ خیانت لازم ہوگی۔ اور اگر وہ بغیر کسی تعدی کے ہلاک ہوگئی، تو جب امین پر ضمان نہ ہوگا، تو زکوٰۃ بھی ادا نہ ہوگی، صاحب مال کو پھر سے زکوٰۃ ادا کرنی ضروری ہوگی۔ وغیرہ

دوسری حیثیت یہ ہے کہ ذمہ داران مدارس کو طلبہ کا وکیل قرار دیا جائے، کہ ان کی طرف سے یہ حضرات زکوٰۃ کے مال پر قابض ہوں۔ یہ قبضہ درحقیقت مؤکل کا ہوگا، اس لئے تملیک اسی وقت متحقق ہو جائے گی، صاحب مال کی زکوٰۃ ادا ہوگئی، اب یہ ذمہ داری ان وکیلوں پر ہے کہ اپنے مؤکلوں پر اسے خرچ کریں، اگر اس کے خلاف کریں گے، یعنی اپنے ذاتی مصارف میں خرچ کریں گے، یا ایسی جگہ خرچ کریں، جس کا طلبہ سے تعلق نہ ہو یا اسراف کریں، تو یہ ان کا جرم ہوگا۔

یہاں ایک سوال ہوگا کہ مؤکل معلوم نہیں کون کون ہیں؟ اور انھوں نے کب وکیل بنایا؟ حکومت کو تو ولایت عامہ حاصل ہوتی ہے، جو جو حکومت کے دائرے میں آتا جائے گا، اس کی وکالت امیر المومنین کو حاصل ہوتی جائے گی۔ یہاں نہ تو حکومت جیسی ولایت ہے، اور نہ طلبہ نے وکیل بنایا ہے؟ یہ اشکال واقعی قابل غور ہے۔

حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری قدس سرہٗ کی خدمت ایک سوال کیا تھا کہ ”مدرسہ میں جو روپیہ آتا ہے، اگر یہ وقف ہے تو بقاء عین کے ساتھ انتفاع کہاں ہے؟ اور اگر یہ ملکِ معطی ہے تو اس کے مرجانے کے بعد ورثہ کی جانب واپسی واجب ہے، (امداد الفتاویٰ ج:۶ ص:۲۶۲)

اس کے جواب میں مولانا نے لکھا کہ:

”عاجز کے نزدیک مدارس کا روپیہ وقف نہیں ہے، مگر اہل مدرسہ مثل عمال

بیت المال معطین اور آخذین کی طرف سے وکلاء ہیں، لہٰذا نہ اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، اور نہ معطین واپس لے سکتے ہیں" (ج:۶، ص:۲۶۳)

اس پر حضرت تھانویؒ نے اشکال فرمایا کہ:

"عمال بیت المال منصوب من السلطان ہیں، اور سلطان کو ولایت عامہ ہے، اس لئے وہ سب کا وکیل بن سکتا ہے، اور مقیس میں ولایت عامہ نہیں ہے، اس لئے آخذین کا وکیل کیسے بنے گا؟ کیونکہ نہ توکیل صریح ہے، نہ دلالۃً ہے، اور مقیس علیہ میں دلالۃً ہے کہ وہ سب اس کے زیر اطاعت ہیں، اور وہ واجب الاطاعت ہے۔ (ج:۶، ص:۲۶۴)

حضرت سہارن پوری نے اس کا جواب لکھا کہ:

"بندہ کے خیال میں سلطان میں دو وصف ہیں، ایک حکومت، جس کا ثمرہ تنفیذِ حدود وقصاص ہے۔ دوسرا انتظام حقوق عامہ، امر اول میں کوئی اس کا قائم مقام نہیں ہوسکتا، امر ثانی میں اہل حل وعقد بوقت ضرورت قائم مقام ہوسکتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ اہل حل وعقد کی رائے ومشورہ کے ساتھ نصب سلطان وابستہ ہے، جو بابِ انتظام سے ہے، لہٰذا مالی انتظام مدارس جو برضائے ملاک وطلبہ ابقائے دین کے لئے کیا گیا ہے، بالاولیٰ معتبر ہوگا، اور ذرا غور فرمائیں انتظام جمعہ کے لئے عامہ کا نصب امام معتبر ہونا، جزئیات میں اس کی نظیر شاید ہوسکے۔ (ج:۶، ص:۲۶۶)

مولانا کے اس فرمان سے معلوم ہوا کہ اربابِ انتظام طلبہ کی طرف سے وکیل ہوتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو بہت سے دوسرے مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے۔

تو جس طرح یہ کہا گیا ہے ۔۔۔ کہ سلطان کو ولایت عامہ حاصل ہے، اور دلالۃً وہ سب کا وکیل ہے، اسی طرح مہتمم مدرسہ کو طلبہ کی طرف سے دلالۃً انتظامی وکالت حاصل ہے۔ اس میں بہت سی مشکلات کا حل ہے۔

یہی سوال حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ سے کیا گیا تو انھوں نے

جواب دیا کہ:

''مہتمم مدرسہ کا قیم ونائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے، جیسا کہ امیر نائب جملہ عالم کا ہوتا ہے، پس جو شئ کسی نے مہتمم کو دی، مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبضہ ہے، اس کے قبض سے ملک معطی سے نکلا اور ملک طلبہ کا ہو گیا، اگرچہ وہ مجهول الكمية والذوات ہوں، مگر نائب معین ہے، بس بعد موت معطی کے ملکِ ورثہ اس میں نہیں ہو سکتی اور مہتمم بعض وجوہ میں وکیل معطی کا بھی ہو سکتا ہے، بہر حال نہ یہ وقف مال ہے اور نہ ملک ورثہ معطی کی ہوگی اور نہ خود معطی کی ملک رہے۔ واللہ تعالیٰ أعلم (تذکرۃ الرشید، ج:۱ص:۱۶۵)

مدرسوں کے اندر جو خرابیاں ہیں۔ ان کی اصلاح ضروری ہے، مگر اصلاح ایسی نہ ہو، جس سے مزید خرابیاں یا نئی خرابیاں پیدا ہو جائیں۔ نفوس کی انفرادی خرابیوں نے اجتماعی خرابیوں کی تخم ریزی کی ہے، نفوس کی اصلاح نہ ہونے کہ وجہ سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اوران کی اصلاح رابطہ وغیرہ سے کبھی نہ ہوگی۔ مجھے خوب تجربہ ہے، یہی لوگ اپنے نفس کی تمام خرابیوں کے ساتھ جب ایک جگہ اکٹھا ہوں گے تو ان خرابیوں کا ظہور نئے نئے انداز سے ہوگا۔ بسا اوقات ملنے سے زیادہ ''ہجران جمیل'' ہی مناسب ہوتا ہے۔

(۱) مدرسہ صرف ارباب انتظام کا نام نہیں ہے، اس کے دو ارکان اور بھی ہیں۔ اساتذہ اور طلبہ، اصلاح ہمہ جہت ہونی چاہئے۔ اور یہ بھی تجربہ ہے کہ کوئی مدرسہ دوسرے مدرسہ کی اصلاح نہیں کر سکتا، خود مدرسے میں کوئی ذمہ دار فرد اصلاح کی طرف توجہ دے، اور جو اصلاح وہ کرنا چاہتا ہے، اس کے خلاف خود اس کا عمل نہ ہو یعنی وہ صلاح سے متصف ہو، علم وتقویٰ دونوں کا خاص وزن اس کے اندر ہو، اس کا عمل اس کے قول کی تکذیب نہ کرتا ہو، اس کا حال اس کے دعویٰ کو جھٹلاتا نہ ہو، تو اصلاح کا امکان

---

(۱) مکتوب سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ صرف اربابِ انتظام کی خرابیوں کا اثر مدرسہ پر پڑ رہا ہے، یہ فقرہ اسی کے جواب میں ہے۔

خاصا بڑھ جاتا ہے۔ ورنہ ’’خود رافضیحت دیگراں رانصیحت‘‘ بن کررہ جاتا ہے۔

آج صرف مدارس کے پیمانے پر نہیں، ملی پیمانے پر اتحاد و اتفاق کا نعرہ بہت لگتا ہے، مگر جو بھی اتحاد کا اعلان لے کر کھڑا ہوتا ہے، کچھ دنوں کے کے بعد دیکھا جاتا ہے کہ اس کا ٹولہ الگ بن کر رہ جاتا ہے، اور اختلاف کا نیا شاخسانہ جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ اس لئے جو خرابیاں نظر آتی ہیں، انھیں ہلکا کرنے کی کوشش کرتے رہئے، کم از کم اپنے کو ان خرابیوں سے بچائے رکھئے، انھیں خرابیوں کے ساتھ مدارس کو چلاتے رہئے، اور اصلاح کی کوشش کرتے رہئے، مدرسہ اور تعلیم فرض کفایہ ہے، اگر کسی کو کسی خاص ماحول میں ایمان و عمل کے لئے خطرہ محسوس ہوتا ہو، تو چھوڑ کر الگ ہو جائے اور جہاں ایمان کی سلامتی ہو وہاں کام کرے، مگر تعلیم اور مدرسہ بند نہیں کیا جاسکتا، اور تجربہ تو یہ ہے کہ مدرسہ سے باہر ایمان و اعمال پر آگ برس رہی ہے۔ یہ اصحابِ کہف کی پناہ گاہ ہے۔ انھیں خرابیوں کے ساتھ چلنے دیجئے۔ ایک مدرسہ بند ہوگا، تو دوسرا کھلے گا، مگر اس نظام کو یکسر تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔

میں نے عرض کیا تھا کہ مدرسہ کے تین ارکان میں سے ایک رکن اساتذہ ہیں۔ واللہ اگر اساتذہ انفرادی طور پر اپنی اصلاح کرلیں اور کرالیں تو مدارس میں بڑی حد تک سدھار آجائے گا۔ طلبہ اربابِ انتظام سے نہیں اساتذہ سے بنتے ہیں۔ انھیں کی نیتوں اور انھیں کے اعمال پر زیادہ مدار رہتا ہے۔ ان کا باطن شفاف ہو، ان کا ظاہر بے داغ ہو، ان کے اعمال میزانِ شریعت پر پورے اترتے ہوں، تو یہ خیر ہمہ جہت وسعت اختیار کرلے گا۔

(۱) اپنے علاقہ اور دوسرے علاقوں کے طلبہ میں تفریق ہے تو بہت بری، مگر

---

(۱) مولانا موصوف نے کچھ علاقائی عصبیت کا تذکرہ کیا تھا کہ اربابِ مدارس اپنے علاقے کے طلبہ اور بیرونی طلبہ کے درمیان معاملات میں تفریق کرتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اگلا فقرہ اسی سے متعلق ہے۔

آپ بتائیں کیا اربابِ مدارس کو قوت حاکمانہ حاصل ہے؟ نہیں ہے، تو بعض اوقات **اھون البلیتین** کے اصول پر ارباب مدارس کو ایسا کرنا پڑتا ہے، گو کہ یہ عذر گناہ بدتر از گناہ مناسب نہیں ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اہل مدارس کوئی ایسا قانون نہ بنائیں، جس میں مجبوراً تفریق والا عمل کرنا پڑے۔ اصول و قانون چاہے جزوی ہو، بہت غور و فکر کے بعد اس کے اثرات کا جائزہ لے کر ہی بنانا چاہئے، اس میں ارباب انتظام سے بہت غلطی ہوتی ہے۔

اور کیا عرض کروں، غلطیاں اور ہماری خامیاں تو بہت ہیں۔ جن میں سے اکثر کی اصلاح، انفرادی صلاح و تقویٰ سے ہوسکتی ہے۔ جب ان مدرسوں سے کثیر تعداد اچھے اور صالح علماء کی نکلتی تھی، اس وقت مدارس کے اساتذہ بزرگ ہوتے تھے، بزرگوں سے تعلق و ربط رکھتے تھے، ذاکر و شاغل ہوتے تھے، خوفِ خدا اور محبت نبوی سے معمور و سرشار ہوتے تھے، آج کیا رنگ ہے؟ باہر کے قانون سے کسی چیز کی اصلاح ممکن نہیں، بنانے والا قانون بناتا ہے، توڑنے والا اس سے زیادہ ذہانت صرف کرتا ہے، اور قانون ٹوٹ جاتا ہے۔ اصل سرمایہ خشیت الٰہی، پاسِ شریعت، احساسِ جواب دہی اور مخلوق خدا پر شفقت و عنایت ہے۔ تنقید پوشیدہ ہو، اور اصلاح علانیہ ہو تو بہتر ہے، جراحی کا عمل ایک ضرورت ہے، اس کے لئے آپریشن روم مناسب ہے، علاج ایک مقصد ہے۔ اسے کھل کر پیش کیجئے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اصلاح کی تدبیر بتایئے۔ اس کو خود اختیار کیجئے، اور دوسروں کو نشانۂ تنقید بنانے کے بجائے خود اپنی اصلاح میں پیش رفت کیجئے۔

رہا یہ کہ پھر حکومت کی سرپرستی والے مدارس پر تنقید کیوں کی جائے، تو معلوم ہونا چاہئے کہ حکومت کی سرپرستی قبول کرنے پر علی الاعلان تنقید ضروری ہے، اس لئے کہ اس سے مدرسوں کا راستہ اور منزل سب یکسر تبدیل ہوجاتے ہیں، اگر لوگ انھیں دینی کے بجائے دنیاوی مدرسہ اور کاروبار قرار دیں، تو پھر تنقید و اصلاح کی ضرورت نہیں

رہے گی۔ جیسے انگریزی مدارس وکالجز پر اس نقطۂ نظر سے کوئی نہیں تنقید کرتا، اسی طرح ان سرکاری مدارس پر بھی کوئی تنقید، اس خاص نقطۂ نظر سے نہ ہوگی۔ ہاں کسی اور زاویہ سے ہوتو ہو۔

والسلام
اعجاز احمد اعظمی
یکم/ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ

☆☆☆☆☆

(مزید)

(۱) رابطوں سے متعلق اتنا اور عرض کروں کہ پاکستان میں بڑے پیمانے پر میں نے رابطے کی صورت دیکھی ہے، لیکن علم دین اور تعلیم کے حق میں اس کا ضرر کچھ زیادہ ہی دیکھنے میں آیا۔ بلکہ مجھے تو یہ تجربہ بھی ہے کہ ہمارے ہندوستان جیسے ملک کے مدارس میں، دوسرے مدارس کے علماء وارباب انتظام سے بہت زیادہ ربط نہ رکھا جائے ۔تو کچھ زیادہ غیر مناسب نہ ہوگا۔ یہ ''اعجاب کل ذی رای برایہ'' کا دور ہے۔ اللہ جانے ایک شخص دوسرے مدرسہ میں جا کر کیا اثر چھوڑے؟ کون سا بیج بودے؟ بعض لوگوں کے ساتھ خلاف وشقاق اس طرح لگا ہوا ہے کہ جہاں جاتے ہیں، کچھ نہ کچھ زہریلا تخم پڑ ہی جاتا ہے۔

میں الہ آباد میں پڑھاتا تھا۔ ایک جگہ سے دس بارہ آدمیوں پر مشتمل ایک قافلہ آیا۔ جو دہلی جارہا تھا، اسے اپنے یہاں کسی کام کی منظوری، حضرت مولانا اسعد صاحب کے واسطے سے حکومت سے لینی تھی۔ یہ لوگ شام کے وقت الہ آباد حضرت شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی خانقاہ میں پہونچے، ایک استاذ نے ان کی ضیافت کی، یہ سب

---

(۱) مولانائے موصوف نے مدارس عربیہ کے درمیان ارتباط وتعلق پر بہت زور دیا تھا کہ اس کے لئے ایک تنظیم میں تمام مدارس کو منظم ہوکر کام کرنا چاہئے۔ یہ خیال ہے تو بڑا خوش آئند! مگر بحالات موجودہ اس کی افادیت تجربہ سے بہت مشکوک ثابت ہوئی ہے، اگلے فقرے میں اسی کی قدرے تفصیل ہے۔

خواص تھے، ان میں علماء بھی تھے، ارباب سیاست بھی تھے، عشاء کی نماز کے بعد کھانے سے فارغ ہوکر ایک صاحب کھڑے ہوئے، اور خطبہ پڑھا، مجھے تعجب ہوا کہ یہ صاحب اس وقت کیسی تقریر کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ لوگوں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ سب لوگ فلاں جگہ کے رہنے والے ہیں، اور صبح سے اب تک سب لوگ ساتھ ہیں، اور کسی بات پر آپس میں اختلاف نہیں ہوا، یہ کہہ کر وہ صاحب بیٹھ گئے، میں لرز گیا کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے، قافلہ پلیٹ فارم تک پہونچتے پہونچتے دو فرقوں میں تقسیم ہوگیا، نزاع شروع ہوگئی، گاڑی میں جب بیٹھنے کا وقت آیا، تو ایک پارٹی اور بن گئی۔ دو پارٹیاں واپس گھر لوٹ گئیں، اور ایک پارٹی دلی گئی، اور ناکام لوٹ آئی۔ اگر ایسا کوئی آدمی مدرسہ میں آگیا، تو بس اللہ ہی خیر فرمائے۔ بس انھیں چلنے دیجئے، جب تک کوئی نیا شر پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو اصلاح کیجئے، ورنہ چھوڑ دیجئے۔ کام کے لوگ اسی سمندر سے نکلتے رہیں گے۔

☆☆☆☆☆

تین دن ضلع مہراج گنج کے مدارس میں

۱۹؍ سے ۲۱؍ ذی قعدہ ۱۴۱۶ھ تک استاذِ محترم مدظلہٗ نے اپنے ایک شاگرد مولانا محمد صادق صاحب قاسمی استاذ الجامعۃ الاسلامیہ دَھنُہا، بیجولی کی دعوت اور ان کے انتظام واہتمام میں ضلع مہراج گنج کے ایک درجن مدارس کا دورہ کیا، ان مدارس کے نام یہ ہیں، الجامعۃ الاسلامیہ دَھنُہا، بیجولی۔ الجامعۃ الشرعیہ ابوبکر صدیق، تَرگُلو اتیواری۔ مدرسہ تاج العلوم، پچھی پور۔ مدرسہ مدینۃ العلوم، گنیش پور۔ جامعہ صادقیہ، مہراج گنج۔ دار العلوم فرقانیہ اکسڑ وا۔ مدرسہ مصباح العلوم، کمہریا بزرگ۔ مدرسہ اصلاح المسلمین، مجھنا ملک۔ مدرسہ عربیہ سراج العلوم، نوتنواں۔ دار العلوم فیضِ محمدی ہتھیا گڑھ۔ وغیرہ

اس حاضری میں حضرات اساتذہ کرام واہل انتظام سے خصوصی طور ملاقاتیں ہوئیں، اور ان سے گفتگو ہوئی۔ اس مضمون میں ان تمام باتوں کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے، جو ان مدارس میں عرض کی گئیں۔ مرتب

میں نے اس سفر کے میں جو باتیں عرض کی تھیں، وہ مختلف مدارس میں وہاں کے حالات کے لحاظ سے کچھ خاص اور کچھ مشترک باتیں تھیں، تحریر میں اس ترتیب سے قطع نظر تمام باتیں اجمالاً ذکر کروں گا، اللہ تعالیٰ انھیں کارآمد اور مفید بنائیں۔

ا............طلبہ، مدارس عربیہ میں اساتذہ و منتظمین کی خدمت میں بطور امانت ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ نے ان کے سپرد کیا ہے کہ ان کی حفاظت کریں، انھیں بنا سنوار کر دینی اعمال واخلاق کا نمونہ بنائیں۔ علم دین کا ذوق وشوق اور اس کی استعداد پیدا کریں۔ اگر اس سلسلہ میں بالقصد کوتاہی ہوئی تو اللہ تعالیٰ کے مواخذہ سے بچنا مشکل ہوگا، اس سلسلہ میں کسی طرح کی سستی اور تساہل کو روا رکھنا درست نہیں ہے، نہ تعلیم میں، نہ تربیت میں، حضرات اساتذہ اور ذمہ دارانِ مدرسہ اپنی والی کوشش تعلیم وتربیت میں

کریں، اس جد و جہد کے بعد اگر کسی کی استعداد ہی فاسد ہو، اور وہ کچھ نہ بن سکا تو انشاء اللہ مواخذہ نہ ہوگا۔

۲.........طلبہ کو حصول علم کی جانب راغب کرنے اور ان کے اندر مطالعہ و مذاکرہ کا ماحول بنانے کیلئے ضروری ہے کہ اساتذہ خود کو مطالعہ کتب اور علمی مشاغل میں مصروف و منہمک رکھیں، اس سلسلے میں بہت سے اساتذہ کوتاہی کے شکار ہیں، وہ یہ تو ضرور چاہتے ہیں کہ طلبہ درس و مطالعہ میں محنت کریں۔ اپنے اندر علم کی استعداد پیدا کریں۔ امتحان میں ان کے نمبر اچھے آئیں۔ مگر خود بقدر ضرورت بھی پڑھنے کی فرصت نہیں پاتے، خالی اوقات کو باہمی گپ شپ، فضول تفریحات یا خورد و نوش کے مشاغل میں گزار دیتے ہیں۔ انھیں باقاعدہ اگلے سبق کا مطالعہ کرنے کا موقع نہیں مل پاتا۔ جب طلبہ اپنے اساتذہ کو اس طرح مشاغل علمی سے بے نیاز دیکھتے ہیں، تو ان کی طبیعت کی سرگرمی بھی سرد پڑ جاتی ہے، مدرسوں کے اوقاتِ تعلیم کے لحاظ سے اساتذہ کے لئے نماز مغرب اور نماز عشاء کے بعد کے اوقات اور فجر کی نماز کے بعد کا وقت خالی رہتا ہے۔ ان اوقات میں حضرات اساتذہ خود کو تحصیل علم اور مطالعہ میں مصروف رکھیں تو طلبہ اس سے بیحد متأثر ہوتے ہیں، اور ان میں بھی علم کا ولولہ جاگ اٹھتا ہے۔

ہر استاذ چاہتا ہے کہ طالب علم درس سے غیر حاضری نہ کرے، لیکن بعض اوقات کچھ اساتذہ ہی اپنے طرز عمل سے پابندئ درس کی وقعت گھٹا دیتے ہیں۔ خود بغیر کسی معقول وجہ کے درس کا ناغہ کر دیتے ہیں، کبھی مدرسہ میں موجود ہوتے ہوئے بیٹھے باتیں کرتے رہ جاتے ہیں، اور سبق کا وقت ختم ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ جب اکابر ہی درس اور اوقاتِ درس کا پاس و لحاظ نہ کریں گے تو اصاغر سے اس کی توقع کیونکر کی جاسکتی ہے، خاص اہتمام کرنا چاہئے کہ سبق کا ناغہ نہ ہو، خواہ کبھی کسی عذر کی وجہ سے تھوڑا ہی پڑھانے کی نوبت آئے، اور درس کے جو اوقات مدرسہ کی جانب سے متعین ہیں کوشش کریں کہ اس پورے وقت کو تعلیم و تدریس اور تربیت وغیرہ میں مصروف رکھیں۔ ان

اوقات میں ملنا جلنا، بات چیت، چائے نوشی وغیرہ کا سلسلہ بند رکھیں، جس کام کا جو وقت ہو اس میں وہی کام ہونا چاہئے، اس وقت میں اگر دوسرا کام چھیڑ دیا جائے تو اس کام کی اہمیت گھٹ جاتی ہے، اور بعد میں اس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ اگر اساتذہ کرام خود کو رائج الوقت فضولیات سے بچا کر تعلیم و مطالعہ میں لگائے رکھیں تو طلبہ پر اس کا اثر بہت خوشگوار ہوگا، رائج الوقت فضولیات میں، سیاسی تبصرے، ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ کے مشغلے، نظم خوانی وغیرہ کی مجالس، چائے نوشی کے دور وغیرہ شامل ہیں، یہ چیزیں بقدر ضرورت ہوں۔ اور اس وقت ہوں جب فرصت ہو، تو مضائقہ نہیں۔ لیکن ان فضولیات میں پڑ کر آدمی خود کو قابو میں نہیں رکھ پاتا پھر بے تحاشا وقت ضائع ہوتا ہے، دل و دماغ بھی برباد ہوتا ہے، طبیعت میں سطحیت پیدا ہو جاتی ہے، پھر اس کے بعد کسی سنجیدہ مشغلے میں لگنا طبیعت پر بار بن جاتا ہے۔

۳............اسباق کی پابندی نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ، سال بھر میں کتابیں جتنی مقدار میں ہونی چاہئیں، نہیں ہو پاتیں، بعض کتابیں آدھی، بعض تہائی اور بعض چوتھائی ہوتے ہوتے سال پورا ہو جاتا ہے، کتابیں جب ادھوری ہوتی ہیں تو استعداد کبھی اچھی نہیں ہوسکتی، چھوٹے، اور متوسط مدارس میں یہ عیب بکثرت پایا جاتا ہے کہ کتابیں مقدار نصاب سے کم رہ جاتی ہیں، یہ طلبہ جب دوسرے مدارس میں داخلہ کے لئے جاتے ہیں، تو اکثر ان کو اس سال کی تعلیم کا اعادہ کرنا پڑتا ہے، اس سے طالب علم کی طبیعت ٹوٹتی ہے۔ محنت کرنے سے جی چراتا ہے، مقدار نصاب مکمل ہونی چاہئے، لیکن دورہ نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ سال کا بیشتر حصہ گزر جاتا ہے اور کتابیں بہت کم ہو پاتی ہیں، پھر مقدار پوری کرانے کی دھن سوار ہوتی ہے، تو اوقات تعلیم میں اور خارج وقت میں مسلسل پڑھانے لگتے ہیں، پھر نہ طالب علم کو مطالعہ کا موقع ملتا، نہ مذاکرہ کا۔ یہ طرز عمل استعداد کے لئے سخت مضر ہے۔ ایک انداز سے پورے سال سبق کا اہتمام کرنا چاہئے، اور خارج اوقات میں ہرگز سبق نہیں پڑھانا

چاہئے۔ ورنہ استعداد تباہ ہوکر رہے گی، سبق پڑھنے کا مسئلہ تو اہم ہے ہی۔ اس سبق کا مذاکرہ اور اس کا یاد کرنا بھی کچھ اہم نہیں ہے، پچھلے سبق کا حفظ واستحضار اگلے سبق کے لئے معاون بنتا ہے، طلبہ کو اتنا موقع ضرور فراہم کرنا چاہئے کہ وہ اگلے سبق کا مطالعہ اور پچھلے سبق کا مذاکرہ کرسکیں۔

۴............ میں نے بعض مدارس میں عرض کیا کہ بچے ہم لوگوں کے پاس آجاتے ہیں، تو ہم اپنے کو ان کے سلسلے میں آزاد محسوس کرنے لگتے ہیں، پھر ہماری تعلیم چاہے جیسی ہو، مگر بچوں کو مارنا پیٹنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں، اور یہ تصور کرتے ہیں کہ بغیر مار کھائے، بچہ پڑھ ہی نہیں سکتا۔ اور اس سلسلے میں عجیب عجیب غلط سلط کہاوتوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ پرانی روایات بیان کی جاتی ہیں۔ لیکن یہ سب غلط اندیشیاں ہیں ہم کسی باب میں آزاد نہیں ہیں۔ شریعت کے پابند ہیں، شریعت نے ہر چیز کے حدود مقرر کئے ہیں۔ ان کے دائرے میں رہنا ضروری ہے۔ بچوں کو کس قدر مارا جاسکتا ہے، اس کی بھی حد متعین ہے۔ اس سے آگے بڑھنا خطرناک کام ہے۔ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کے اسوہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے، حضرت انس رضی اللہ عنہ نے دس سال کی عمر سے لے کر بیس سال کی عمر تک رسول اللہ ﷺ کی خدمت کی ہے، اور آپ سے علم سیکھا ہے۔ لیکن وہ خود شہادت دیتے ہیں کہ اس دس سال میں رسول اللہ ﷺ نے نہ مجھے ڈانٹا نہ جھڑکا، آپ کا اسوہ تو یہی ہے، آپ ﷺ نے مہربانیاں فرمائی ہیں، اپنے چھوٹوں کو شفقتوں سے نوازا ہے، ان پر کبھی سختی نہیں کی، بلکہ سختی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ مگر ہمارا تصور یہ ہوگیا ہے کہ طلبہ پر جب تک سختی نہ کی جائے گی، وہ کچھ نہ بن سکیں گے۔ کس قدر خلافِ سنت یہ تصور ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اگر ہم نے سختی نہیں کی طالب علم کو مارا پیٹا نہیں، اسے شفقت ومحبت سے پڑھایا، اس کے باوجود وہ نہ پڑھ سکا یا کچھ نہ بن سکا، تو انشاءاللہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مواخذہ نہیں ہوگا، اور اگر ہماری مار پیٹ کی وجہ سے طالب علم کا دل تعلیم سے اچاٹ ہوگیا۔ اور اس کے نتیجے میں علم دین سے محروم ہوگیا تو ہم کو

مواخذہ سے کوئی بچا نہیں سکتا ہے اور یہ بھی واقعہ ہے کہ ہمارا مارنا پیٹنا زیادہ تر غصہ اتارنے کیلئے ہوتا ہے۔ یہ خودنفسانیت ہے، اس کا اچھا اثر نہیں ہوسکتا۔ یہ بچے ہماری اولاد کی طرح ہیں۔ اپنی اولاد پر بھی بیجا سختی جائز نہیں ہے، تو ان پر کیسے جائز ہوگی، روک ٹوک برحق، دارو گیر درست، امر بالمعروف ضروری، نہی عن المنکر واجب، مگر سختی اور مار پیٹ کی گنجائش نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی طالب علموں کے بارے میں وصیت ہے کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

اور جیسے حدود سے زیادہ زدوکوب کرنا جائز نہیں، اسی طرح ان کا تمسخر، ان کی تحقیر، ان کی غیبت وشکایت جائز نہیں، یہ بچے ہیں، ان سے غلطیاں ہوتی ہیں، لیکن ان غلطیوں کا موقع بے موقع اظہار کرکے ان کو ذلیل کرنا کسی طرح جائز نہیں ہوسکتا، تعلیم دینا، ایک بڑی عبادت ہے، اور مذکورہ امور بالا گناہ ہیں، عجب نہیں کہ ہمارا یہ گناہ جو حقوق العباد سے تعلق رکھتا ہے، ہماری عبادت کو کھا جائے۔

مارنے پیٹنے میں ظلم کا اندیشہ رہتا ہے۔ خدانخواستہ اگر ظلم ہوگیا، تو ان کا طرفدار خدا ہے، خدا کا رسول ہے۔ پھر ہم کیونکر بچ سکتے ہیں، ایک صحابی اپنے غلام کو مار رہے تھے پیچھے سے انھوں نے آواز سنی کہ جتنا تم کو اس غلام پر قابو ہے، اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو تم پر قدرت ہے، انھوں نے مڑ کر دیکھا تو رسول اللہ ﷺ تھے، ان کے ہاتھ سے کوڑا اگر گیا۔ انھوں نے ادب سے عرض کیا کہ یہ غلام بڑی غلطیاں کرتے ہیں، آپ نے فرمایا معاف کردو، انھوں نے پوچھا کتنی دفعہ معاف کریں۔ فرمایا ستر مرتبہ۔ غور کرنے کی بات ہے کہ زرخرید غلاموں کے بارے میں جب صاحبِ شریعت کا یہ فتویٰ ہے، تو طالب علموں کے سلسلے میں ان کا فتویٰ کیا ہوگا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کو بالکلیہ چھوڑ دیا جائے، نہیں، یہ امانت میں خیانت ہوگی۔ ان پر روک ٹوک بھی ہوگی، سرکشی پر تنبیہ بھی کی جائے گی، مگر اس کا درجہ صرف ضرورت کا ہے۔ ضرورت ہونے پر بقدر ضرورت اس کو عمل میں لایا جاسکتا

ہے، مگر عام حالات میں نرمی وشفقت ہی متعین ہے۔

۵............بعض مدارس میں یہ شکایت سننے میں آئی کہ اکثر طلبہ مدرسہ بدلتے رہتے ہیں۔ اس پر ایک جگہ میں عرض کیا کہ طلبہ مدرسہ کیوں بدلتے ہیں۔ اس کے اسباب پر غور کرنا چاہئے۔ اس کو طلبہ کی بے وفائی پر محمول کر کے مطمئن نہیں ہونا چاہئے، اور نہ یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ صرف کھانے کیلئے آتے ہیں، جہاں کھانا اچھا ملتا ہے، وہیں چلے جاتے ہیں۔ یہ بات کسی درجے میں درست ہو تو ہو، لیکن عموماً درست نہیں ہے۔ بسا اوقات ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ ہماری تعلیم وتربیت سے مطمئن نہیں ہوتے، اسلئے چلے جاتے ہیں، اپنی تعلیم سے، اپنی تربیت سے، اپنے اخلاق ومحبت سے ان کو مطمئن کر دیا جائے تو وہ بغیر اجازت کہیں جانے کا نام نہ لیں گے۔ میرا خوب تجربہ ہے کہ تعلیم اچھی ہوتی ہے، تربیت کا صحیح نظم ہوتا ہے، تو طلبہ جسمانی تمام تکالیف برداشت کر لیتے ہیں، مگر اس جگہ کو نہیں چھوڑتے، اچھی استعداد کے طلبہ عموماً مطمئن ہو جائیں، تو پھر اکا دکا طالب علم کے اِدھر اُدھر ہونے کا کچھ مسئلہ نہیں، لیکن جہاں پوری پوری جماعت مدرسہ چھوڑ کر بغیر اجازت نکل جائے۔ تو ضرور کوئی بڑی کمی پائی جاتی ہے۔ طالب علم اگر تعلیم سے مطمئن ہے، تو جہاں تک اس مدرسہ میں تعلیم ہوگی، اسے مکمل کر کے ہی نکلے گا۔ اگر ایسا ماحول تعلیم وتربیت کا بن گیا، تو اللہ تعالیٰ کی مدد آئے گی۔ اور سال بسال تعلیمی ترقی ہوگی، اب طلبہ ڈھونڈھتے رہتے ہیں کہ تعلیم کہاں اچھی ہوتی ہے۔ اگرچہ ایسے بھی بہت ہیں، جو صرف وقت گزاری کرتے ہیں۔ مگر اس میں بھی ہمارا ہی قصور ہے، طلبہ کی طبیعت کچی لکڑی جیسی ہے، جدھر موڑیئے، آسانی سے مڑ جاتی ہے۔ ہم اگر ان کی صحیح تعلیم وتربیت کریں تو طلبہ کی اکثریت اچھے راستے پر چل پڑے گی۔

۶............میں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ حضراتِ اساتذہ ہمارے ان دینی مدارس میں پیشہ اور حرفت کی نیت سے نہ داخل ہوں۔ یہ نہ سمجھیں کہ یہ کوئی ذریعۂ معاش ہے، اس تعلیم کو عام کرنا، اس کی اشاعت کرنا ہماری عبادت ہے، ہمارا فریضہ

ہے، یہ روپیہ کمانے کا پیشہ نہیں ہے۔ عبادت ہی سمجھ کر ہم کو یہ کام کرنا ہے۔ اور اس نیت میں بے حد برکت ہوگی۔ پھر یقین ہے کہ اساتذۂ کرام اپنی روزی کی طرف سے ہرگز پریشان نہ ہوں گے، ہاں فضول خرچی اور اعلیٰ معیارِ زندگی کی گنجائش نہیں ہوگی، لیکن اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ قناعت کے ساتھ ہم کام میں لگے رہیں۔ ضرورت پڑے تو بجائے منتظمین کے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ضرورت کا اظہار کریں۔ اس طرف سے جو کچھ مل جائے، اللہ کا شکر ادا کر کے اسے قبول کریں۔ اللہ کے عطیے کی ناقدری اور ناشکری نہ کریں۔ تنخواہ کی کمی بیشی کا شکوہ انسانوں سے فضول ہے۔ اللہ ہی سے عرضِ مدعا کریں۔

البتہ یہ منتظمین کی ذمہ داری ہے کہ وہ دین کے ان خدمت گزاروں کو حتی الوسع مطمئن رکھیں، ان کا استحصال نہ کریں، دونوں اپنی اپنی ذمہ داری کو نبھائیں، اور دوسرے کی ذمہ داری میں دخل نہ دیں تو ماحول جنت بن جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کی غیبی نصرت شامل حال ہوگی۔

۷..........جن مدارس میں بندہ کی حاضری ہوئی، ان میں عربی کی ابتدائی تعلیم کا نظم ہے، صرف ایک مدرسہ میں شرح جامی تک تعلیم ہے اور ایک آدھ میں عربی سوم تک۔ اور باقی میں عربی دوم یا عربی اول یا محض فارسی تک، اور جہاں تک میں نے معلوم کیا، ضلع مہراج گنج کے کسی مدرسے میں ہدایہ جلالین تک تعلیم نہیں ہے، یہ بات ان مدارس کے لئے بہت قابل غور ہے، تعلیمی معیار بلند کرنا چاہئے۔ اسی طرح ان تمام مدارس کے مجموعے میں کوئی اہم قابل ذکر علمی شخصیت نہیں ہے، جن سے اہل علم اپنے مشکلات میں رجوع کرسکیں، یا اختلاف کی صورت میں ان کی بات پر متفق ہوسکیں۔ یہ دونوں کمی شدت کے ساتھ محسوس ہوئی۔ معیار تعلیم اگر یہ حضرات بڑھالیں، تو ایسی شخصیات میسر آجائیں گی۔ انشاءاللہ

۸..........ہمارے یہ مدارس دینیہ، دین کیلئے، دینی علوم کیلئے اور دینی اخلاق واعمال کیلئے تحفظ وبقا اور نشر واشاعت کی چھاؤنیاں ہیں۔ ان میں ایک زندگی، ایک

ذوق وشوق، دین کی خدمت کا جذبہ، علوم دینیہ کے زیادہ سے زیادہ فروغ واشاعت کی لگن، اور اس کی تدبیروں کا زیادہ سے زیادہ اہتمام چاہئے، لیکن افسوس ہوتا ہے کہ ان باتوں کے بجائے بیشتر مدارس میں جمود، افسردگی، ایک طرح کی کاہلی اور بے حسی کا تسلط معلوم ہوتا ہے، مدارس کا ایک لگا بندھا ڈھرّا بن گیا ہے، جس میں مرکزی اہمیت تحصیل چندہ کو حاصل ہوگئی ہے، چھوٹے بڑے جتنے مدرسین ہیں، سب کی ذمہ داری ہے کہ چندہ لائیں۔ گاؤں کے مدارس میں وقت کا ایک بڑا حصہ چندہ کی کدوکاوش کی نذر ہوجاتا ہے، رمضان شریف کا مہینہ تو چندہ کا موسم ہے۔ اس وقت مدرسہ بند بھی ہوتا ہے۔ اس وقت چندہ کی مہم میں نکلنے سے تعلیم کا حرج نہیں ہوتا، مگر دورانِ تعلیم کبھی گیہوں کا موسم اور کبھی دھان کی فصل، اس کیلئے اساتذہ وطلبہ باقاعدہ چندہ کی مہم میں نکل جاتے ہیں، اور تعلیم بے رونق ہوکر رہ جاتی ہے۔ چندہ ایک ضرورت کی چیز ہے، اس میں اہل انتظام ایسے لوگوں کو لگائیں جن کے آنے جانے سے تعلیم پر اثر نہ پڑے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مدرس ہی پڑھائے، وہی چندہ کرنے جائے، طلبہ کو بھی استعمال کرے، اس طرح تو تعلیم کا مزاج کبھی نہیں بن سکتا۔ کبھی کوئی ہنگامی حالت ہوتو مضائقہ نہیں۔ ان امور غیر مقصودہ کی وجہ سے، خواہ وہ کتنے ہی ضروری ہوں۔ تعلیم میں افسردگی آجانا لازم ہے۔

۹............مہراج گنج کے جن مدارس میں جانا ہوا، وہ سب بحمداللہ حکومت کے الحاق سے پاک ہیں۔ اس لئے ان میں مکروفریب، کذب ونفاق، جعلی رجسٹروں کی وہ خرابیاں نہیں ہیں، جن میں بورڈ کے زیادہ تر مدارس ملوث ہوچکے ہیں۔ لیکن باہمی تنافس وتحاسد اور اپنے معمولی مفادات کے لئے اختلافات نے ان مدارس کی جڑ کو کمزور بنادیا ہے، ہر ایک اپنے حق کو حاصل کرنے کیلئے بے تاب رہتا ہے، اور اس پر جو حق عائد ہوتا ہے، اس سے پہلوتہی کرتا ہے۔ یہ بات تعلیمی اداروں میں عام ہے کہ اہل انتظام کی جو ذمہ داریاں ہیں، انھیں وہ پورے طور پر نہیں نباہتے، اور اس کیلئے وہ مختلف

اعذار تراش لیتے ہیں، اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ان اعذار کی وجہ سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ لیکن دوسروں کی ذرا ذرا سی کوتاہی پر مواخذہ و دار و گیر کرتے ہیں۔ اس وقت وہ قرآن و حدیث کے حوالے دینے لگتے ہیں۔ یہی حال طلبہ و مدرسین کا بھی ہے، طلبہ یہ تو خوب جانتے ہیں کہ ہمارا حق مدرسہ کے اہل انتظام پر اور اساتذہ پر کیا ہے۔ لیکن انھیں یہ خیال نہیں رہتا کہ مدرسہ کا، تعلیم کا، اور اساتذہ کا حق ہم پر کیا اور کتنا ہے، حضرات مدرسین بھی کوتاہیوں پر لڑائی ٹھانے رہتے ہیں۔ ہونا یہ چاہئے کہ ہم پر جو حق ہے اسے پورا کرنے کی پوری جد و جہد کریں، اور اعذار کو حتی الامکان دور رکھیں، اور صبر و رضا سے کام میں لگے رہیں، یہ حدیث کا مضمون ہے اس سے انشاء اللہ آخرت میں جو کچھ ملے گا، وہ تو ہے ہی، دنیا میں بھی اطمینان خاطر نصیب ہوگا۔ اور یہی نہ ہونے کی وجہ سے اختلافات پیدا ہوتے ہیں، بڑھتے ہیں۔ عوام میں پہونچتے ہیں۔ دین اور اہل دین کی بدنامی ہوتی ہے۔ الگ الگ مدارس قائم ہوتے ہیں اور لوگ بدکنے لگتے ہیں۔

ان سطور کا تعلق صرف ان مدارس سے نہیں ہے، جن میں بندہ اس سفر میں حاضر ہوا، بلکہ یہ بات عام طور سے تمام مدرسوں پر صادق آتی ہے۔ ہاں یہ ہے کہ کہیں خدمت کی مقدار زیادہ ہوتی ہے تو، تو یہ آثار دبے رہتے ہیں، اور کہیں تعلیمی خدمت کم ہوتی ہے تو یہی آثار ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بہر حال تمام مسلمانوں کیلئے عموماً اور اہل انتظام اور اہل علم کیلئے خصوصاً یہ باتیں بہت زیادہ مستحق توجہ ہیں۔

تاہم ان تأثرات کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ مدارس کی افادیت باقی نہیں رہی۔ نہیں، بلکہ ان مدارس میں جانے کے بعد، تمام کوتاہیوں اور خرابیوں کے باوجود ان مدارس کی قدر و قیمت روز افزوں ہی محسوس ہوتی ہے اور ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہر ہر آبادی میں مدرسے قائم کئے جائیں۔ دنیا برق کی رفتار سے دین سے دور بھاگ رہی ہے، دین سے غفلت، جہل اور بے پروائی بڑھتی جارہی ہے، اس حال میں دین کے تحفظ و بقاء کیلئے اگر کوئی مرکزِ امید ہے تو یہی مدارس ہیں، معصوم بچے ان مدارس

میں اس وقت آتا ہے جب اس کا دل دنیا کے ہر نقش ونگار سے پاک ہوتا ہے۔ وہ اس دینی ماحول میں ایک معتد بہ مدت گزارتا ہے، اس کے سامنے صرف دین ہوتا ہے، اس طرح اس کا ایک دینی مزاج بن جاتا ہے، پھر بعد میں وہ بگڑتے بگڑتے بھی دین سے لگا لپٹا رہتا ہے، اور انھیں مدارس سے بعض اعلیٰ درجہ کی صلاحیتیں سنور اور نکھر کر میدانِ عمل میں اترتی ہیں، تو لوگوں کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ یہ مدارس شرور وفتن اور جہل و ضلالت کی طغیانی اور طوفان خیزی میں سفینۂ نجات ہیں۔ ان میں کام کرنے والوں کو وقتاً فوقتاً جھنجھوڑنے اور ان کے فرائضِ منصبی یاد دلاتے رہنے کی ضرورت ہے، عوام الناس کے مقابلے میں ان کے اندر اخذ وقبول اور تأثر کی زیادہ صلاحیت ہے، کیونکہ ان کا علم انھیں بہت سی وہ باتیں یاد دلاتا رہتا ہے، جنھیں عوام الناس جانتے ہی نہیں۔ میں نے اپنے سفر میں اس بات کو خوب محسوس کیا، میں تو جہاں جاتا تھا شرم سے ڈوبا رہتا تھا کہ میں کون ہوتا ہوں، ان حضرات اہل علم سے کچھ کہنے والا۔ مگر ہوتا یہ تھا کہ یہ حضرات سراپا شوق بن کر سنتے تھے، اور ان کے چہروں سے قبولیت اور تأثر کے جذبات صاف محسوس ہوتے تھے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

۱۰.........آخری بات یہ ہے کہ طلبہ کی تعلیم وتربیت کے ماحول کو بنانے اور اس کو باقی رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر ہفتہ ایک مرتبہ اجتماعی طور سے طلبہ کو تذکیر کی جائے، نامناسب امور پر متنبہ کیا جائے۔ اچھے کاموں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ پڑھنے لکھنے کا ذوق بیدار کیا جائے۔ ہر ہفتہ مدرسہ کے اساتذہ میں سے کوئی صاحب تھوڑی دیر طلبہ کو سمجھا دیا کریں، تو اس کا بہت اچھا اثر ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو اخلاص سے خدمت علمِ دین اور خدمت دین کی توفیق بخشیں۔ آمین

☆☆☆☆☆

احتساب

دین اسلام! اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ مذہب ہے۔ اس کے اصول وکلیات حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان کئے ہیں، اوران اصول وکلیات کی تشریح وتبیین اور پھر ان کی عملی تشکیل جناب نبی کریم ﷺ نے، اورآپ کی بخشی ہوئی تعلیمات کی روشنی میں خلفاء راشدین اورحضرات صحابہ کرام **رضوان اللہ علیہم اجمعین** نے کی، دین اسلام اپنی علمی وعملی شکل میں اسی دائرہ میں مکمل ہوگیا ہے، اب اس میں کمی اور زیادتی کی گنجائش نہیں ہے، اگراس میں کمی کی گئی، تو دین کو ناقص کردیا گیا، اوراگراس میں کچھ اضافہ کیا گیا، تو وہ بدعت ہے۔ اوررسول اللہ ﷺ کے فرمان کی رُو سے ضلالت وگمراہی ہے، یہ بات ہر مسلمان جانتا ہے، اس کیلئے دلائل اتنے واضح اور متواتر ہیں کہ انھیں ذکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اوراس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ دین نقل وروایت پر مبنی ہے۔ یعنی جو کچھ رسول اللہ ﷺ، خلفاء راشدین اور حضرات صحابہ سے صحیح طور پر منقول ہے، وہی دین ہے، اس کے علاوہ دین کے نام پر کچھ کیا جائے تو وہ محل تامل ہے۔ اوراسے ''اتباع ہویٰ'' کہنا چاہئے۔

ہم جو دور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اورجن حالات سے گزر رہے ہیں۔ اس میں ایسا محسوس ہورہا ہے کہ ''اتباع ہویٰ'' یعنی اپنے ذاتی خیالات ونظریات کودین کے رنگ میں پیش کرنے کی بلا عام ہوتی جارہی ہے۔ وہ دین جو قرآن کریم اور احادیث وآثار اور رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کی سیرتوں میں نظر آتا ہے، اب اس پر اکتفا کرنا لوگوں کے لئے مشکل نظر آرہا ہے، جو چیزیں ان کی سیرتوں میں عام تھیں، وہ کم ہوتی جارہی ہیں۔ اورجن چیزوں کا ان کے حالات میں دور دور پتہ نہ تھا، ان کی

بہتات دکھائی دے رہی ہے اور ایسا محض انفرادی طور پر نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ جماعتیں بنی ہوئی ہیں، مختلف ادارے موجود ہیں، جو دین کے نام پر دین سے انحراف کا سبق پڑھاتے ہیں۔

آدھی صدی سے کچھ زائد ہوا، ایک صاحب کی قیادت میں ایک جماعت وجود میں آئی، جس کے بنیادی دستور میں صحابہ وسلف کے دائرے سے خروج کا ایک چور دروازہ کھولا گیا، اس وقت کے علماء راسخین نے اس پر ٹوکا، تو اس جماعت کے لوگ بھی، اور دوسرے بعض غیر متعلق حضرات بھی بہت برہم ہوئے، خوب گرما گرم بحثیں ہوئیں، اس وقت بہت سے لوگوں کے دماغ میں یہ بات کسی طرح اترتی ہی نہ تھی کہ یہ انحراف کا کوئی چور دروازہ ہے۔ لیکن یہ دروازہ چوڑا ہوتا گیا، یہاں تک کہ اب آدھی صدی کے بعد وہ ایک عظیم پھاٹک بلکہ شاہراہِ عام بن گیا ہے جس سے یہ جماعت اور اس کے متعلقہ ادارے پورے دین کا حلیہ تبدیل کرتے جا رہے ہیں۔

اس جماعت کے افراد ونظریات پر مبنی ایک ادارہ ضلع اعظم گڈھ میں بلریا گنج میں ہے، یہ ادارہ ایک دینی ادارہ کہلاتا ہے، بلکہ دین کی نشأۃ ثانیہ، اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی طرف اقدام کرنے کا علمبردار ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ اس ادارہ میں جا کر اور اس کے طلبہ واساتذہ اور منتظمین سے مل کر دین کا تصور کم اور انگریزیت اور انگریزوں کی نقالی کا احساس زیادہ ہوتا ہے، یہ ادارہ دینی مدرسہ نہیں انگریزی کالج محسوس ہوتا ہے، طلبہ کے سروں پر انگریزی بال، ٹوپی ندارد، داڑھی کٹی ہوئی یا منڈی ہوئی، ٹخنوں سے نیچے پاجامہ یا پتلون، نگاہوں میں شوخی وشرارت، یہ سب کس چیز کی علامتیں ہیں؟

ادھر چند سالوں سے اس ادارہ کے ابنائے قدیم اپنا جلسہ کرتے ہیں، ابنائے قدیم کے لفظ سے یہ تصور ابھرتا ہے کہ یہ یہاں کے فارغ شدہ علماء ہوں گے، لیکن آپ جب ان کو ملاحظہ کریں گے، تو کسی زاویہ سے یہ محسوس نہ ہوگا کہ یہ علمائے دین ہیں، اور

فی الحقیقت ہیں بھی نہیں، یہ ادارہ انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں تک پہونچے کا ایک زینہ ہے، چند جماعتیں پڑھ کر یہاں کے طلبہ زیادہ تر انگریزی درسگاہوں کا رُخ کرتے ہیں، اور بچی کھچی اسلامیت کی علامتیں جوان کے وجود پر رہ جاتی ہیں وہ بھی وہاں جا کر صاف کر دیتے ہیں، یہی ابنائے قدیم یہاں جلسے کراتے ہیں، یہ جلسے دینی جلسے نہیں ہوتے، دین کے نام پر لہو ولعب اور تماشوں کا طوفان ہوتا ہے، تھیٹر سجتے ہیں۔ ڈرامے پیش ہوتے ہیں، اور ان پر ''اسلامی'' کا لیبل لگا دیا جاتا ہے۔ مشاعرے ہوتے ہیں، اور اس سال تو یہی عمل متعلقہ لڑکیوں کے کالج میں دہرایا گیا، دور دور سے عورتیں بلائی گئیں، اور جو کچھ تماشا دکھلایا گیا، اس سے اہل احساس بلبلا اٹھے، اور یہ سب دین کے نام پر ہوتا ہے، نہ جانے دین کے اندر ان تماشوں کی سند کیا ہے، یا صرف انگریزوں کی نقالی ہے؟ چونکہ یہ قوم اسلاف کی ذہنی غلامی سے آزاد ہے، اس لئے اپنے جس ذہنی خیال کو چاہے دین کا درجہ دیدے۔

دین ایک سنجیدہ، باوقار اور مقدس چیز ہے، اس کو لہو ولعب اور کھیل تماشا بنا دیا ہے۔ اس جماعت نے اور اس دارے نے! اس کے ساتھ ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس دینی ادارہ کا رئیس الاساتذہ ایک ایسا شخص ہے، جو منکرِ حدیث ہے، اور بہت سے اجماعی اور متواتر مسائل کا منکر ہے۔ اس نے ''حقیقت رجم'' جیسی خلاف دین وعقل کتاب لکھی ہے، جس سے خود وہاں کے کچھ لوگ نالاں ہیں۔ مگر اس کے باوجود اب بھی وہ کرسیٔ صدارت پر براجمان ہے، نہ جانے فکر ونگاہ کا یہ توسع دین اسلام کو کس صورت میں مسخ کرے گا۔ اس ادارہ کی ان بے راہ رویوں کی وجہ سے عوام کو دین کے متعلق سخت التباس ہو رہا ہے۔

یہاں ایک شکایت اپنے ان اکابر اور علماء سے بھی ہے، جو علمائے اہل حق کے زمرہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اور ان کے اسلاف واجداد دین کے سچے داعی اور مخلص خدمت گزار تھے، ان سے شکایت یہ ہے کہ وہ بھی کبھی کبھی لہو ولعب کی ان مجالس میں

اور ان کے پوسٹروں میں نظر آتے ہیں، چنانچہ حالیہ جلسہ میں حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ کے صاحبزادہ والا مرتبت مولانا محمد سالم صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم (وقف) دیوبند بھی تشریف لائے تھے، ان کا اس جلسہ میں شریک ہونا، سخت اشتباہ کا باعث ہے، پھر لطف یہ کہ وہ اس میں اپنی بات بھی پورے طور پر نہ کہہ سکے۔ کاش یہ حضرات ان مجالس کی شرکت سے اجتناب کرتے، تاکہ عام مسلمانوں کو اس سے التباس نہ ہوتا۔ (ماہنامہ انوار العلوم جہانا گنج، نومبر ۱۹۹۶ء)

☆☆☆☆☆

مدارس نسواں

یہ تحریر مفتی محمد نعیم صاحب مظاہری، الہ آبادی (مدیر مجلّہ، مفتاح الخیر، جلال آباد، مظفر نگر) کے رسالہ ''مروجہ مدارس نسواں شریعت کی روشنی'' کیلئے بطور مقدمہ کے لکھی گئی، مذکورہ رسالہ شائع ہو چکا ہے، اور اس موضوع پر نہایت جامع رسالہ ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العٰلمین، والعاقبۃ للمتقین، والصلوۃ والسلام علیٰ سید المرسلین، صلی اللہ علیہ وعلیہم وعلیٰ آلہم وصحبہم أجمعین، أمابعد! انسانیت کا عروج کیا ہے؟ اس کا بارگاہِ قدس کی جانب مائلِ پرواز ہونا! اور انسانیت کا زوال کیا ہے؟ اس کا دنیا کو اور متاعِ دنیا کو کعبۂ مقصود بنا لینا خالق انسانیت ﷻ کا ارشاد ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِىْ آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ O وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِآيَاتِنَا فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ O

اور سنا دو ان کو اس شخص کا حال جس کو ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں، پھر وہ ان کو چھوڑ کر نکل گیا، پھر اس کے پیچھے شیطان لگ گیا، پس وہ گمراہوں کی صف میں شامل ہوا۔ اور اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں کی بدولت اس کا رتبہ بلند کرتے، لیکن وہ تو زمین ہی کا ہو رہا، اور اپنی خواہش کے پیچھے چل پڑا تو اس کا حال کتے جیسا ہے کہ اس پر بوجھ لادو تو بھی ہانپے اور چھوڑ دو تو بھی ہانپے، یہ ان لوگوں کی مثال ہے جنھوں نے ہماری

آیات کو نہیں مانا، ان کو یہ احوال سنادو، شاید وہ غور کریں۔ (الاعراف ۱۷۵، ۱۷۶)

ان دونوں آیتوں میں غور کیجئے، تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی آیات کو ماننا اور ان کے سہارے چلنا انسانیت کے رتبہ کی بلندی ہے، اور اس کی آیات کے ہوتے ہوئے، ان کے احکام سے نکل جانا، دنیا کی پستی کی جانب اوندھا ہوجانا، اور اپنی خواہش نفس کی پیروی کرنا، انسانیت کی ذلت ہے، جو اسے کتے کی طرح بنا کر چھوڑتی ہے، جیسے وہ ہمہ وقت ہانپتا رہتا ہے ویسے ہی یہ دنیادار آدمی بھی حرص دنیا میں ہانپتا ہی رہتا ہے۔

قرآن کریم کی اس تعلیم اور اس اسلامی ہدایت کو پیش نظر رکھ کر جب مسلمانوں نے دنیا کے کسی کام کو ہاتھ میں لیا، خواہ وہ تجارت ہو، زراعت ہو، ملازمت ہو، حکومت ہو، غلامی ہو، صلح ہو، جنگ ہو، ہر ایک کو دین بنالیا، عبادت کے رنگ میں ڈھال لیا۔ اسے عروج وترقی کا زینہ بنالیا اور کفر نے جب اس ہدایت کو قبول نہیں کیا اور اپنے ذاتی نظریات اور طبعی شہوات کے پیچھے دوڑتا رہا، تو اس نے عبادات کو بھی اپنے اوپر وبالِ جان بنالیا۔

مولانا روم فرماتے ہیں ؎

ہرچہ گیرد علتی علت شود　　کفر گیرد کاملے ملت شود

بیمار جو کچھ اختیار کرتا ہے، اسے بھی عیب دار بنا دیتا ہے، اور کامل کسی عمل کو اختیار کرتا ہے، تو وہ ملت بن جاتا ہے، اسلام نے تعلیم وتدریس کو لیا تو اسے ایک عبادت بنا کر برتا، حسن نیت کی تعلیم دے کر اسے تقدس عطا فرمایا، پڑھنے پڑھانے کا مقصد اور حاصل، دنیا اور حُطامِ دنیا کو نہیں، آخرت اور رضاء الٰہی کو قرار دیا، اور اسی کو دنیاداروں نے لیا، بالخصوص سب سے بڑی مادہ پرست قوم جس نے آخرت سے بالکل ہی رشتہ توڑ رکھا ہے، یعنی انگریزوں نے تو جس چیز کو ہاتھ لگایا اسے دنیا بنا کر چھوڑا، یہ قوم تجارت کو دین کیا بناتی، تعلیم ہی کو تجارت بنا دیا۔ اور اس تجارت کو اتنی ترقی دی کہ

تعلیم اور تعلیم کے فوائد تو غائب ہو گئے، البتہ تجارت فروغ پا گئی، آج اس مادہ پرست دنیا نے شرح خواندگی تو بڑھا دی، ہر خطۂ زمین پر اسکول، کالج، یونیورسٹی ایک سے بڑھ کر ایک کھلے ہوئے ہیں۔ جن میں ہر ایک کے اندر ہزاروں ہزار طلبہ پڑھتے ہیں، لیکن اس کا تعلیم کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ جہالت اور بڑھ گئی، بدنیتی اور بدعملی میں اضافہ ہی ہوا، خودغرضی کا دور دورہ ہو گیا، انسان کے اندر جتنے رذائل ہو سکتے ہیں سب اپنی اپنی انتہائی شکل میں خونخوار درندے اور سانپ بچھو بن کر انسانیت کو چیر پھاڑ رہے ہیں اور اسے ڈس رہے ہیں۔

اس قوم نے جس طرف توجہ کر دی، بنی چیز کو بگاڑ کر رکھ دیا۔ تعلیم کی بربادی کا ایک رُخ تو یہ ہے، ایک دوسرا رُخ اور ہے۔ اس کی طرف اور بھی ستم ڈھایا ہے، ایک پردہ نشین صنفِ انسانی، جس کو قدرتِ الٰہی نے ایسا جذبہ اور ایسا مزاج بخشا ہے کہ وہ ہر ایک کی دستبرد سے بچ کر کسی ایک کی ماتحتی اور اس کی حفاظت میں رہے، خانہ نشین رہ کر ضروری تعلیم حاصل کرے، اپنے شوہر کی اطاعت کرے، اس کی نگرانی میں اولاد کی پرورش کرے، اور اس طرح معاشرہ کیلئے اچھے افراد مہیا کرے۔ اس کا میدانِ کار فطری اور خِلقی اعتبار سے مردوں کے میدان سے بہت حد تک الگ ہے۔ کافروں کی یہ قوم اس کی طرف پلٹی، تو ایک بالکل خلاف فطرت نعرہ دیا کہ عورت و مرد مساوی ہیں، بیشک بہت سے حقوق وفرائض میں کسی درجے میں مساوات ضرور ہے، لیکن کیا ہر لحاظ سے دونوں میں برابری ہے، اس کا تصور وہی کر سکتا ہے، جس کا کاسۂ سر عقل وخرد سے بالکل ہی تہی مایہ ہو چکا ہو، لیکن عقل ودانش کا بلند آہنگ دعویٰ رکھنے والی کافر قوم، اس نعرہ کو لے کر اٹھی، اور عورتوں کو اس مساوات کے نام پر مختلف حیلوں سے گھر کے باہر نکال لائی۔ اس قوم کی بدنیتی نے یہ گوارا نہیں کیا کہ یہ امانت کسی اور کی حفاظت میں رہے۔ اس نے سازش کی کہ اس امانت کے تحفظ کو توڑ دو، پھر ہر بوالہوس کو اس میں خیانت کرنے کا موقع مل جائیگا، آج ہم یہی تماشا دیکھ رہے ہیں۔

عورت کو باہر نکالنے کا ایک دلفریب حیلہ کفر نے یہ تراشا کہ مردوں کیلئے تو تعلیم گاہیں ہیں، جہاں وہ اجتماعی طور پر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ عورتوں کیلئے تعلیم گاہیں کیوں نہ ہوں۔ انھیں گھروں میں کیوں پڑھایا جائے۔ پھر اس نے عورتوں کے لئے اسکولوں اور کالجوں کا دروازہ کھولا اور مردوں کے دوش بدوش عورتوں کو ان دانش گاہوں میں داخل کیا، مگر ان کے داخلے کے بعد دانش گاہوں میں جو کچھ بے دانشی کا عفریت ننگا ناچ ناچا ہے، تو خود یہ قوم بھی تھرا اٹھی، اس طریقۂ تعلیم کو مذہب اسلام پر ایمان رکھنے والا آسانی سے قبول نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اسلام نے مرد اور عورت کے درمیان جو خطِ فاصل قائم کیا ہے، وہ اتنا پختہ ہے کہ مسلمانوں کا عمومی مزاج اسے توڑ نہیں سکتا تھا، اس طریقۂ تعلیم سے مسلمان عموماً دور ہی رہے۔ پھر کفر نے اس سے خوبصورت حیلہ نکالا، جس سے مسلمان ابتداءً تو بدکیں گے، مگر آہستہ آہستہ قبول کرلیں گے، وہ یہ کہ مردوں سے الگ صرف عورتوں کے مدارس اور اسکول قائم کئے جائیں۔ ہندوستان میں جس زمانے میں علی گڑھ میں سرسید مرحوم کالج کی بنیاد ڈال رہے تھے، اسی دور میں ایک اور صاحب لڑکیوں کیلئے اسکول کی تعمیر کررہے تھے، سرسید نے اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود اس کی مخالفت کی تھی۔ مگر ان کی مخالفت دھری رہ گئی، اور لڑکیاں گھروں سے نکل نکل کر اسکول میں آنے لگیں۔ علماء نے تو اس کو کبھی قبول نہیں کیا۔ عام مسلمانوں میں بھی اس کی پذیرائی بہت زیادہ نہیں ہوئی، تاہم سلسلہ چل پڑا، عام طور پر نہ سہی، خاص طور پر ہی لڑکیوں کے اسکول اور کالج کھلنے لگے۔ کفر نے جب اس میں بھی خاطر خواہ کامیابی نہیں دیکھی، تو آزادی ہند کے بعد جب کہ کفر کی یلغار بڑھتے بڑھتے طوفان بن گئی تھی، مسلمانوں کے دیندار گھرانے بھی اس کی دستبرد میں آکر دینداری کی روش کو گھروں میں سے اذن رخصت دے رہے تھے، اس وقت کفر نے دینداروں بلکہ علماء کے کان میں پھونکنا شروع کیا کہ اب مسلمانوں میں دینی تعلیم عام کرنی ضروری ہے، اس کیلئے مردوں کے واسطے دینی مدارس بہت ہیں۔ عورتیں گھروں میں تعلیم تھوڑی بہت

حاصل کرلیتی ہیں، لیکن وہ ناکافی ہے۔

مردم شماری بہت بڑھ گئی ہے، اور دنیا کی معیشت کی پیچیدہ الجھنوں اور مشاغل کے بعد اتنا موقع نہیں مل پاتا کہ گھروں میں بچیاں اب یہ ناکافی تعلیم بھی حاصل کرسکیں، اس لئے ان کے لئے علیحدہ دینی درس گاہیں قائم ہونی چاہئیں، جن میں ابتداء سے لے کر عالم فاضل کے درجے تک تعلیم ہو سکے، ان درس گاہوں میں پردے کا پورا اہتمام ہو، باہر کی ہوا کا ان میں گزر بھی نہ ہو، اسلام کے ان تمام احکام کی پابندی کے ساتھ جن کا تعلق عورتوں سے ہے، ان مدارس میں تعلیم نسواں کا انتظام ہو، کفر کا یہ منتر بہت کامیاب ثابت ہوا، عام لوگوں نے نہیں، دنیادار انگریزی دانوں نے نہیں، عالم وفاضل کہلانے والے دینداروں نے اس راگ میں راگ ملائی، اور اس دلفریب نعرے کے ساتھ مدارس نسواں قائم کرنے لگے، ملک کے طول وعرض میں نہ جانے کتنے مدارس نسواں وجود میں آ گئے۔ ان میں تعلیم شروع ہوگئی، لوگوں نے اپنے اپنے گھر کی امانت بڑے شوق سے اپنے ہاتھوں لاکر ان مدارس کے حوالے کردی، جن کے منتظم اجنبی مرد ہیں، اب یہ لڑکیاں اپنے ماں باپ اور اپنے خاندان کی تحفظ میں نہیں ہیں، اجنبی مردوں کے تحفظ میں ہیں، انھیں اجنبی مردوں کے تحفظ میں جن سے بچانے کے لئے اسلام نے عورتوں کو گھروں میں بٹھایا تھا، ماں باپ اور خاندان کے آہنی حصار میں محفوظ کیا تھا۔ دینی تعلیم کے عنوان پر لڑکیوں کو گھروں سے نکال لانا بہت آسان ہوا۔ ماں باپ نے بچی کو لے جاکر مدارس نسواں کے حوالے کردیا، ان کی ذمہ داری بھی کم ہوگئی، اور وہ زیورِ تعلیم سے آراستہ بھی ہوگئی، کتنا آسان یہ سودا ہے؟ اور پھر حال یہ ہوگیا کہ خاندان کے خاندان ایسے ہیں کہ ان میں سے کوئی لڑکا علم دین حاصل کرنے کے لئے دینی مدارس میں نہیں بھیجا جاتا، لیکن لڑکیاں سب بھیجی جاتی ہیں، لڑکوں کی تعلیم ارزاں ہے مگر اس میں آنے والے بہت کم ہیں، اور لڑکیوں کی تعلیم بہت گراں ہے، ہر مدرسہ نسواں گراں ہیں، مگر وہاں داخلوں کی گنجائش نہیں رہتی، آخر یہ کیا ہے کہ لڑکیوں کو

عالمہ، فاضلہ بنانے کا اتنا شوق ہے، اور لڑکوں کے باب میں اتنی بے شوقی ہے۔

اگر دین مطلوب ہے، دینی تعلیم مطلوب ہے، تو اس کا زور لڑکوں کے اندر ہونا چاہئے، کیونکہ مردوں کا دائرۂ کار عورتوں سے بہر حال بہت زیادہ ہے۔ مگر معاملہ بالکل برعکس ہے، آثار سے نیتوں کا پتہ چلتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس تعلیم کے زور وشور کے پیچھے کوئی دینی جذبہ نہیں ہے، مدارس نسواں تجارت گاہیں ہیں، دین کے نام پر تجارت کا کاروبار چل رہا ہے، اور مسلمان اپنا محفوظ سرمایہ اس میں لگا کر نفع حاصل کرنے کے بجائے راس المال بھی کھوتے جا رہے ہیں۔

عورتوں کے یہ مدارس درحقیقت اللہ ورسول کی نافرمانی کو عام کرنے کے ذرائع ہیں، ان سے اسلامی احکام ٹوٹتے ہیں اگر مدارس نسواں ایسے ہی ضروری ہوتے تو عورتوں کی تعلیم تو قرونِ اولیٰ میں بھی ضروری تھی۔ ہمارے اسلاف جس طرح سے مردوں کے مدارس قائم کرتے اور چلاتے تھے عورتوں کے لئے بھی مدارس قائم کرتے، لیکن یہ بات سرے سے ان کے ذہن میں نہ آئی اور ایسا نہیں تھا کہ بے خبری سے انھوں نے اس کو نہ سوچا ہو، یا اس وقت کے حالات میں مدارس نسواں کی ضرورت نہ رہی ہو جب عورتوں کی تعلیم ضروری ہے، تو بہر حال اس کا کوئی طریقہ ہونا چاہئے تو اگر مردوں کے لئے مدرسے ہو سکتے تھے تو عورتوں کے لئے کیوں نہیں ہو سکتے تھے، مگر انھوں نے اسے سوچا بھی نہیں، ہندوستان میں ہم آزادی سے پہلے دینی مدارس نسواں کا کوئی تصور نہیں پاتے، تو اتنے دنوں تک علماء اتنے بڑے فریضہ سے کیوں غافل رہے؟

بات یہ ہے کہ ان کے سامنے قرآن کی آیات تھیں، جن میں حکم دیا گیا ہے کہ عورتیں اپنے گھروں میں مستقل جمی رہیں، باہر نہ نکلیں استثنائی صورتیں علیٰحدہ ہیں، انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ گھروں سے نکل کر جاہلیت والی مٹر گشتی سے منع کیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى۔ اپنے

گھروں میں جم کر رہو، اور سابقہ جاہلیت کی طرح باہر نہ پھرو۔

یہ حکم امہات المومنین کے حق میں نازل ہوا ہے، لیکن تمام عورتیں اس کے ذیل میں آتی ہیں۔ اس آیت میں صاف حکم ہے، کہ عورتیں اپنے تمام اوقات گھروں میں ہی رہیں، مجبوری کی بات علیحدہ ہے، مجبوری کبھی کبھی ہوتی ہے اور تعلیم کے لئے باہر نکلتے رہنا اس کے حکم کی صریح خلاف ورزی ہے۔

حدیث میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

المرأة عورة فإنها إذا خرجت من بيتها استشرفها الشيطان و إنها لتكون أقرب إلى الله منها في قعر بيتها (رواه الطبراني في الاوسط ورجاله رجال الصحيح)

عورت چھپا کر رکھنے کی چیز ہے، اور بلاشبہہ جب وہ اپنے گھر سے باہر نکلتی ہے، تو اسے شیطان تکنے لگتا ہے، اور یہ بات یقینی ہے کہ عورت اپنے اوقات میں اس وقت سب سے اللہ سے قریب ہوتی ہے، جب کہ وہ اپنے گھر کے اندر ہوتی ہے۔ عورت گھر سے باہر نکلی نہیں کہ شیطان کی ہوسناک نگاہوں کا نشانہ بن جاتی ہے، اور مدارس نسواں کیلئے تو جھنڈ کی جھنڈ باہر نکل آتی ہیں، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پھر شیطان کا کیا جمگھٹ لگتا ہوگا اور شیاطین الانس کا جمگھٹ تو مشاہدہ میں آتا رہتا ہے۔

حضرت امام مالک علیہ الرحمہ کا ارشاد ہے کہ **لن يصلح آخر هٰذه الامة الا بما صلح به اولها** ۔ اس امت کے پچھلے لوگوں کا سدھار ٹھیک اسی طریقے میں ہے، جس سے پہلے لوگوں میں سدھار آیا تھا۔ اب خواہ ضرورت، تقاضائے زمانہ اور ماحول کی مجبوری کا نام لے کر کتنا ہی غوغا مچایا جائے، لیکن قرآن کا قطعی حکم منسوخ نہیں ہوسکتا اور نہ حدیث کا مضمون بدل سکتا ہے، اور اب تو یہ بات بکثرت مشاہدہ میں آتی ہے کہ مدارس نسواں مفاسد کا سرچشمہ بن گئے ہیں، ان میں بناؤ بہت کم اور بگاڑ بہت زیادہ ہے۔ مدارس نسواں کی تعلیم کا فائدہ کیا ہوا؟ کیا مسلمانوں کی نسلیں سدھر گئیں؟ کیا ان میں خیر کی مقدار پہلے سے بڑھ گئی؟ ہم تو دیکھتے ہیں کہ ان مدارس کی تعلیم یافتہ

خواتین عموماً شوہروں کی فرمانبرداری کرنے کے بجائے ان پر حکومت جماتی ہیں۔ بعض مدارس نسواں کے ذمہ داروں سے معلوم ہوا کہ ان میں شرح طلاق بہت زیادہ ہے، یہ عورتیں خاندان کا اچھا فرد ثابت نہیں ہوتیں، بہت عرصہ سے یہ حقیر خادم تعلیم ودین، ان مدارس نسواں کو مضر اور غلط سمجھ رہا ہے، عقل کی روشنی میں بھی اور نقل وروایت کی روشنی بھی اور مشاہدہ کی روشنی میں بھی، اپنے وعظوں میں اور مجلسوں میں اس کی بیان کرتا رہتا ہے۔ اس سلسلے میں لکھنے کا اتفاق پہلی مرتبہ ہو رہا ہے۔

رہا یہ سوال کہ مدارس نسواں اگر بند کردئے جائیں، تو عورتوں کی تعلیم کیونکر ہو؟ تو اولاً اس سوال کے جواب کی ذمہ داری کسی مفتی اور عالم پر نہیں ہے، مفتی کی ذمہ داری ہے کہ ناجائز کو ناجائز کہے، چاہے اس کا کتنا ہی چلن ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **قل لایستوی الخبیث والطیب ولو أعجبک کثرۃ الخبیث** ۔ تم کہہ دو کہ پاکیزہ چیز اور گندی چیز برابر نہیں ہوسکتی، چاہے گندگی اپنی کثرت کی وجہ سے تمھیں بھلی معلوم ہونے لگے، تو گندی چیز گندی ہی رہے گی، چاہے ماحول میں تعفن کتنا زیادہ ہو گیا ہو اور اتنے زمانے تک رہ گیا ہو کہ لوگوں کی قوت شامہ اس سے مانوس ہو گئی ہو اور اسی کو اچھا سمجھنے لگی ہو۔ دوسرے، یہ کہ اس سوال کا جواب وہی ہے، جو قرون اولیٰ سے معمول بہ رہا ہے، یعنی گھروں میں ان کی تعلیم کا انتظام کیا جائے، اور ضرورت کے بقدر تعلیم کا انتظام کرنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے، کہ اس سے بھی ہمت ہاری جائے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح فہم نصیب کریں اور مسلمانوں کو صراطِ مستقیم پر گامزن فرمائیں اور ہر طرح کے شرور فتن سے محفوظ رکھیں۔

ألّٰلھم أرنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه وأرنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه، آمین یا رب العٰلمین

وآخر دعوانا إن الحمد للہ رب العٰلمین

☆☆☆☆☆

اربابِ مدارس اور اساتذہ کی ذمہ داریاں

طلبہ کی تعلیم وتربیت کے باب میں

شوال کے مہینہ میں عربی مدارس میں تعلیم کا آغاز ہوتا ہے، تعلیمی سرگرمیاں شروع ہوجاتی ہیں، اساتذہ وطلبہ رمضان المبارک کے وقفے کے بعد ایک تازہ نشاط کے ساتھ مصروف عمل ہوجاتے ہیں، امت کے یہ دونوں طبقے دین کی ایک بہت ہی اہم خدمت میں مصروف ہیں، وہ یہ کہ دین ومذہب کی بقاء اور اس کے استحکام کا مدار اس کے علم اور عمل پر ہے، بلکہ اصلاً مدارِ کار علم ہی پر ہے، کیونکہ اگر دین کا علم رُخصت ہوا یا مضمحل ہوا، تو عمل خود بخود فنا ہوجائے گا۔ رسول اللہ ﷺ کے دور سے آج تک علمی تسلسل قائم ہے، اسی لئے آج تک دین اپنی اصلی حالت میں موجود ہے، ایک نسل جو علم حاصل کرچکی ہے وہ اسے دوسری نسل کو منتقل کرتی ہے، اساتذہ علم منتقل کرتے ہیں، طلبہ اسے اپنے سینوں میں محفوظ کرتے ہیں، اسی طرح خدمت دین کا یہ سلسلہ چلا آرہا ہے، اور ان شاء اللہ قیامت تک چلتا رہے گا، خدمت علم کی اہمیت کے پیش نظر اس کے آداب وشرائط اور ذمہ داریاں بھی بہت اہم ہیں اس باب میں اساتذۂ وذمہ دارانِ مدارس کی مسئولیت بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ انھیں نئی نسل کی تعلیم وتربیت پر خاص نگاہ رکھنی چاہئے، خود بھی علم وعمل کے تقاضوں کو پورا کریں۔ اور طلبہ کو بھی ان تقاضوں کا پابند بنائیں۔ طلبہ اپنے اساتذہ سے علم بھی سیکھتے ہیں، اور اخلاق وآداب اور عادات واطوار بھی سیکھتے ہیں، طالب علم اور استاذ کے درمیان جو باہمی تعلق ہوتا ہے، اس کے اثرات بہت گہرے اور دوررَس ہوتے ہیں، اچھے اثرات ہوں یا برے، بہت دور تک

بلکہ کہئے کہ کئی نسل تک باقی رہتے ہیں، اس لئے میں نے عرض کیا کہ اساتذہ کی ذمہ داری بہت ہے۔

اس سلسلے میں مصلح الامت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہٗ کا ایک مکتوب گرامی نظر سے گزرا، جو انھوں نے دارالعلوم مئو کے سابق صدر المدرسین اور شیخ الحدیث حضرت مولانا قاری ریاست علی صاحب علیہ الرحمہ کے نام لکھوایا تھا۔ میں نے عرصہ ہوا اس کو اپنی ایک کاپی پر نقل کیا تھا، ابھی حال میں اس کو دیکھا تو مناسب معلوم ہوا کہ اس مکتوب کو اربابِ مدارس کی خدمت میں پیش کردوں، بہت ضروری اور مفید مضامین پر مشتمل ہے، خط مولانا کے کسی خادم کے قلم سے ہے، وہ لکھتے ہیں:

محترمی جناب قاری صاحب! زیدت عنایاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

یہ تحریر گو میری ہے، لیکن پیغام وہدایت حضرت مولانا مدظلہ العالی کی جانب سے آپ کے نام ہے، لیکن مخاطب جملہ مدرسین صاحبان مدرسہ ہیں، امید کہ اس مختصر تحریر کو کافی سمجھتے ہوئے اپنے اپنے حالات کا جائزہ لیں گے، اور از سرنو عزم واخلاص سے کام لیتے ہوئے اپنے مشاغل میں نہایت سکون واطمینان کے ساتھ لگے رہیں گے۔

(۱)

اصل چیز اخلاص ہے، اس کے پیدا کرنے اور اس میں اضافے کی برابر سعی کرنی چاہئے، ہر معاملہ میں اسی کو پیش نظر رکھا جائے کہ ہمارے اخلاص کا کیا تقاضہ ہے، اور اس کی رُو سے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔

(۲)

مسلمانوں کے جو بچے مدرسہ میں آتے ہیں، یہ قوم کی بیش بہا امانتیں ہیں، ہمیں ان کا حق ادا کرنا چاہئے، ہماری ہی توجہ سے یہ بن بھی سکتے ہیں، اور ادنیٰ عدم

توجہی سے ان کا نا قابل تلافی نقصان بھی ہوسکتا ہے، ہر طالب علم کے بارے میں یہ خیال ہر وقت پیش نظر رہنا چاہئے۔

(۳)

آپ حضرات کے باہمی اخلاق کا اثر طلبہ پر ضرور پڑے گا، اور دوسرے لوگ بھی اپنے بچوں کے مستقبل کو آپ ہی کے آئینے میں دیکھیں گے، چنانچہ عوام کا اپنے بچوں کا عربی پڑھانا اور آپ کے مدرسے میں پڑھوانا آپ ہی حضرات کے اخلاق پر موقوف ہے، لہٰذا اخلاق کے اس قحط کے زمانے میں اہل مدرسہ کو اخلاقِ نبوی (ﷺ) کا مکمل نمونہ ہونا چاہئے، اس میں جو صاحب جتنی ترقی کر سکتے ہوں کریں۔

(۴)

طلبہ میں اِس زمانے میں بالعموم پست ہمتی، کم ظرفی، کم حوصلگی اور جبن و بزدلی کا مرض پایا جاتا ہے، شروع ہی سے ان امور کے انسداد کی ضرورت ہے کہ ان میں عالی ظرفی، بلند حوصلگی، جرأت و ہمت پیدا کی جائے، اور غصہ و کبر، چوری، جھوٹ وغیرہ کی سختی سے نگرانی رکھی جائے، نیز بڑے طلبہ میں دوسری قسم کی بداخلاقیاں جو پیدا ہوجاتی ہیں انکی طرف سے غافل نہ رہا جائے۔

(۵)

اپنی جانب سے سعی و کوشش کے ساتھ حق تعالیٰ سے اعانت طلب کی جائے کیونکہ بدون ان کی امداد کے ہمارے کسی کام میں برکت نہ ہوگی، اور فضل خداوندی شامل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہماری طرف سے تعلق و نسبت قوی ہو، جتنی نسبت قوی ہوگی اسی قدر ادھر سے اعانت عام اور تام ہوگی۔ **والسلام**

ان پانچ فقروں میں مولانا نے وہ سب باتیں کہہ دی ہیں جو طلبہ کی تربیت کے لئے بنیادی اور ضروری ہیں، ان میں سے ہر بات بہت قابل توجہ ہے، تدبیر کے درجے میں بالخصوص تیسرا اور چوتھا فقرہ نہایت قابل غور ہے، اساتذہ اور منتظمین کے

باہمی اخلاق سے طلبہ کا متاثر ہونا ناگزیر ہے، اگر ان حضرات میں باہمی محبت، ہمدردی اور ایک دوسرے کی قدر و منزلت کا جذبہ موجود ہے، اور اس کے مطابق برتاؤ جاری ہے، تو طلبہ کیا پورا ماحول خوشگوار بنا رہے گا، اور اگر خدانخواستہ ان حضرات میں باہمی چپقلش، شکوہ شکایت اور حسد و کینہ کا جذبہ رہا، تو یہ آگ پھیلتی چلی جائے گی، ایمانی اخوت، علمی رفاقت اور مقصد کی وحدت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک مل کر ”جسد واحد“ کے مثل ہوں، کہ ایک کی راحت سے دوسرے کو راحت ہو، اور ایک کے رنج سے دوسرے کو رنج ہو، پھر اسی اخلاق اور اسی برتاؤ کا درس طلبہ بھی حاصل کریں۔

اور یہ بات بھی بالکل مشاہد ہے کہ طلبہ میں پست ہمتی، کم ظرفی، کم حوصلگی اور جبن و بزدلی پائی جاتی ہے۔ پست ہمتی کا اثر یہ ہے کہ کتابوں کے سمجھنے اور انھیں یاد کرنے میں محنت و مشقت نہیں اُٹھاتے، جو چیز نہیں سمجھ میں آتی اور نہیں یاد ہوتی، اسے یونہی چھوڑ دیتے ہیں، اگر ہمت بلند ہوتی تو سمجھے اور یاد کئے بغیر طالب علم نہیں چھوڑتا۔ کہتے ہیں کہ امام غزالیؒ اپنی کتابیں لئے ہوئے ایک قافلے کے ساتھ سفر کر رہے تھے، قافلہ پر ڈاکہ پڑا، ڈاکوؤں نے امام غزالی کی کتابیں بھی لوٹ لیں، امام صاحب نے ڈاکوؤں کے سردار سے کہا کہ میں طالب علم ہوں، میری کتابیں ہی میرا سرمایہ ہیں، انھیں واپس کر دو، سردار نے کہا تمہارا علم کیسا ہے؟ جسے لوٹ لیا جائے، اور تم خالی رہ جاؤ۔ پھر اس نے کتابیں واپس کر دیں، امام غزالیؒ نے اس کے بعد سب کتابیں زبانی یاد کر لیں۔ یہ عالی ہمتی تھی۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب علیہ الرحمہ نے آپ بیتی میں ایک طالب علم کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ فقط چند مہینوں کا وقت لے کر شیخ کے والد مولانا محمد یحییٰ صاحب کی خدمت میں آیا تھا کہ اسی مدت میں مجھے فقہ و حدیث کی سب کتابیں پڑھا دیجئے، حضرت مولانا کی بلند ہمتی تھی کہ دن رات لگ لپٹ کر اسے تمام کتابیں پڑھا دیں، اور اس کی بلند حوصلگی تھی کہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ساری کتابیں اس نے

پڑھ لیں۔ آپ بیتی میں یہ قصہ قابل ملاحظہ ہے۔

خود مولانا محمد یحییٰ صاحب علیہ الرحمہ نے طالب علمی کے زمانے میں طے کیا کہ دہلی میں استاذ سے حدیث کی کتابیں نہیں پڑھنی ہے، کیونکہ وہاں غیر مقلدیت کے اثرات پھیلے ہوئے تھے، تو چھ ماہ بستی نظام الدین میں بنگلہ والی مسجد میں کے ایک حجرے میں اس طرح روپوش ہوئے، کہ قریبی لوگوں کو بھی اطلاع نہ ہوئی کہ یہ یہیں ہیں، اس دوران انھوں نے شروح وحواشی کی مدد سے حدیث کی کتابیں مطالعہ کر ڈالیں، اور جب ان کا امتحان حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارن پوری نے لیا، تو ان کا تاثر یہ تھا کہ اس طالب علم کا علم اساتذہ سے بھی بڑھا ہوا ہے، پھر انھیں کی سفارش پر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ نے ضعف بصارت کے باعث دورۂ حدیث کے اسباق بند کر دینے کے باوجود مولانا محمد یحییٰ صاحب کے لئے درس جاری فرمایا۔ اور دو سال میں یہ درس پورا ہوا۔ مولانا کی عالی ہمتی کا ظہور یہاں بھی ہوا کہ اس دو سال کے درس میں ایک حدیث کا بھی ناغہ نہیں ہوا۔ اور حضرت کے درس کی اردو تقریریں عربی میں مرتب کیں۔

آج بھی اگر طلبہ اپنے اندر عالی ہمتی پیدا کر لیں، تو کوئی معنیٰ نہیں کہ محرومی کا شکار ہوں، اور جو طلبہ اس پر کاربند ہیں، وہ واقعی بلند رُتبہ پاتے ہیں۔

حضرات اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ ان میں حوصلہ مندی، بلند ہمتی اور عالی ظرفی کے اوصاف پیدا کرنے کی کوشش کریں، اور اس انداز میں بچوں کی تربیت کریں کہ یہ اوصاف وکمالات ان کی طبیعتوں میں راسخ ہو جائیں۔ آدمی کا مقصد بلند ہو، اور اسی پر اس کی نگاہ مرکوز ہو، تو چھوٹی چھوٹی چیزیں جن کی الجھنوں میں کم ظرف لوگ گرفتار رہتے ہیں، خود بخود برکنار ہو جائیں۔

آخری بات جس کی جانب حضرت مصلح الامتؒ نے توجہ دلائی ہے، وہ امت حاضرہ کی ''متاعِ گم گشتہ'' ہے، اسے مشکل سمجھ کر، یا اسے معمولی جان کر لوگوں نے اس

سے بے اعتنائی کی ہے، حالانکہ ایک لمحہ کیلئے اس سے غفلت رَوا نہیں ہے، تمام دینی علوم واعمال کی روح وہی ہے، اس کے بغیر ڈھانچہ تو ہوسکتا ہے، شخصیت نہیں ہوگی، عمارت تو ہوگی، مگر خالی اور ویران! وہ ہے نسبت مع اللہ! اللہ کے ساتھ تعلق اور نسبت جتنی مستحکم ہوگی قلب میں بھی، علم میں بھی، اور عمل میں بھی برکت ہوگی، نور بھی ہوگا۔ اللہ والے جن کی نسبت اللہ کے ساتھ درست ہوتی ہے، اور وہ لوگ جو اس نسبت سے خالی ہیں، جس کا جی چاہے، دونوں کے پاس رہ کر دونوں طرح کے لوگوں میں موازنہ کرلے، اگر ذرا بھی حس صحیح ہوگی، تو بہت فرق پائے گا۔

مدارس میں پہلے اس نسبت کے حامل بہت ملا کرتے تھے، اب دنیاداری، معاش کے غلبے اور معیارِ زندگی بلند کرنے کے جذبے نے ادھر سے توجہ ہٹادی ہے، اب دوڑ دوسری جانب لگ رہی ہے، مال کی بہتات، زندگی کا عیش، اچھے سے اچھے دنیاوی سامان، سواریاں، مکانات مقصودِ زندگی بن گئے ہیں۔ کسے فرصت کہ نسبت مع اللہ کے مجاہدات میں خود کو کھپائے، اور دنیاوی مال ومتاع سے صرف نظر کرلے۔

یہ ملت کا ایسا نقصان ہے، جس کی تلافی بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کی جانب توجہ کریں۔ مدارس میں جو ماحول میسر آتا ہے، اس میں یہ کوشش آسان ہے، اگر نسبت مع اللہ حاصل ہو، تو اب بھی کاموں میں برکت اور سہولت ہوسکتی ہے۔

مدارس میں اساتذۂ وطلبہ اور اربابِ انتظام سب کو نسبت مع اللہ کے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ مدارس میں ذکرِ الٰہی کا ماحول بنانا چاہئے، اللہ والوں سے ربط وتعلق رکھنا چاہئے۔

حق تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے مدارس اسلامیہ کو امت محمدیہ علیٰ **صاحبہا الصلوٰۃ والسلام** کے حق میں زیادہ سے زیادہ مفید اور بارآور بنائیں۔

☆☆☆☆☆

علماء دین اور عصر حاضر

عہدِ نبوت سے جس قدر دوری ہوتی جارہی ہے، دنیا میں قیامت کی فضا پیدا ہوتی اور پھیلتی جارہی ہے۔ قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک روئے زمین پر اللہ اللہ کہنے والے موجود رہیں گے۔ دنیا میں جس تیزی سے تغیر رونما ہورہا ہے، ہرآن جتنی سرعت سے قدریں بدل رہی ہیں، انھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کی بساط لپٹ رہی ہے اور تباہ کن زلزلہ اور طوفان کی ساعت قریب تر ہوتی جارہی ہے۔

کل تک جو چیزیں وجۂ افتخار اور سرمایۂ عزت تھیں، آج انھیں باعث ننگ وعار قرار دے دیا گیا ہے، اور جن چیزوں پر کل تک ندامت سے سر جھک جایا کرتے تھے، آج گردن تان کر ان پر فخر کیا جاتا ہے۔ ناچ گانا، کھیل کود، بے پردگی اور عریانی کسے پسند تھی؟ مگر اب ان پر شرمانے والے، برا سمجھنے والے رجعت پسند اور دقیانوسی، تاریک خیال اور نہ جانے کیا کیا ہیں۔ دین، علم دین، داڑھی، ٹوپی، نماز، ذکر، تلاوت زندگی کے لئے سرمایۂ سعادت تھے، مولوی، ملا، عالم، فاضل یہ سب القاب اہل علم کے لئے شناخت تھے، مگر آج ان کا نام لیجئے تو کتنی پیشانیوں پر بل پڑ جائیں گے، تیوریاں چڑھ جائیں گی۔

مولوی اور ملا ہونا، پہلے ایک شرف کی بات تھی، مگر انگریزی سیلاب چلا تو اب یہ لفظ طعنہ وطنز کا ایک ہتھیار بن گیا، انگریزوں کی غلامی نے جہاں وضع ولباس کو بدلا وہیں ذہنیتوں کو بھی تبدیل کرڈالا۔ اب انگریزوں کی غلامی باعث فخر بن گئی، اور اللہ ورسول کی غلامی واطاعت گذاری کو باعث ننگ وعار سمجھا جانے لگا۔

مولوی اور علماء دین کے حق میں عام بات جو زبانوں پر آتی ہے ان زبانوں پر

جو دین و دیانت سے بے گانہ ہیں، وہی زبانیں جنھیں تلاوت قرآن کی توفیق ذرا کم ہی ہوتی ہے، وہی زبانیں کہتی ہیں کہ علماء دین عصر حاضر کے تقاضوں سے بے خبر ہیں، ان کا نصاب تعلیم رفتارِ زمانہ کا ساتھ نہیں دے پا رہا ہے، یہ وعظ وتقریر اور مناظرہ ومجادلہ کی بے وقت راگنی الاپتے ہیں، یہ اپنی مخصوص طرز ووضع کی وجہ سے آج کی دنیا میں بالکل اجنبی سے لگتے ہیں، یہ اپنے دل ودماغ کی وہ سب کھڑکیاں بند رکھتے ہیں، جن سے تازہ ہوا آسکتی ہے۔ یہ اور اس طرح کی اور بھی بہت سی باتیں مختلف عنوان سے دہرائی جاتی رہتی ہیں۔

مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر یہ مولوی اور ملا نہ ہوتے، تو آج اہل اسلام کا کیا حال ہوتا، اگر عصر حاضر کے تقاضوں سے بے خبر رفتارِ زمانہ کا ساتھ چھوڑ کر یہ دینی مدارس اپنی رفتار خود نہ متعین کئے ہوتے، تو آج دین اور علوم دین کا حشر کیا ہوتا۔ یہ تسلیم کہ جس طرح ہر طبقہ اور ہر جماعت میں اچھے اور معتبر لوگوں کے درمیان برے اور نامعتبر لوگ بھی گھس جاتے ہیں، اسی طرح طبقۂ علماء میں ایسے ناکارہ اور مضر عناصر شامل ہیں، جو حقیقۃً علماء نہیں ننگ علماء ہیں، یہ علماءِ سو ہیں، یہ گمراہی کے سرچشمے ہیں، ان کی ذات سے اور ان کی زبان وقلم سے فتنے ابلتے ہیں، یہ جس طرف رُخ کرتے ہیں جنگ وجدل کا بازار گرم ہو جاتا ہے، افتراق وانتشار ان کا شیوہ ہے، اور دین کو دنیا کے لئے استعمال کرنا ان کا پیشہ ہے، ایسے لوگ آج ہی نہیں، پہلے بھی رہے ہیں۔ ایسے ہی نام کے ملاؤں کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے۔ ؎

حق سے جب حضرتِ مُلّا کو ملا حکم بہشت — میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا
خوش نہ آئیں گے اسے حور وشراب ولب کشت — عرض کی میں نے الٰہی! میری تقصیر معاف
بحث وتکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت — نہیں فردوس مقام جدل وقال اقول
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت — ہے بد آموزیٔ اقوام وملل کام اس کا

یہ بات مولوی کہلانے والوں کے ایک مخصوص طبقے کے بارے میں بالکل صحیح

ہے، لیکن اگر اسے عام کر دیا جائے، اور پوری جماعتِ علماء پر اسے چسپاں کیا جائے تو اس سے زیادہ گمراہ کن بات نہ ہوگی بلکہ ''بدآموزیٔ اقوام وملل'' کا ایسا خطرناک نمونہ ہوگا کہ ملت تباہ ہو کر رہ جائے۔ یہاں مسئلہ ''علماءِ سوٗ'' کا نہیں ہے، ان علماء اور مولویوں کا ہے جو ہر حال میں دین اسلام کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں، جو دین اور علم دین کو اس کی اصلی اور تازہ حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں، جو کہ انھیں رسول اللہ ﷺ سے معتبر واسطوں کے ذریعہ ملا ہے اس میں کوئی تحریف، کوئی تبدیلی، کوئی مداہنت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، یہ اسلام کے خلاف کسی تہذیب سے...... خواہ وہ کتنی خوشنما اور چمک دمک والی ہو...... رشتہ جوڑنے کے روادار نہیں، ان میں صلابت اور پختگی ہے، تنگ نظری اور تعصب نہیں ہے، صلابت اور پختگی کے بغیر تو ایک پتھر کی دیوار کھڑی نہیں رہ سکتی، دین اور مذہب کا حصار کیسے قائم رہ سکتا ہے، یہ عصر حاضر کے تقاضوں سے بے خبر نہیں ہیں، خوب باخبر ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دین ومذہب اور قرآن وحدیث کے تقاضوں سے بھی باخبر ہیں، اور اسی باخبری کا اثر ہے کہ تہذیب جدید کے خیرہ چشم چوروں کو دین اسلام کے ساتھ نقب لگانے کا موقع نہیں مل پاتا، اور کبھی کچھ نقب لگا بھی لیتے ہیں، تو یہ ان کا تعاقب کر کے انھیں پسپا کر دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ علماء دین نہ ہوتے، اور یہ مدارس نہ ہوتے تو یوں بظاہر اسباب...... اللہ نہ کرے...... دین اسلام کی تمام بنیادیں کھود دی جاتیں۔ اس کا حصار منہدم ہو جاتا۔ اور جس طرح یہودیت، عیسائیت اور ہندومت کا اصل حلیہ دنیا سے ناپید ہو گیا، اور اب اس کا عمل تو درکنار صحیح علم رکھنے والا کوئی نہیں، یہی حال اسلام کا ہو جاتا، بدعات وخرافات اور تحریفات ہی اصل دین بن جاتے اور واقعی دین گم ہو جاتا۔

اگر ان کا نصابِ تعلیم رفتارِ زمانہ کا ساتھ دیتا تو اس میں مادی اور غیر دینی علوم وفنون داخل ہو جاتے، لیکن اس کے اثرات ونتائج کیا ہوتے؟ یہی ہوتے کہ علم دین دب جاتا اور مادی اور غیر دینی علوم اُبھر جاتے، چنانچہ اصلاح وتجدد کے نام پر کہیں کہیں

یہ عمل ہوا تو دیکھا یہی گیا کہ دین دب کر رہ گیا اور دنیا ابھر آئی، معاش نے معاد پر فتح پالی، داڑھی صاف ہوگئی، انگریزیت چھا گئی، کرتا پاجامہ رُخصت ہوگیا، شرٹ پینٹ نے غیرت وحیا کو سر بازار رُسوا کردیا۔ جہاں جہاں دینی نصاب تعلیم کو رفتارِ زمانہ کے ساتھ دوڑا گیا دیکھ لیجئے عمومی حشر یہی ہے۔

جس نصابِ تعلیم کو ناکارہ اور فرسودہ کہا جاتا ہے، وہ علوم نبوت کے تحفظ کی ضمانت ہے، اس کے ساتھ اگر عصر حاضر کے خرافات کو شامل کیا گیا تو یہ دینی نصاب تعلیم نہیں رہے گا، دنیاوی نصاب تعلیم بن جائے گا۔ پھر یہ ایک ذریعہ مُعاش ہوگا، ”علم معاد“ (آخرت) نہ رہے گا۔ علماء نے دل ودماغ ہی کی نہیں، مدارس وخانقاہوں کی بھی کھڑکیاں بند کررکھی ہیں۔ اس لئے نہیں کہ تازہ ہوا نہ آئے، تازہ اور مفید ہوا تو انھیں کے پاس ہے، اس لئے بند کررکھی ہیں کہ انگریزیت اور مادیت کا غلیظ اور کثیف دھواں اسلامیت اور رُوحانیت کے صاف ستھرے ماحول کو متعفن نہ کردے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جب کسی نے دل ودماغ کی تمام کھڑکیاں کھولی ہیں تو باہر اتنی گندی ہوا بکھری ہوئی ہے کہ اندر کی صاف ہوا گھٹ کر رہ گئی، اس کی اتنی مثالیں ہمارے سامنے ہیں انھیں حد شمار میں نہیں لایا جاسکتا۔

وعظ وتقریر تو ہدایت کا ذریعہ ہے، یہی کام انبیاء نے اپنی قوموں میں کیا ہے، زبان شیریں ہو، کلام، ہدایت نظام ہو، دل میں تاثیر ہو، موقع ومحل کے لحاظ سے خطاب ہو، تو گمراہ قومیں ہدایت کی راہ پر آجاتی ہیں، وعظ کا سلسلہ موقوف ہوجائے تو دلوں کی کھیتیاں سوکھ کر رہ جائیں گی، اور رہا مناظرہ ومجادلہ تو یہ ایک مجبوری ہے، یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ چور گھر میں نقب لگائے، اور گھر والا دیکھ کر شور وغل بھی نہ مچائے، ڈاکو ہتھیار لے کر حملہ کریں اور جس پر حملہ کیا گیا ہے، وہ چپ چاپ شرافت کا ثبوت دے، اسے کون سی عقل ومنطق قبول کرے گی۔ پس جب کوئی سرپھرا دین میں نقب لگاتا ہے، اس میں تحریف کرتا ہے، اس کا رُخ بدلنے کی کوشش کرتا ہے، تو اللہ کے دیوانے اٹھ کھڑے

ہوتے ہیں، ہانک پکار کر لوگوں کو بیدار کرتے ہیں، چوروں پر حملہ کرتے ہیں، یہیں مناظرہ ہوتا ہے، اور اسی موقع پر مجادلہ ہوتا ہے، کیا کوئی اسے پسند کرے گا کہ دین میں رخنہ ڈالا جائے اور دیکھنے والے خاموش تماشائی بنے رہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ خلیفۂ اول نے تو ان سرپھروں سے جہاد کا اعلان کیا تھا جو زکوٰۃ دینے سے انکار کر رہے تھے، جن لوگوں نے ان کے سخت رویے میں لچک پیدا کرنے کی کوشش کی تھی، ان سے انھوں نے اپنا وہ تاریخی جملہ کہا تھا جو آج بھی تاریخ کی پیشانی کا جگمگاتا ہوا طغرہ ہے، أَیَنقُصُ الدِّیْنُ وَأَنَا حَیٌّ (کیا میرے جیتے جی دین میں کوئی (کمی اور نقص پیدا کیا جائے گا) ان علماء حق کا بھی طرۂ امتیاز یہی اُسوۂ صدیق کی پیروی ہے، اس کے لئے مناظرہ کی ضرورت ہو تو، اور مجادلے کی ضرورت ہو تو، اور اگر جہاد کی ضرورت ہو اور اس کا موقع ہو تو وہ سب کے لئے حاضر ہیں، یہ علماء کے لئے باعث ننگ نہیں وجہِ افتخار ہے۔

ہاں! بے وجہ جو مناظرہ ومجادلہ میں سرگرم رہے، وہ علماء حق کے زمرے میں آتا ہی کب ہے؟ اسے تو ''علماءِ سوٗ'' میں شمار کیجئے، وہ عالم نہیں، سگِ دنیا ہے جو بھونکتا اور غراتا رہتا ہے۔

ہاں یہ بات بالکل صحیح ہے کہ یہ اپنی وضع قطع، اپنی شکل وصورت بلکہ اپنے کردار وگفتار میں دنیا والوں سے کافی مختلف ہیں، اس کی وجہ سے یہ موجودہ دنیا میں اجنبی سے لگتے ہیں۔ بخدا ایسا ہی ہونا چاہئے، یہ بات علماء حق کے لئے وجہ طعن نہیں، بلکہ خوش خبری اور نوید سعادت ہے، صحیح حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

بدأ الاسلام غریباً وسیعود کما بدأغریباً فطوبیٰ للغرباء،

اسلام اپنے آغاز میں اجنبی تھا، اور آغاز ہی کی طرح آخر میں بھی اجنبی بن کر رہ جائے گا تو اجنبیوں کے لئے بشارت ہو۔

اسلام اپنے آغاز میں اجنبی کا مطلب قاضی عیاض علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ

شروع میں چند ہی لوگ تھے جو اسلام میں داخل ہوئے، پھر اس میں کثرت سے لوگ داخل ہوئے، پھر وقت آجائے گا کہ کم ہی افراد اس میں رہ جائیں گے، اور حدیث میں غرباء کی تفسیر **النزاع من القبائل** سے لی گئی ہے یعنی قبیلہ و خاندان میں اجنبی لوگ۔

(فتح الملھم، ج:۱،ص:۲۸۹)

آج وہی دور ہے کہ اگر کوئی اسلام پر پورے طور سے عمل کرے تو اجنبی بن کر رہ جائے گا، ان اجنبیوں کے لئے جنت کی بشارت ہے تو علماء حق کے لئے دورِ حاضر کی شہادت ہے یہ حضرات اسلام پر عمل پیرا ہیں، اور بشارت جنت کے مستحق ہیں، اس سے اچھی بات کیا ہوگی کہ پورا دورِ حاضر ان حضرات کے ایمان اور اسلام کے حق میں شاہد ہے۔

حق یہ ہے کہ زبانیں جو چاہیں کہیں، قلم جتنا بھی چاہیں بہکیں، پروپیگنڈہ خواہ کتنا ہی شدید ہو، مگر یہ علماء و مشائخ ہی ہیں، یہ طالبان علوم نبوت ہی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور علم دین کی خدمت کے لئے منتخب فرمایا ہے، اللہ نے انھیں حوصلہ بخشا ہے کہ یہ تمام لذائذ نفس اور مفادات دنیوی سے منہ موڑ کر اللہ کی رضا جوئی کے لئے دین و شریعت کے تحفظ میں لگے ہوئے ہیں، زمانے کے تقاضے انھیں بھی ابھارتے ہیں کہ جیسے اور لوگ دنیا کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے ہیں، تم بھی دھوو، مگر اللہ کا دین انھیں اپنی طرف کھینچتا ہے تو یہ بہتی گنگا سے ہٹ کر اجنبیت کی زندگی بخوشی قبول کر لیتے ہیں۔

آج ساری دنیا انھیں ملاؤں سے خائف ہے، سب ان سے ڈر رہے ہیں، افغانستان میں یہی ملا سیاسی طاقت بن کر ابھرے تو دنیا کی سپر پاور طاقت اتنی گھبرائی، اس قدر خوف زدہ ہوئی کہ اپنے ہتھیار اور جھوٹے پروپیگنڈے، دونوں طاقتوں کو بے تحاشا ان کے خلاف استعمال کیا، اور اب وہ طاقت عالمی پیمانے پر ان ملاؤں سے خوف زدہ ہے، آج سے بہت پہلے علامہ اقبال نے ایک نظم لکھی تھی جس کا عنوان ہے ”ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام“ اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا   روحِ محمد ان کے بدن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج   ملا کو ان کے کوہ ودمن سے نکال دو

تو آج ابلیس کے سیاسی فرزند ملا کو افغانستان ہی کے کوہ ودمن سے نہیں، پوری دنیا سے نکالنے کے لئے کوشاں ہیں، ابلیسی نظام کو اگر کسی سے خطرہ ہے تو اسی اسلام سے جس کے نگہبان ومحافظ باذن خداوندی یہی ملا ہیں۔ ابلیس کہتا ہے۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں ابتک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو
الحذر آئین پیغمبر سے سو بار **الحذر**
حافظ ناموس زن مرد آزما مرد آفریں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر وعمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

آپ نے دیکھا، جسے خود اسی کی قوم از کار رفتہ سمجھتی ہے، ابلیسی نظام میں اس کی کتنی دہشت طاری ہے کہ پورا نظام تھرا رہا ہے، وہ نظام تو ان مولویوں کو بدنام کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے، مگر ملت اسلامیہ کو کیا ہوا ہے کہ وہ بھی ہاں میں ہاں ملا رہی ہے، اسے تو چاہئے کہ ''آئین پیغمبر'' کی طرف پوری طرح پلٹ جائے، اور جو لوگ اس کے لئے جان کھپاتے ہیں، ان کے ہاتھوں کو مضبوط کرے۔

☆☆☆☆☆

علم منطق

منطق نام ہے ان قواعد کلیہ کا جن کی پابندی سے ذہن نظر وفکر کی غلطی سے بچتا ہے، اس کا موضوع وہ معلوم تصورات وتصدیقات ہیں، جن سے مجہول تصورات وتصدیقات حاصل ہوں، اس علم کی غرض جیسا کہ تعریف سے ظاہر ہے ذہن انسانی کا فکر ونظر کی غلطی سے بچنا ہے، اور اس علم کا نفع علوم عقلیہ کو صحیح طور سے حاصل کرنا ہے، **فارابی** نے اس علم کو ‘‘رئیس العلوم’’ کہا ہے اور **ابن سینا** نے خادم العلوم۔

منطق کے بنیادی اصول:

منطق کے بنیادی اصول نو ہیں۔ کلیات، تعریفات، تصدیقات، قیاس، برہان، خطابت، جدل، مغالطہ، شعر

منطق کی تاریخ:

تاریخ سے یہ بات معلوم ہے کہ اس علم کا موسس اور مدون ارسطو ہے، اور اسی کو ‘‘معلم اول’’ کہا جاتا ہے، اس علم کی ترقی پر اس زمانہ کا بادشاہ سالانہ ایک لاکھ بیس ہزار دینار خرچ کرتا تھا۔ ارسطو کی جملہ کتابیں مشرقی رومن امپائر کے علاقہ موره میں محفوظ تھیں، عباسی خلیفہ مامون رشید کو علوم عقلیہ اور متقدمین کے علوم سے دلچسپی ہوئی تو اس نے رومی بادشاہ کے پاس قاصد بھیج کر یہ کتابیں اس سے طلب کیں۔ ابتداء میں بادشاہ نے کتابیں بھیجنے سے انکار کیا، مامون کو غصہ آیا اور اس نے رومی مملکت پر فوج کو چڑھائی کا حکم دیا، جب رومی شہنشاہ کو اس کی خبر پہونچی تو اس نے پادریوں اور عیسائی

مذہب کے دوسرے پیشواؤں کو بلا کر مشورہ کیا۔ ان لوگوں نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ آپ مسلمان بادشاہ کے پاس یہ کتابیں بھیج دیں کیونکہ یہ کتابیں مسلمانوں کے عقائد میں کمزوری پیدا کردیں گی، اور دین پر سے ان کا عقیدہ متزلزل ہو جائے گا۔ رومی بادشاہ نے اس رائے کو پسند کیا، اور مامون کے پاس کتابیں بھجوادیں، مامون نے لائق مترجمین کے ذریعے ان کتابوں کا ترجمہ کرایا۔ ان مترجمین میں حنین ابن اسحاق، ثابت بن قرہ وغیرہ بہت مشہور ہیں۔

ابونصر فارابی:

ان مترجمین نے ان کتابوں کے ترجمے کئے، لیکن ہر ایک کا ترجمہ دوسرے سے مختلف تھا۔ یہ ترجمے باقاعدہ مہذب ومرتب نہ تھے، منصور بن نوح سامانی نے ابو نصر فارابی المتوفیٰ ۹۵۰ء کو ان تراجم کی تلخیص وتہذیب کا حکم دیا، فارابی نے ان کو مہذب وملخّص کیا۔ اسی وجہ سے فارابی کو ‘‘معلم ثانی’’ کیا جاتا ہے، لیکن یہ ترجمے اب بھی مبیضہ کی شکل میں نہ آئے تھے۔ اور یہ سارا ذخیرہ اصفہان کے کتب خانہ میں سلطان مسعود کے زمانہ تک محفوظ رہا۔ اصفہان کے کتب خانہ کا نام ‘‘صوان الحکمت’’ تھا۔ فارابی نے ان ترجموں کو باقاعدہ مرتب ومہذب اور کتابی شکل میں اس لئے نہیں کیا کہ اس کے مزاج مین سیر وسیاحت کا غلبہ تھا، اس کی وفات دمشق میں ۹۵۰ء میں ہوئی۔

بوعلی سینا:

سلطان مسعود کے زمانہ میں شاہی طبیب کی حیثیت سے ابن سینا نے دربار میں رسوخ حاصل کیا اور درجہ وزارت تک پہونچا اور اس کتب خانہ سے استفادہ کیا، چنانچہ اس نے اس کتب خانہ کی کتابوں کا خلاصہ لکھا اور ‘‘کتاب الشفاء’’ کے نام سے ایک کتاب فن معقولات میں لکھی۔ بوعلی سینا سلطان مسعود کے دربار ہی میں تھا کہ کتب خانہ میں آگ لگ گئی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خود بوعلی سینا نے ان کتابوں کو اس

لئے ضائع کردیا کہ اب جو کچھ لکھے گا۔ اپنی طرف منسوب کرے گا۔ لیکن یہ بوعلی سینا کے دشمنوں کی رائے ہے، اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ جیسا کہ مدینۃ العلوم میں مذکور ہے۔ بوعلی سینا کی وفات ۱۰۳۷ء میں ہمدان میں ہوئی۔

فن منطق کی مشہور کتابیں:

البحر الخضم، منطق الشفاء مرتبہ بوعلی سینا، شیخ بوعلی سینا نے یہ کتاب بغیر کسی کتاب کی مراجعت کے لکھی ہے۔ بیان الحق، مطالع الانوار، المناہج، کشف الاسرار، ان سب کتابوں کے مصنف خونجی (شیخ سراج الدین ابوالسنا المتوفیٰ ۶۸۲ھ) ہیں۔ جامع الدقائق مرتبہ کاتبی، تعدیل المیز ان مرتبہ صدر الشریعہ، معیار المیز ان، ممک النظر، یہ دونوں کتابیں امام غزالیؒ کی تصنیف ہیں۔ میزان المنطق، ایساغوجی، صغریٰ، کبریٰ، یہ دونوں کتابیں میر سید شریف جرجانی کی تصنیف ہیں۔ تہذیب، شمسیہ، یہ دونوں رسالے علامہ سعدالدین تفتازانیؒ کے ہیں۔

ہندوستان میں علم منطق کی کتابیں:

سلم العلوم، مصنفہ قاضی محبّ اللہ بہاریؒ، ہندوستان میں اس کتاب کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، نصاب درس میں یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے، اس کی بے شمار شرحیں لکھی گئیں۔

مرقات، فن منطق میں بہترین رسالہ ہے، مصنفہ مولانا فضل امام خیرآبادی

شرح سلم قاضی مبارک، شرح سلم ملاحسن، شرح سلم حمد اللہ، مرأۃ الشروح شرح سلم ملا مبین، شرح سلم علامہ بحر العلوم۔ (ماخوذ از ''الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند''، مؤلفہ مولانا عبدالحی الحسنیؒ (اردو ترجمہ ''اسلامی علوم فنون ہندوستان میں''))

ان کے علاوہ فن منطق کی کتابوں پر بے شمار حواشی اور شرحیں لکھی گئیں، لیکن شروح وحواشی میں منطق کے اصل مباحث سے زیادہ دوسرے مسائل پر داد تحقیق

وتدقیق دی گئی۔ بعض کتابوں میں نحوی صرفی مباحث کا طومار باندھا گیا، پھر ایرادات واعتراضات کا لامتناہی سلسلہ قائم کر کے طالب علموں کو ان کی بھول بھلیوں میں ڈال دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ کے انقلاب اور علوم وفنون کے ارتقاء نے کتابوں کے اس انبار کو گوشۂ گمنامی میں ڈال دیا ہے۔ مولانا عبدالحی صاحب نے اپنی کتاب ''**الثقافة الاسلامیه فی الهند**'' میں فن منطق کی ۱۷۸ کتابوں کو شمار کرایا ہے، جن میں متون، شروح اور حواشی سب شامل ہیں۔ ان میں ۱۶۱ کتابیں ہندوستانی علماء کی ہیں۔ لیکن اب ان کتابوں کی فہرست آپ تاریخ کی کتابوں میں پڑھ سکتے ہیں۔ کتب خانوں کی الماریاں ان سے خالی ہو چکی ہیں۔ اب انھیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے، ان میں سے بیشتر کتابیں تو اب دستیاب ہی نہیں ہیں۔ چند کتابیں ہیں جنھیں قدیم طرز کے عربی مدارس نے جن میں درس نظامی اپنی بدلی ہوئی شکل میں رائج ہے، ابھی تک سینے سے لگا رکھا ہے، لیکن آہستہ آہستہ ان کا دائرہ بھی تنگ ہوتا جا رہا ہے، لے دے مرقات، شرح تہذیب ملا یزدی کی، شرح رسالہ شمسیہ (قطبی) علامہ قطب الدین رازی کی اور سلم العلوم ملا محبّ الدین بہاری کی داخل درس ہیں، اور وہ بھی مکمل نہیں جہاں تک ہو جائیں۔

قدیم علم منطق بہت حد تک اپنی افادیت کھو چکا ہے، اس وقت منطق کی تعلیم محض دماغی ہوا خیزی ہے، نہ اساتذہ کو دلچسپی ہوتی ہے، نہ طلبہ سمجھتے ہیں، صرف اس خیال سے کہ اسلامیات کی جو کتابیں متاخرین علماء نے مرتب کی ہیں، ان میں منطق کی اصطلاحیں جابجا استعمال ہوئی ہیں، منطق کی تعلیم نہ ہونے سے ان کے سمجھنے میں دشواری ہوگی۔ یہ چند کتابیں ابھی تک سانس لے رہی ہیں۔ تاہم نزع کا عالم ان پر بھی طاری ہے، زمانہ کی ہوا جیسی چل رہی ہے، آج نہیں تو کل یہ اتنا سا دم بھی اکھڑ کر ہی رہے گا۔ باقی رہے نام اللہ کا!

(''نوٹ'' یہ مقالہ طلبہ کی فرمائش پر لکھا گیا)

☆☆☆☆☆

درسِ نظامی میں کتب حدیث کی شمولیت

وقت کی ایک اہم ضرورت!

درسِ نظامی، جو ہمارے قدیم طرز کے عربی مدارس میں رائج ہے، جس کا مرکز اور نمائندہ دار العلوم دیو بند ہے، وہ بہت سے اعتراضوں اور طعنوں کے باوجود اب بھی ایک طاقت ور نصابِ تعلیم ہے، اس نصاب تعلیم کا موضوع خالص علوم دینیہ ہیں، اور یہ علوم دینیہ قرآن وحدیث اور فقہ پر مشتمل ہیں، یہ نصاب انھیں تینوں بنیادی فنون کا تکفل کرتا ہے، اور حق یہ ہے کہ ان تینوں فنون میں رسوخ، گیرائی اور مہارت اسی نصاب سے ہوتی ہے، ورنہ اور دوسرے نصاب ونظام جو اسے ناکافی اور ناتمام سمجھ کر لوگوں نے وضع کئے ہیں، ان سے ہوسکتا ہے کہ ان کیلئے کچھ اور راہیں کھلی ہوں، مگر قرآن وحدیث اور فقہ کی تعلیم میں وہ زیادہ تر ناکام ہی رہے، ان بنیادی علوم دینیہ کی تحصیل وتکمیل کے لئے نگاہ اسی نصاب پر ٹھہرتی ہے۔

درسِ نظامی میں ان تینوں بنیادی فنون کے علاوہ جن دوسرے موضوعات اور کتابوں کو شامل کیا گیا ہے، وہ بطور مبادی اور معاون کے ہیں، مثلاً علم صرف، علم نحو اور زبان وبیان سے تعلق رکھنے والے اور دیگر فنون، یا پھر منطق وفلسفہ۔ ان مبادیات اور معاون علوم میں ترمیم وتنسیخ اور حذف واضافہ کا سلسلہ جاری ہے، اصحابِ مدارس نے نحو وصرف اور بلاغت کے موضوع پر کتابوں میں کافی ردوبدل کیا ہے، درس نظامی کے ابتدائی دور میں منطق وفلسفہ کی خاصی تعداد میں کتابیں شامل تھیں، مگر اب یہ بار بہت ہلکا کردیا گیا، اور حق یہ ہے کہ مزید ہلکا کیا جانا چاہئے۔ موجودہ حالات میں منطق اور

فلسفۂ قدیم خارج از بحث ہو چکے ہیں۔

درسِ نظامی میں حدیث کی کتابیں ابتداء میں کم تھیں، دار العلوم دیو بند نے صحاحِ ستہ اور حدیث کی دوسری چند کتابوں کو داخل نصاب کیا، اور اس سے دینی علوم کے اندر بصیرت اور رسوخ کا اضافہ ہوا، لیکن یہ اضافہ درس کے بالکل آخری مرحلے میں ہوا۔ اس سے پہلے صرف ایک کتاب مشکوٰۃ شریف داخل نصاب تھی، بلکہ ایک زمانے تک مشارق الانوار اور مشکوٰۃ شریف درس کی تکمیلی کتابیں رہی ہیں۔

ہمارے ملک میں انگریزوں کی آمد کے بعد جہاں اور فتنے ابھرے، وہیں ایک فتنہ یہ بھی ابھرا کہ ایک طبقہ نے یہ نعرہ بلند کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا سوادِ اعظم، جو فقۂ حنفی کا پابند ہے، اس کی دینی زندگی اور اس کی عبادات حدیث کی راہ سے منحرف ہے، اس نعرہ کی بنیاد پر غیر مقلدوں کا فرقہ وجود میں آیا، اس کے نقصانات جو بھی ہوئے ہیں، ایک فائدہ یہ ہوا کہ علماء اسلام، فقہ کے اصل سرچشمے قرآن وحدیث پر زیادہ متوجہ ہوئے، احادیث کی کتابوں کا درس اس طرح جاری ہوا کہ غیر مقلدوں کے نعروں کی ہوا نکل گئی۔

ادھر کچھ برسوں سے غیر مقلدیت نے ایک نئی انگڑائی لی ہے، اس انگڑائی کا آغاز سعودی عرب کی دولت کی بنیاد پر ہے، سعودی عرب میں نجدی علماء کہنے کو تو حنبلی ہیں، مگر حنبلیت سے زیادہ بزعم خود اجتہاد کے مدعی ہیں، ہندوستان سے بکثرت لوگ دنیا کمانے کی نیت سے وہاں جاتے ہیں، اور غیر مقلدیت لے کر وہاں سے پلٹتے ہیں، اور چند حدیثیں وہاں سن کر یہاں کے عوام کو گمراہ کرتے ہیں کہ حنفیت حدیث کے خلاف ہے، حالانکہ یہ دعویٰ بالکل خلافِ واقعہ ہے، مگر ناتمام علم یونہی صحیح راہ سے ہٹا دیتا ہے۔

ان حالات میں اس ضرورت کا احساس ہوتا ہے کہ حدیث کی بعض کتابوں کو درس میں اس نقطۂ نظر سے شامل کیا جائے کہ فقہ حنفی جن احادیث کی بنیادوں پر اُستوار ہے، وہ مجموعی طور پر طالب علم کی نگاہ میں آجائیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے والی ایک

مختصر اور جامع کتاب **المعتصر** من آثار السنن وإعلاء السنن کے نام سے سامنے آئی ہے۔ یہ کتاب اس بات کی مستحق ہے کہ اسے مشکوٰۃ شریف سے پہلے پڑھا دیا جائے، نصاب تعلیم میں شامل کرنے کے لئے جو اصول وضوابط اصحابِ درس کے یہاں ملحوظ ہیں، ان اصول وضوابط کے معیار پر یہ کتاب پوری اترتی ہے۔

وہ اصول وضوابط کیا ہیں؟ اس پر تفصیلی گفتگو کسی اور موقع پر کی جائے گی، فی الحال اس مختصر تحریر سے اربابِ مدارس کو اس بات کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے کہ یہ کتاب نصاب میں داخل کریں، اس سے جہاں حدیث کے علم میں اضافہ ہوگا، وہیں ایک بڑے فتنے کا سدباب بھی ہوگا۔

دار العلوم دیوبند کے اصحابِ شوریٰ اور اساتذۂ کبار اس پر توجہ دیں، تو ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلے مدارس اسے داخلِ درس کر لیں گے، اور جو ذہن ودماغ اسلاف ومشائخ سے بدگمان ہوکر ان سے اعتماد کھو رہے ہیں، اور اس کی وجہ سے اباحیت بلکہ گستاخی کے شکار ہو رہے ہیں، وہ مطمئن اور آسودہ ہوں گے، اور لعن آخر هذه الامة أولها (اس امت کے پچھلے لوگ اگلوں کو برا بھلا کہیں گے) کا منظر کسی حد تک ختم ہوگا۔

☆☆☆☆☆

حقیقت علم اور اس کے تقاضے

دین کی بقاء، علم دین کی بقاء وتحفظ سے ہے، اگر کسی دین ومذہب کا علم ختم ہوجائے، تو وہ دین ہی ختم ہے، جب تک دین کا علم محفوظ ہے، دین کے آثار ونشان زندہ ہیں، یہی نہ ہو تو دین کے نشانات تک محو ہوجائیں۔ لیکن دین کا علم ہے کیا؟ وہ جو کتابوں میں محفوظ ہے؟ نقوش وحروف یا کچھ اور؟ عام طور پر خیال کرلیا جاتا ہے کہ کتابیں موجود ہیں، دین کے تمام اصول وضوابط، تمام احکام ومسائل، تمام قرآن وحدیث اور ان کی شرح وتفسیر دنیا میں موجود اور محفوظ ہے، بلکہ وسائل کی فراوانی اور طباعت کی آسانی کی وجہ سے بے شمار دینی کتابیں مختلف موضوعات پر ہر روز پریس سے چھپ چھپ کر نکل رہی ہیں، علماء متقدمین کی کارآمد کتابیں، احادیث کے وہ مجموعے جن کو دیکھنے کو نگاہیں ترستی تھیں، اب بہت تیزی کے ساتھ عمدہ کاغذ اور بہترین طباعت کے ساتھ ان کی اشاعت ہورہی ہے، اس صورتحال سے سمجھ لیا جاتا ہے کہ دین بالکل اپنی اصلی حالت میں موجود ہے، لوگوں کی زیادہ توجہ اس بات پر ہے کہ پرانے کتب خانے کھنگال کر نایاب اور غیر مطبوعہ کتابیں، عمدہ کتابت وطباعت کے ساتھ مزین ہوکر لباس حریر پہن پہن کر مرکز نگاہ بنتی رہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہی علم ہے؟ اور کیا اسی سے دین کا تحفظ ہوجائے گا؟

اگر ایک سرسری نظر سے دیکھا جائے، تب بھی سمجھ میں آجائے گا کہ کتابیں بجائے خود علم نہیں ہیں، وہ تو علم کے ظاہری رسوم ونقوش ہیں، جن کی مدد سے علم تک

پہونچا جاسکتا ہے، ورنہ علم تو وہ ہے جو انسان کے دماغ میں محفوظ ہے، جس سے انسان کا قلب متصف ہے، انسان عالم ہوتا ہے، کتابیں عالم نہیں ہوتیں، ''بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُوْرِ الَّذِيْنَ أُوْتُوْا الْعِلْمَ '' ہے۔ علم نام اس کا ہے، جو اہل علم کے سینے میں ہے، اس کا نہیں جو کاغذ کے سفینے میں ہے، علم کی بقاء علماء سے ہے، کتب اور صحائف سے نہیں ہے، کتابوں کی کثرت خواہ جس قدر ہو، اگر علماء نہیں ہیں تو یہ اوراق بے جان اور مردہ ہیں، ان سے دین کا تحفظ کیا ہوگا؟

پھر علماء بھی وہ نہیں جن کا کام صرف کتابوں کا مطالعہ کرنا، پڑھنا پڑھانا اور علمی تحقیقات میں مشغول رہنا ہے، یہ لوگ معلومات کے جامع تو ہو سکتے ہیں، لیکن جو اہل علم مطلوب ہیں وہ نہیں ہو سکتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو معلومات تو بہت کچھ رکھتے ہیں، کسی بات کی تحقیق کرنی ہو تو بظاہر علم کا دریا بہتا ہوا دکھائی دیتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ علم وہ ہے جس کا اثر عالم پر دکھائی دے، علم ایک صفت ہے جس سے عالم متصف ہوتا ہے، علم انسان کے قلب میں جاگزیں ہوتا ہے اور اس کے اثرات عالم کے پورے وجود پر ظاہر ہوتے رہتے ہیں، آدمی نے جو کچھ پڑھا ہے، اس کا ظہور اس کے احوال وکیفیات میں، اس کے کردار وسیرت میں، اس کے اخلاق وعادات میں اور اس کے افعال واعمال میں ہوتا ہو، تب تو وہ عالم ہے، اس کا وجود سراپا دین ہے، اور اگر اس کے معلومات کچھ ہیں اور اس کے احوال کچھ ہیں، زبان وقلم سے ظاہر ہونے والا علم کچھ اور ہے، اور سیرت وکردار سے جلوہ گری کسی اور چیز کی ہے، تو یہ علم نہیں، معلومات ہیں اور وہ عالم نہیں، بلکہ علم کا ایک ظرف ہے جیسے کتاب نقوش علم کا ظرف ہوتی ہے۔

عالم وہی ہے، جو علم کے آثار کی جلوہ گری اپنے اندر رکھتا ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۔ اللہ کی خشیت رکھنے والے اس کے بندوں میں صرف علماء ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ اہل خشیت کو علماء قرار دیتے ہیں، دوسرے لفظوں میں عالم وہی ہے جس کے اندر خشیت پائی جاتی ہو، اس کی پوری

زندگی خشیت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہو، یہ خشیت، یہ خوف الٰہی ہی دین کا بلکہ زندگی کا راس المال ہے۔ یہی اصل علم ہے، یہی اثر علم ہے۔

اصحاب علم کی ذمہ داری ہے کہ وہ دوسروں کا نہیں، اپنے قلب کا، اپنے باطن کا جائزہ لیتے رہیں، ایک مسافر جب اپنی منزل کی طرف جاتا ہے، تو راستے میں وہ آثار ونشانات کو دیکھتا رہتا ہے، جو درمیان راہ میں پڑتے ہیں، جب تک وہ ان آثار وعلائم کو دیکھتا رہتا ہے، اس وقت تک مطمئن رہتا ہے، چلتا رہتا ہے، مسرور ہوتا رہتا ہے کہ منزل قریب آتی جارہی ہے، اور اگر وہ راہ کے ان نشانات کو نہیں پاتا، تو اولاً اس کی طبیعت میں کھٹک پیدا ہوتی ہے، پھر وہ تحقیق کرتا ہے، اور بالآخر اس پر منکشف ہوجاتا ہے کہ وہ غلط راہ پر جارہا ہے، پھر وہ پریشان ہوکر پلٹتا ہے، اور کوشش کرتا ہے کہ صحیح راہ پر آجائے، اسی طرح علم اور دین کا مسافر جب یہ راہ طے کرتا ہے، تو اسے بغور دیکھتے رہنا چاہئے کہ خشیت اور تقویٰ وتدین کے آثار نمودار ہورہے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں ہورہے ہیں تو اسے پلٹنا چاہئے، ورنہ آدمی چلنے کی دھن میں کہیں سے کہیں نکل جائے گا۔

علم اور خشیت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، جن کے حصول کے زمانے علیٰحدہ علیٰحدہ ہوں، کہ پہلے علم حاصل کرلیا جائے، پھر خشیت اور تدین حاصل کیا جائے، بلکہ یہ دونوں ہمرکاب اور ہم عنان ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرا نامکمل ہے، نامعتبر ہے، اسی لئے طالب علم کو ایسے استاذ کا انتخاب کرنا چاہئے جس کا علم خشیت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہو، اور جس کی خشیت علم کے زیر اثر ہو، اگر استاذ کے اندر یہ وصف ہوگا، تو طالب علم ذرا بھی صاحب استعداد ہوگا تو، وہ راہ سے بھٹکے گا نہیں، اس طرح اس کا وہی استاذ، اس کا مدرسہ بھی ہوگا، اور اس کی خانقاہ بھی ہوگا، ورنہ کم از کم یہ ضروری ہے کہ اساتذہ سے کسب علم کرتا رہے، اور کسی صاحب نسبت، صاحب خشیت بزرگ سے اکتسابِ فیض کرے۔

آج ہمارے مدارس میں پڑھنے پڑھانے کا رواج تو ہے، مگر جو اصل راس

المال ہے، اس کی طرف توجہ کم ہے، اس کا اثر اساتذہ پر یہ ہے کہ علم دین جو خالص اللہ کے لئے ہے، ذریعۂ معاش بن کر رہ گیا ہے، ذریعۂ معاش ایک فن ہے، جسے آدمی اس طور پر برتتا ہے کہ معاش میں ترقی ہوتی رہے، اس میں کوئی تقدس نہیں ہوتا، کوئی عظمت نہیں ہوتی، یہی حال بیشتر اساتذہ کا دیکھنے میں آتا ہے، مدرس اور استاذ کی اصل ذمہ داری طالب علم کی خدمت ہے کہ اسے زیورِ علم وعمل سے آراستہ کرے، مگر چونکہ تدریس اس کے نزدیک ایک ذریعۂ معاش اور ایک تجارت کی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے اگر اس کی تنخواہ پر ضرب نہ پڑے تو اسے طالب علم کی، اس کے پڑھانے کی اور اس کے مطالعۂ ومذاکرہ کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی، وہ کسی راہ پر جا رہا ہو، اسے تنخواہ ملنی چاہئے، چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ استاذ مدرسہ میں حاضر ہوتا ہے، رجسٹر پر دستخط کرتا ہے، گویا ہر روزاور ہر گھنٹے میں پڑھاتا ہے، مگر سال بھر میں اس نے کتنا پڑھایا ہے، افسوسناک حد تک اس میں کمی ہوتی ہے، حالانکہ سبق کم ہوگا تو طالب علم کا وقت ضائع ہوگا، اس کی استعداد برباد ہوگی، ناغہ ہوگا تو اس کی طبیعت اچاٹ ہوگی، علم کی ناقدری دل میں راسخ ہوگی، اور ہر سال ترقی پا کر فارغ التحصیل تو ہوجائے گا مگر علم وتدین سے کورا ہوگا۔ مدارس کے طلبہ سے ملنے اور ان سے سوال کرنے پر بکثرت معلوم ہوتا رہتا ہے کہ فلاں کتاب سال بھر میں ۵؍صفحے پڑھائی گئی ہے، دس بیس صفحے پڑھائی گئی ہے۔ جلالین شریف قرآن کریم کی ایک مختصر ترین تفسیر ہے، ہمارے مدارس کے نصاب میں از اول تا آخر داخل نصاب ہے، اور کچھ ایسا مشکل عمل نہیں ہے کہ روزانہ دو گھنٹے اسے پڑھا کر مکمل نہ کرادیا جائے، مگر حال یہ ہے کہ کہیں اس کے پانچ چھ پارے سال بھر میں ہوتے ہیں، اور کہیں دس پندرہ پارے، باقی سے طالب علم محروم رہا۔ یہ تو وہ حضرات ہیں جو پڑھاتے ہی نہیں، اور جو مکمل پڑھا لیتے ہیں، ان کا حال بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے، ان کا پڑھانا یہ ہوتا ہے کہ سال کے اکثر حصوں میں لاپرواہ رہتے ہیں، اور جب سال کا آخر ہوتا ہے، تو صبح بھی پڑھا رہے ہیں، درس کے وقت بھی پڑھا رہے ہیں، رات میں بھی

پڑھا رہے ہیں، معدہ کی طاقت دو روٹیوں کی ہے، اس میں دس دس روٹیاں ٹھونس رہے ہیں، اس طرح کتاب تو مکمل ہو جاتی ہے، مگر طالب علم کی کیا گت بنتی ہے، وہ جاننے والوں سے مخفی نہیں ہے، ہمارے وہ مدارس جہاں کتاب مکمل کرانے کی پابندی ہے، وہاں عموماً یہی حال ہوتا ہے، ضرورت سے کم پڑھایا تو بھی، اور استعداد سے زیادہ پڑھایا تو بھی، ہر صورت میں طالب علم کا اور علم کا سخت نقصان ہے، یہ نتیجہ ہے اس کاروباری ذہنیت کا، جس نے خشیت اور تقویٰ کو ہٹا کر اپنی جگہ بنا رکھی ہے۔

اور طالب علم تو عموماً اپنے اساتذہ کی ذہنیت کا پرتو ہوتے ہیں، جیسا اپنے بڑوں کو کرتے دیکھتے ہیں، شعوری اور غیر شعوری ہر طرح اسی کو اپناتے ہیں، اساتذہ میں کاروباری ذہنیت ہے، تو ان میں بھی یہی ذہنیت سرایت کرتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پڑھنا لکھنا، محنت کرنا، یا سست پڑے رہنا، سب اسی ذہنیت کے تابع ہوتا ہے، تعلیم سے زیادہ انھیں تعطیل سے دلچسپی ہوتی ہے، پڑھنے سے زیادہ کھیل کود سے رغبت ہوتی ہے، اللہ کے لئے پڑھنے کا کوئی تصور ہی باقی نہیں رہتا ہے، بلکہ سمجھانے سے سمجھ میں بھی نہیں آتا۔

اربابِ انتظام، جب انتظام مدرسہ کو کاروباری نوعیت کی چیز سمجھ لیتے ہیں، تو انھیں اس کا ہوش نہیں رہتا کہ کون سا انتظام شرع شریف کے مطابق ہے، جس سے اللہ راضی ہوتا ہے، اور کون سا انتظام ایسا ہے، جو شرعاً جائز یا مناسب نہیں ہے، جس سے برکت کے بجائے نحوست آتی ہے، بس اندھا دھند جو چیز ان کے جاہ ومنصب اور کاروبار کے مطابق ہوتی ہے اسے کرتے رہتے ہیں، خواہ اس کے لئے جھوٹ بولنا پڑے، خیانتیں کرنی پڑیں، اربابِ دنیا کے سامنے مداہنت اور کتمانِ حق کرنا پڑے، اور کوئی چیز خواہ شرع میں کتنی ہی ضروری ہو، جب ان کے مفاد سے ٹکراتی ہے، تو بے تامل اسے ٹھکرا دیتے ہیں۔

اسی ذہنیت کا اثر ہے کہ مدارس تین متحارب گروپ کے اکھاڑے بنے رہتے

ہیں، ہر وقت ایک آویزش قائم رہتی ہے، اور اگر حقیقی علم اپنے آثار ولوازم کے ساتھ موجود ہوتا تو تینوں طرح کے کارکنوں میں خشیت الٰہی کا غلبہ ہوتا، اوّل تو آویزش نہ ہوتی، اور اگر ہوتی تو معمولی تدبیروں سے وہ فرو ہو جاتی۔

مدارس اور خانقاہوں میں جب ربط تھا، تو خلوص وخشیت کی فراوانی تھی، اب یہی طلبہ کی غیر تربیت یافتہ فوج خانقاہوں پر بھی قابض ہو رہی ہے، تو وہاں بھی وہی بیماری دکھائی دینے لگی ہیں، جن کا تسلط مدارس میں ہے۔ یہ اہل مدارس، اربابِ علم اور مشائخ خانقاہ سب کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے، اور اس بیماری کے علاج کی سب کو ضرورت ہے، ورنہ در و دیوار رہ جائیں گے، اصل سرمایہ غائب ہوگا، انسانی ڈھانچے باقی رہیں گے، روح نکل چکی ہوگی۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار**

(ماہنامہ ضیاء الاسلام، اکتوبر ۲۰۰۸ء)

◆ ◆ ◆

دینی مدارس کا حکومت سے تعاون لینا مناسب یا غیر مناسب؟

سوال

ایک خالص دینی مکتب ہے، جس میں ناظرہ، حفظ اور دینیات کی تعلیم ہوتی ہے، سرکاری پرائمری کے معیار سے درجہ پانچ تک تعلیم ہے، اس میں حکومت ہند کی پیشکش ہے، کہ دو استاذ گورنمنٹ کے صرفہ پر رکھیں، جو عصری علوم ہندی، انگریزی، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ کی تعلیم دیں گے، اور اس کے ساتھ نصاب کی کتابیں اور کمپیوٹر بھی حکومت فراہم کرے گی، دونوں استاذ کی تنخواہ گورنمنٹ دے گی، کیا حکومت سے اس خالص دینی مکتب کے لئے یہ تعاون لینا درست اور مناسب ہوگا؟ آپ اپنے تجربات کی روشنی میں کیا رائے رکھتے ہیں؟۔ (حافظ ابوالجیش، شیخو پور)

جواب

علماء ہوں یا دینی مدارس، ان کا تعلق حکومت اور اہل حکومت سے دین کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے، بعض مجبوریاں ایسی پیش آتی ہیں کہ حکومت کے دروازوں پر جانا پڑتا ہے، مگر یہ مجبوری کا مسئلہ ہے، جب مجبوری ہو تو گنجائش ہے، مگر طوع ورغبت سے حکومت کے دروازوں کا چکر لگانا، حکومت سے تعاون حاصل کرنا بالخصوص ایسی حالت میں کہ اس حکومت کو ہمارے مذہب سے کوئی تعلق اور محبت نہ ہو، قطعاً صحیح نہیں، یہ بات مجھ سے نہیں اسلام کے مسلم امام، امام غزالی سے سنئے! وہ علماء کی دو قسمیں کرتے ہیں، علمائے آخرت اور علمائے سو، پھر ہر ایک کی علامتیں بیان کرتے ہیں،

علمائے آخرت کی ایک علامت یہ بیان کرتے ہیں کہ:

”وہ حکومتوں سے بہت دور رہتے ہیں، جب تک انھیں ممکن ہوتا ہے وہ سلاطین کے پاس نہیں جاتے، بادشاہوں اور حکام سے ملنے جلنے میں بہت احتیاط کرنی چاہئے، ان کے پاس جانا تو دور کی بات ہے، اگر وہ علماء کے پاس آئیں، تب بھی ان سے دور رہنا ہی مناسب ہے، کیونکہ دنیا بہت دلفریب ہے، اپنے اندر لذتوں کا سامان رکھتی ہے، اور دنیا کی لگام بادشاہوں ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور جو کوئی ان کے ساتھ ملتا جلتا رہتا ہے، ضرور ہے کہ وہ ان کی چاپلوسی اور خوشامد میں مبتلا ہو، حالانکہ وہ ظالم وجابر ہوں گے، تو ان کے پاس جانے والا کسی نہ کسی معصیت میں ضرور مبتلا ہوگا، ان کی رونق اور آرائش وآسائش پر نظر کرے گا، تو اس کے اوپر جو اللہ کے احسانات ہیں، انھیں حقیر وکمتر سمجھے گا، یا اپنے مقصد کے حصول کے لئے ان کی تعریفیں کرے گا، تو مبالغہ اور جھوٹ میں مبتلا ہوگا، یا ان سے مال وزر کی حرص رکھے گا، تو حرام میں ملوث ہوگا، غرض کہ حکام سے اختلاط رکھنا معاصی کی کنجی ہے، علمائے آخرت کا طریقہ اس سے احتیاط کرنا ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **من أتیٰ السلطان افتتن (أخرجه ابو داؤد والترمذی وحسنه والنسائی من حدیث ابن عباس)** جو کوئی بادشاہ کے پاس گیا، وہ فتنے میں پڑا، اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **العلماء أمناء الرسل علی عباد اللہ تعالیٰ مالم یخالطوا السلاطین، فإذا فعلوا ذٰلک فقد خانوا الرسل فاحذروهم واعتزلوهم، (أخرجه العقیلی فی الضعفاء)** علماء کا مقام ومرتبہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کے حق میں رسولوں کے نائب اور امین ہیں، لیکن یہ مرتبہ اسی وقت تک ہے، جب تک وہ سلاطین کے پاس آمد ورفت نہ رکھیں، اور نہ حکومتوں سے کوئی ربط وتعلق قائم کریں، اگر انھوں نے یہ کام کرلیا، تو انھوں نے رسولوں کے حق میں خیانت کی، اس لئے ان سے بچو اور ان سے دور ہی رہو۔ نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **شرار العلماء الذین یاتون الامراء وخیار الامراء الذین**

یاتون العلماء (أخرجه ابن ماجه بالشطر الاول نحوه من حدیث أبی هریره بسندٍ ضعیف " تخریج للعراقی ") بدترین علماء وہ ہیں، جو حکمرانوں کے یہاں حاضری دیتے ہیں، اور بہترین حکام وہ ہیں، جو علماء کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ (تلخیص از احیاء علوم الدین، ج:۱، ص:۶۸)

ہم نے امام غزالی علیہ الرحمہ کا یہ کلام تلخیصاً نقل کیا ہے، تفصیل دیکھنی ہو تو احیاء العلوم میں دیکھئے، انھوں نے متعدد صحابہ کرام، تابعین عظام اور ائمہ امت کے اقوال وارشادات نقل کئے ہیں، ان سب حضرات نے حکومتوں کے تعلق کو علماء کے لئے زہر قرار دیا ہے، ہاں اگر کوئی ان کے جاہ ومنصب اور مال وزر سے بے نیاز ہو کر ان کی غلطیوں پر تنبیہ کے واسطے ان کے پاس جائے، تو یہ البتہ افضل جہاد ہے، یا یہ کہ بادشاہ نیک اور دیندار ہو، اور دینداری کے اصول پر حکمرانی کرنا چاہتا ہو، اور اس کے لئے وہ علماء حق سے مشورہ لینا چاہتا ہو تو بقدر ضرورت ایسے بادشاہ سے اختلاط وتعلق میں کوئی حرج نہیں، اس موضوع پر مشہور عالم ومحدث حضرت علامہ ابن عبدالبر نے بھی اپنی تصنیف "**جامع بیان العلم واهله** "میں تفصیل سے کلام کیا ہے۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ ان اکابر نے علماء کو جن حکومتوں کے ربط وتعلق سے منع کیا ہے، وہ مسلمان حکومتیں ہیں، اب اندازہ کر لیجئے، جو حکمراں دولت اسلام سے خالی ہیں، ان کے بارے میں ان کی کیا رائے ہوگی؟

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں، مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے بعد، جب ایک دشمن ملک وملت قوم کی یہاں حکمرانی قائم ہوئی، تو علمائے اسلام اور خواص کے دو گروہ ہو گئے، ایک گروہ نے دنیاوی مفاد کی خاطر حکومت کی گود میں بیٹھنے کی کوشش کی، اس گروہ نے اس کی پروا نہیں کی کہ اس سے دین ودیانت کو کتنا نقصان پہونچتا ہے، اس گروہ کے خیالات منحرف ہوئے، شکل وصورت بدلی، دل بدلے، دماغ بدلا، اگر ملک میں صرف یہی گروہ ہوتا، یا اس کا غلبہ ہو گیا ہوتا، تو اسلام اور مسلمان یہاں قصۂ

پارینہ بن کر رہ گیا ہوتا۔

لیکن ایک گروہ نے اس حکومت سے کنارہ کشی اختیار کی، اور اپنا قلعہ الگ بنایا، جس کو حکومت کی دراندازی سے محفوظ رکھا، انھوں نے بڑی دانائی سے، بلکہ اللہ کی توفیق سے حکومت کے کاروبار سے یکسر الگ ہوکر مدارس کا ایک نیا نظام جاری کیا، اور اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اس ملک میں نہ صرف دین کی حفاظت کی بلکہ نئی توانائی وتازگی بخشی، کتنی بدعات وخرافات کا خاتمہ ہوا، ملک کے اکثر حصوں میں ایمان کی بادِ بہاری چلی۔

دیکھنا یہ ہے کہ ان مدارس کو ان برگزیدہ ہستیوں نے کن خطوط پر اُستوار کیا۔ کیا آج ان سے ہٹ جانے سے کوئی خیر وجود میں آئے گا؟ اس سلسلے میں ہمیں دیکھ لینا چاہئے کہ ہندوستان میں جن بزرگوں نے مدارس کی داغ بیل ڈالی ہے، انھوں نے ان کے لئے کیا اصول بنائے ہیں، ہماری خوش قسمتی سے وہ اصول تحریری شکل میں موجود ہیں، اور انھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگوں کی نگاہ کتنی دوررَس تھی، وہ گویا آج کا بھی دور دیکھ رہے تھے، درحقیقت یہ اصول الہامی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ حضرات اللہ کے لئے، اللہ کے رسول کے لئے، اللہ کے دین کے لئے خود کو فنا کئے ہوئے تھے، انھیں دنیاوی جاہ ومنصب اور فانی مال ودولت سے کوئی رغبت نہ تھی، ان کے قلوب اور ان کے نفوس مجلّٰی ومزکّٰی تھے، اس لئے حق تعالیٰ نے ان کے قلوب میں علوم صحیحہ القا کئے۔

بات تو ذرا طویل ہوجائے گی، مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ سارے اصول بتمامہ یہاں نقل کردئے جائیں، ان اصولوں کی تحریر بانئ دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کے قلم سے ہے، جو اس وقت کے اکابر اہل مشورہ کی تصدیق وتائید سے طے کئے گئے تھے۔

(۱) اصل اول یہ ہے کہ تامقدور کارکنان مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے، آپ

کوشش کریں، اوروں سے کرائیں، خیر اندیشان مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

بظاہر ’’ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے‘‘ عجیب بات معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ عجیب بات واقعی مدرسوں کی جان ہے، مدرسہ میں غریب طلبہ داخل ہوں گے، ان کے کھانے پینے کا نظم کرنا ہوگا۔ روؤسا کے بچے کم آئیں گے، اساتذہ باتنخواہ متعین کئے جائیں گے، معتدبہ تعمیرات کی ضرورت ہوگی، یہ سب باتیں تو ہیں، لیکن ان سب کے ضمن میں ایک اور عجیب وغریب افادیت کا حامل نکتہ پوشیدہ ہے، تکثیر چندہ پر نظر ہوگی، تو زیادہ سے زیادہ مسلمانوں سے رابطہ کرنا ہوگا۔ جب وہ چندہ دیں گے، تو مدارس سے ان کا ربط ہوگا، کیونکہ آدمی جس پر مال خرچ کرتا ہے اس سے ایک گہرا تعلق ہوجاتا ہے، چنانچہ مدارس کے واسطے سے عوام الناس کا ربط علمائے دین اور دین سے ہوگا، ورنہ جو صورتحال اس وقت نظر آرہی تھی، اور آج بھی وہی باقی ہے کہ آدمی دنیا اور کسب دنیا میں منہمک ہوکر دین کو یکسر فراموش کردے گا، تو ان چندوں کا فائدہ مدرسوں کو جو حاصل ہوگا، وہ تو دین کے حساب میں ہے ہی، خود چندہ دینے والوں کا دین وایمان درست اور سنبھلا رہے گا، چنانچہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ باوجود بہت ساری کمیوں اور خرابیوں کے مسلمانوں میں دین وایمان کی چمک دمک کا بڑا حصہ ان مدارس اور ان کے چندوں پر منحصر ہے۔

(۲) ابقائے طعام طلبہ بلکہ افزائش طلبہ میں جس طرح ہوسکے خیر اندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

مومن کی نگاہ فراست دیکھ رہی تھی، کہ خالص دینی تعلیم کے لئے جو طبقہ آگے بڑھے گا اس میں زیادہ تر مساکین اور غرباء ہوں گے، نیز یہ کہ اب دینی تعلیم وتربیت کا انتظام واہتمام، گھروں اور مسلمانوں کے خاندانی ماحول ومعاشرہ میں ممکن نہ ہوگا، کیونکہ دنیاداری کے غلبہ نے ماحول کو خالص دنیادارانہ بنادیا ہوگا، اس لئے مدرسہ کی چہاردیواری میں طلبہ کے لئے اقامت گاہیں ضروری ہیں، تاکہ وہ دنیاداری کے ماحول

سے کٹ کر اور ہٹ کر خالص دینی ماحول میں، جہاں قال اللہ وقال الرسول کے علاوہ دوسری کوئی آواز نہ آتی ہو، ایک مدت تک مقیم رہیں، اس طرح ان بزرگ اساتذہ کی صحبت میں ان کے علم میں بھی، تدین میں بھی، تقویٰ وطہارت میں بھی رسوخ اور استحکام پیدا ہوگا۔ چنانچہ تجربہ شاہد ہے کہ یہ عمل بہت موثر ثابت ہوا، ظاہر ہے کہ اس کیلئے مدرسہ میں کھانے کا نظم ضروری ہے، پھر جب کوشش یہ ہوگی کہ زیادہ سے زیادہ تعداد مسلمانوں کی تعلیم دین میں آئے، تو ابقائے طعام ہی نہیں، افزائش کی بھی ضرورت ہوگی۔

ان دو اصولوں کے بعد تیسرا اصول جو لکھا گیا، وہ ہمارے زیر بحث موضوع سے ذرا علیٰحدہ ہے، اس کا تعلق مدرسہ کے داخلی امور انتظام اور اصحاب مشورہ سے ہے، لیکن مدارس کے بقاء اور اس کے تحفظ کے لئے گویا وہ سب کی جان ہے، اس لئے اسے بھی ملاحظہ کرلیں۔

(۳) مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اُسلوبی ہو، اپنی بات کی پچ نہ کی جائے، خدانخواستہ جب اس طرح کی نوبت آئے گی کہ اہل مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو، تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا۔

القصہ تہہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس وپیش میں خوش اُسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو، اور اس لئے ضروری ہے کہ اہل مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں، اور سامعین بہ نیت نیک اسے سنیں، یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی، تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو، بہ دل وجان قبول کریں گے، اور نیز اسی وجہ سے ضروری ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے، خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد وصادر جو علم وعقل رکھتا ہو اور مدرسہ کا خیر اندیش ہو، اور نیز اس وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے اہل مشورہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے، اور بقدر ضرورت

اہل مشورہ کی مقدار معتد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو، تو پھر اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا گیا، ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہل مشورہ معترض ہوسکتا ہے“

اس اصول میں حضرت نانوتوی نے اہل مشورہ کو دو حصوں میں رکھا ہے، ایک وہ جو مستقل مشیر مدرسہ ہیں۔ یہ غالباً وہ لوگ ہیں جو مستقل ارکانِ شوریٰ ہیں، دوسرے وہ جو مشورہ کے اہل صاحب علم وعقل ضرور ہیں، مگر وہ مستقل اہل شوریٰ نہیں ہیں، مہتمم کو استفادہ دونوں سے کرنا چاہئے، لیکن اب تو مدرسہ والوں نے شوریٰ کو وہ حیثیت دے دی ہے جو جمہوری حکومتوں میں اسمبلی اور پارلیمنٹ کی ہوتی ہے، دنیا کی مسموم ہوا کے جھونکوں نے مدارس کے اندرونی ماحول کو بھی جھلسا رکھا ہے، **والقصۃ بطولہا**

(۴) یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں، اور مثل علماء روزگار کے، خودبیں اور دوسروں کے درپئے توہین نہ ہوں، خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی، تو اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

متفق المشرب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایک خیال، ایک نظریہ اور ایک اعتقاد کے ہوں، جب کئی خیال ونظریے کے اساتذہ جمع ہوں گے، تو باہم کشمکش ہوگی، اور طلبہ کی تربیت اور تعلیم میں خلل ہوگا، چنانچہ اب اس کا تجربہ بکثرت ہوتا رہتا ہے۔

(۵) خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے مقرر ہوچکی ہے، یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو، پوری ہوجایا کرے، ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا، اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

یہ اصول تعلیم کے لئے بہت اہم ہے، عموماً کتابوں کی مقدار خواندگی متعین ہوتی ہے، اس کو شروع سے اس اندازہ سے پڑھانا چاہئے کہ اخیر سال میں بغیر کسی غیر معمولی تیزیٔ رفتار کے خواندگی پوری ہوجائے۔ اس کے نہ ہونے کی صورت میں، فرمایا کہ اول تو مدرسہ خوب آباد نہ ہوگا، ہم دیکھ رہے ہیں کہ بڑے مدارس میں بھی اور چھوٹے مدارس میں بھی مقدار خواندگی اب بہت کم ہوتی ہے، اور جہاں پورا کرنے کا

اہتمام ہے وہاں بھی ابتداء میں اسباق بہت کم کم ہوتے ہیں، اخیر سال میں اساتذہ، طلبہ کا سارا وقت گھیر لیتے ہیں، انھیں نہ مطالعہ کا موقع ملتا ہے، اور نہ تکرار و مذاکرہ کا، اسی وجہ سے مدرسوں میں ویرانی چھائی جارہی ہے، عمارتوں کی رونق تو بیشک دکھائی دیتی ہے ، مگر تعلیم واستعداد کی رونق بہت کم ہوگئی ہے، مدرسوں سے طلبہ کی کھیپ کی کھیپ نکلتی ہے، مگر نہ علم، نہ تدین، نہ تقویٰ، نری دنیاداری، کاہلی، ناخداترسی، مفاد وخودغرضی ہی دکھائی دیتی ہے۔ ؎

اٹھا میں مدرسہ وخانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

(۶) اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں، جب تک یہ مدرسہ ان شاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانۂ تجارت، یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجاء، جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا، اور امداد غیبی موقوف ہوجائے گی، اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہوجائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

اس اصول کو بہت غور سے پڑھئے، اس میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ اول یہ کہ مدرسہ کی آمدنی کا کوئی ایسا یقینی ذریعہ نہیں ہونا چاہئے، جس کی وجہ سے آدمی مطمئن ہو کہ فلاں جگہ سے آمدنی تو ہورہی ہے، مثلاً کسی کارخانہ، تجارتی کمپنی، یا جاگیر وغیرہ کی آمدنی، یا کوئی ایک یا چند سرمایہ دار مل کر کسی مدرسہ کا انتظام کریں، جیسا کہ بعض جگہوں کے مدرسوں کے بارے میں معروف ہے، اس کو منع فرمارہے ہیں کہ اس کی وجہ سے اصحابِ انتظام، اساتذہ اور طلبہ سب اسی ذریعۂ آمدنی پر اعتماد کرلیں گے، اور اللہ کی طرف رجوع وانابت، جو دینداری کی روح ہے، جاتی رہے گی۔

مومن کی نگاہِ فراست میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل کا سارا نقشہ موجود تھا، کتنے مدرسے اپنی عمارت، اپنی ظاہری رونق اور سجاوٹ کے اعتبار سے بہت بڑھ چڑھ

کر ہیں مگر تعلیم کی افادیت سے یکسر بے فیض ہیں، کیونکہ انھوں نے اس قیمتی اصول سے انحراف کرلیا۔ اسی حکم میں وہ دینی مدارس بھی ہیں جو عوامی چندہ سے بدکتے ہیں، اور اس کا بدل انھوں نے یہ تجویز کیا ہے کہ پڑھنے والے طلبہ سے فیس کی شکل میں پڑھائی کی اجرت لیتے ہیں، اس میں دو خرابی ہے، ایک تو ایک یقینی ذریعہ آمدنی بنالیا ہے، جس کو اس اصول میں منع کیا گیا ہے، اور دوسرے یہ کہ یہ تعلیم بطور ٹیوشن کے ہے کہ طالب علم، استاذ سے علم حاصل کرتا ہے، اور اسے اس درس کی اجرت خود دیتا ہے، البتہ اتنا ہے کہ وہ براہ راست استاذ کے ہاتھ میں نہیں دیتا، مہتمم کے ہاتھ میں دیتا ہے، مہتمم اسے اساتذہ تک پہونچاتا ہے۔

ذرا غور کریں، احادیث میں دین کی تعلیم پر اجرت لینے کو منع کیا گیا ہے، لیکن اس کا محل یہ ہے کہ جس کو تعلیم دی ہے، خود اسی سے اجرت لی جائے، چنانچہ جن احادیث میں تعلیم قرآن پر اجرت لینے کی وعید ذکر کی گئی ہے، ان میں یہی صورت ہے کہ جس کو تعلیم دی گئی، اس سے کچھ معاوضہ لیا گیا، ملاحظہ ہو:

حضرت عبادہ بن صامت ؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ کا دستور مبارک یہ تھا، کہ جب کوئی شخص مسلمان ہو کر مدینہ ہجرت کر کے آتا، تو آپ اسے اپنے خاص خاص اصحاب کے حوالے کر دیتے کہ انھیں قرآن کی تعلیم دیں، ایک دفعہ آپ نے ایک شخص کو میرے حوالے کیا، میں اسے قرآن پڑھاتا تھا، ایک مرتبہ میں اپنے گھر پر تھا، اسے یہ خیال ہوا کہ اس کے اوپر میرا حق ہے، اس نے ایک عمدہ کمان جس سے بہتر کمان میں نے نہیں دیکھی تھی، مجھے ہدیہ کیا، میں اسے لے کر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، میں نے آپ سے اس کے متعلق دریافت کیا، آپ نے فرمایا کہ یہ آگ کا شعلہ ہے، جس کو تم نے اپنے کندھوں پر لٹکا رکھا ہے۔

(ابوداؤد فی البیوع، باب: ۳۶/ مستدرک حاکم کتاب الفضائل)

حضرت ابی بن کعب ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی کو قرآن پڑھایا،

اس نے مجھے ایک کمان ہدیہ کی، میں نے اس کا تذکرہ حضرت ﷺ سے کیا، آپ نے فرمایا کہ اگر تم نے اسے لیا تو آگ کی کمان لی۔ فرمایا کہ تب میں نے اسے واپس کر دیا۔
(ابن ماجہ: کتاب التجارات)

ایک اور حدیث حضرت ابو درداء ؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے تعلیم قرآن پر ایک کمان بھی لے لی، اسے اللہ تعالیٰ آگ کی کمان کا قلادہ باندھ دیں گے۔

اس حدیث میں ہدیہ کا بھی امکان ہے، اور اجرت کا بھی! لیکن ان سب روایتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جن کو آدمی قرآن کریم کی تعلیم دے، ان سے کوئی ہدیہ اور کوئی اجرت نہ لے، تاہم یہ صورت کہ آدمی جن کو تعلیم دیتا ہے، ان سے کچھ نہیں لیتا، حکومت یا مسلمانوں کی جماعت اسے کچھ معاوضہ دیتی ہے، اس کا بھی حکم یہی ہے یا کچھ اور؟

تو اسی سلسلے میں امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب ؓ کا عمل اور آپ کا فرمان فیصلہ کن ہے، علامہ جمال الدین زیلعی نے اپنی مشہور کتاب ''نصب الرایہ'' میں امام بیہقی کی کتاب ''المعرفۃ'' سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ معلمین کو وظیفہ دیا کرتے تھے، اور انھوں نے بعض گورنروں کے نام فرمان بھیجا تھا کہ تعلیم قرآن پر لوگوں کو وظیفہ دیا کرو۔ (ہدایہ مع الزیلعی: کتاب الاجارات)

پچھلی احادیث اور حضرت عمر ؓ کے عمل اور فرمان سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیم قرآن پر خود متعلم سے اجرت لینا ممنوع ہے، لیکن حکومت اگر وظیفہ دیتی ہے، یا عامۃ المسلمین کے چندہ سے مدرسوں کے ذمہ دار جو مسلمانوں کی حکومت کے نہ ہونے کی صورت میں بمنزلہ کارکنان حکومت ہیں، وہ اگر وظیفہ دیں، تو یہ ممانعت میں داخل نہیں، تو جن مدارس نے اپنی تعلیم اور انتظام کی بنا طلبہ کی فیس پر رکھی ہے، وہ در حقیقت انھیں طلبہ سے اجرت لیتے ہیں، جن کو تعلیم دیتے ہیں، جو بہر حال بہتر نہیں، اور جن مدرسوں

میں عوام الناس کے عطیات سے تنخواہیں دی جاتی ہیں، وہ ممانعت اور حرمت کے ذیل میں نہیں آتے۔

دوسری بات یہ جو فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ ''القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے'' جس دور میں یہ بات تحریر میں لائی گئی تھی، اس دور میں یہ بات خواہ جتنی ضروری رہی ہو، لیکن آج کے ہندوستانی ماحول میں یہ بات ضرورت کی انتہا کو پہونچی ہوئی ہے، آج فرقہ پرست اور مسلم دشمن طاقتوں کی نگاہ حسد مدارس کی شاندار اور عظیم عمارتوں پر جتنی پڑ رہی ہیں، وہ محتاج تشریح نہیں ہے، اور ان عمارتوں کو دیکھ کر کیا خود مسلمانوں کے دلوں میں عجب اور فخر نہیں پیدا ہو رہا ہے؟ پھر ان مدرسوں کی راہ میں جتنی رکاوٹیں آ رہی ہیں، ان سے ہر شخص واقف ہے۔

آپ قرآن کریم کے بیان کردہ اس واقعہ کو یاد کر لیجئے، جس میں ذکر ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے مسکین کی نئی اور اچھی کشتی کو توڑ کر عیب دار بنا دیا تھا، اور وجہ یہ بتائی تھی کہ آگے ایک ظالم بادشاہ ہے، اس کی نظر سے بچانا چاہتا ہوں، پس حکمرانوں کے ظلم وتعدی سے بچانے کی یہ ایک منصوص تدبیر ہے کہ تعمیر میں قدرے بے سروسامانی ملحوظ رکھی جائے۔

(۷) سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

سرکار کی شرکت کا مطلب یہ ہے کہ مدرسہ میں حکومت کی امداد قبول کی جائے، امراء سے مراد کون لوگ ہیں؟ کیا صرف صاحبان ثروت اور مالدار، یا ان کی کوئی خاص نوع مراد ہیں؟ ہمارے زمانے میں امیر ہر مالدار کو کہتے ہیں، لیکن جس زمانے میں یہ تحریر لکھی گئی ہے، اس دور میں امراء، دربارِ حکام کے وزراء واصحاب مناصب نیز زمینداروں کو کہا جایا کرتا تھا، یہ اگرچہ حاکم نہ ہوتے تھے، مگر ایک محدود پیمانے پر ان کی حکومت ہوا کرتی تھی، ان امراء میں ریاستوں کے نواب اور بڑے بڑے جاگیردار بھی شامل تھے۔ جمہوریت کے موجودہ دور میں امراء کی یہ قسم کم از کم ہندوستان میں تو ختم

ہو چکی ہے۔

بہر حال طے یہ کیا گیا کہ مدرسہ کے کام میں حکام کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے، اور امراء ووالیانِ ریاست کی شرکت بھی! آج سرکار کی شرکت مدرسوں کے تعاون کی صورت میں موجود ہے، اساتذہ کی تنخواہیں، تعمیر کے لئے رقوم، اور طلبہ کے حق میں امداد گورنمنٹ کی طرف سے ملتی ہے، چنانچہ ہمارے بہت سے دینی مدارس، حکومت کی امداد سے فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن حکومت کے تعاون کے نتیجے میں مدارس کو جن جن خرابیوں کو اور معاصی وسیئات کو بھگتنا پڑتا ہے، اس سے علماء تو خیر علماء ہیں، عوام بھی بے خبر نہیں ہیں، نہ ان سے انکار کرنا ممکن ہے۔

حکومت کی امداد کی ایک صورت وہ ہے جس کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ اور بھی صورتیں ہیں، مثلاً مکتب کے بچوں کو ماہانہ یا سالانہ وظائف دینا، انھیں ان مکاتب میں ایک وقت کا کھانا دینا۔ ان امور کا تجربہ آپ کو ہو چکا ہے، اور جن جن لوگوں نے خوش فہمی سے اس امداد کو قبول کیا ہے، وہ اس کا خمیازہ بھگت چکے ہیں، بہتوں نے یہ امداد بند کردی، اور جہاں جاری ہے، وہاں حرام کی اتنی مقدار اربابِ انتظام کے شکم میں پہونچ رہی ہے کہ دنیا وآخرت کی زندگی عذاب بن کر رہ گئی ہے۔

اب امداد کی یہ ایک پیشکش آپ نے بتائی، یہ جال بھی عرصہ سے پھینکا جارہا ہے، تاکہ مکاتب کے جو ضروری دینی مضامین ہیں ان کی اہمیت گھٹا کر ہندی، انگریزی، جغرافیہ، سائنس کی اہمیت طلبہ اور اساتذہ کی نظروں میں راسخ کردی جائے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دنیاداری کے ماحول میں ہر چیز کا پیمانہ مال ہوتا ہے، جس کے ذریعے سے مال کی جتنی زیادہ مقدار ملتی ہو، وہ اتنی ہی اہم ہوتی ہے۔ ایک مدرس قرآن پڑھاتا ہے، دینی تعلیم دیتا ہے، اور اس کی تنخواہ عوام کے عطیات اور چندوں سے ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ کم ہے، اور ہندی، انگریزی کے لئے گورنمنٹ تنخواہ دے گی، تو وہ اپنے معیار سے دے گی، اور وہ زیادہ ہے، تو اس تفاوت

کی وجہ سے دینی تعلیم کی اہمیت دل ودماغ سے بہت کم ہو جائے گی، پھر اس عدم توازن کی وجہ سے تحاسد اور تباغض کا جذبہ دلوں میں پرورش پائے گا۔

ایک صورت ایسی حالت میں اہل مدرسہ یہ اختیار کرتے ہیں کہ تنخواہ کا معیار تو متوازن ہی رکھتے ہیں، اور گورنمنٹ کی دی ہوئی رقم دو کے علاوہ مزید اور اساتذہ کے درمیان تقسیم کرتے ہیں، اس تدبیر سے تنخواہوں کا توازن تو درست رہتا ہے، لیکن اہل مدرسہ کی امانت ودیانت کو اذنِ رخصت مل جاتا ہے، دینے والے کی جو منشا ہے، اس کا پورا کرنا ضروری ہے، اور اس صورت میں خیانت کا ارتکاب ظاہر ہے، مزید اس میں حکومت کی قانونی گرفت سے بچنے کے لئے اہل مدرسہ کبھی کبھی یہ تدبیر اختیار کرتے ہیں کہ رجسٹر پر، اساتذہ سے گورنمنٹ کی مقرر کردہ تنخواہ پر ہی دستخط لیتے ہیں، اور رقم کم دیتے ہیں، اس صورت میں کئی خرابیاں ہیں۔ ایک تو جھوٹ بولنا، دوسرے جھوٹ پر دوسرے کو مجبور کرنا، تیسرے بچی ہوئی رقم اب بڑی آسانی سے مدرسہ میں جانے کے بجائے مہتمم کی جیب میں پہونچ سکتی ہے۔ اس صورتحال میں اساتذہ کے درمیان اور اہل انتظام کے درمیان کشاکش کا ہونا لازم ہوگا، پھر کیا کوئی پڑھے اور کیا کوئی پڑھائے گا۔

یہ تو میں نے نظری طور پر لکھا ہے، جب اس کو عملی طور پر برتنا ہوگا تو اللہ ہی جانتا ہے دنیاداری، شکم پروری اور خودغرضی کے اور کتنے انڈے بچے اس سے برآمد ہوں گے، کون کہہ سکتا ہے کہ اتنی خرابیوں کے بعد بھی یہ جائز ہے، ہاں اگر دنیا پرستی ہی مقصود ہو تو جو جو خرابیاں ہم نے اوپر ذکر کی ہیں، وہ سب بے وزن ہو کر رہ جاتی ہیں، دین ودیانت، اخلاقی قدریں اور خداترسی وتقویٰ کی کوئی حیثیت ووقعت اغراضِ دُنیوی کے مقصود ومعبود ہونے کے بعد نہیں رہ جاتی ہے، لیکن ہماری گفتگو امت کے اس طبقے سے نہیں ہے جو دنیا پرستی میں اس قدر آگے بڑھ چکا ہے، ہمارے مخاطب وہ ہیں جنھیں دینی قدریں، اخلاقی بلندیاں، امانت ودیانت کی روایتیں اب بھی عزیز ہیں۔

(۸) تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے، جن کو اپنے

چندہ سے امید ناموری نہ ہو، بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

یہ آخری اصول غور سے دیکھئے، تو پہلے اصول میں، جو کچھ غلو ہو سکتا ہے، اس کی اصلاح وقید ہے، اور اس پر ایک فائدۂ مزید ہے۔

پہلے اصول میں کہا گیا ہے کہ ''تا مقدور کارکنان مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے،'' اس اصول میں اگر انسانی طبیعت نے غلو کی راہ اختیار کی، تو نتائج خاصے خطرناک نکلیں گے، غلو کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر جگہ سے، ہر شخص سے چندہ لینے کی فکر ہوگی، اور زیادہ سے زیادہ لینے کی فکر ہوگی، پھر کیا حلال کیا حرام، کیا جبر، کیا خوشامد، کیا جھوٹی تعریفیں، کیا جھوٹ، کیا مبالغہ، تکثیر چندہ کے لئے آدمی سب کو روا رکھے گا۔

اس آخری اصول نے یہ سب دروازے بند کردئے، جہاں تک ہوسکے چندہ مخلصین کا لیا جائے۔ ان کا مال حلال بھی ہوگا، ان کی خدمت بھی نہ کرنی ہوگی، اور چندہ بابرکت ہوگا، اس کے برخلاف امراء وحکام اور بڑے بڑے صاحبان ثروت کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنی تعریف اور شہرت وناموری کا شوق رکھتے ہیں، ان کے مال کا بہت اعتبار بھی نہیں ہوتا ہے کہ کن ذرائع سے وہ حاصل کیا گیا ہے، اس قسم کا مال آئے گا، تو اس کے اثراتِ بد ضرور ظاہر ہوں گے۔

فائدۂ مزید جو اس اصول کے بین السطور سے جھلکتا اور اس کے التزام سے نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ مدرسوں کے لئے چندہ وصول کرنے والوں کو قدرے استغنا سے کام لینا چاہئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عموماً آدمی جس کام کے لئے نکلتا ہے، اس کی کوشش یہ ہوتی ہے، کہ جلد سے جلد اور زیادہ سے زیادہ مقدار میں اس کام کی تکمیل کرلے، چندہ کرنے والا جب کسی کے پاس چندہ کے لئے جاتا ہے تو اس کے دل میں بھی یہ خیال ہونا لازمی ہے، کہ جلد از جلد چندہ مل جائے، اور زیادہ سے زیادہ! یہ جذبہ

جب بڑھتا ہے تو آدمی وہ رویہ اختیار کرتا ہے، جیسے مدرسہ سراپا محتاج ہو، اور چندہ دینے والا بس حاجت روا ہے، یہ طریقہ غلط ہے، دین مستغنی ہے، پھر جو اس کا نمائندہ بن کر دین کی بقاء وتحفظ کے لئے، اور خود اس شخص کے فائدہ کے لئے جس سے چندہ لینا ہے، پہونچا ہے، اسے استغنا کی کیفیت سے خالی ہونا درست نہیں، ہاں یہ ہے کہ تکبر اور بد اخلاقی کو بھی راہ نہ دے، اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا، جبکہ ایسے شخص سے چندہ لینے کا اہتمام کیا جائے، جسے اپنے چندہ سے ناموری مقصود نہ ہو۔

ایک بزرگ عالم اپنے سفراء ومحصلین کو تاکید فرماتے تھے کہ تم کسی سے یہ مت کہو کہ ہمیں زکوٰۃ، عطیہ یا چندہ دیجئے، جب تک وہ مال اس کے پاس ہے اسے اختیار ہے، جہاں چاہے دے۔ ہم کیوں جبر ڈالیں کہ ہمیں دو، ہاں اس سے اپنے مدرسہ کا تعارف کرادو، مدرسہ کی ضرورت بتادو، مدرسہ کا خرچ بتادو، پھر انتظار کرو، اگر وہ چندہ دیدے، تو خوشی سے رسید بنا کر دیدو اور معتد بہ انتظار کے بعد بھی وہ نہ دے، یا توجہ نہ کرے، تو سلام کر کے وہاں سے واپس چلے آؤ، جو تمہاری قسمت کا ہے وہ مل کر رہے گا، یہ طریقہ بغایت عمدہ اور کارآمد ہے، بلکہ نہایت بابرکت ہے، جب چاہے کوئی تجربہ کر کے دیکھ لے۔ بات یہ ہے کہ دینے والے اللہ تعالیٰ ہیں، دلوانے والے اللہ تعالیٰ ہیں، سب کچھ انھیں کی طرف سے سمجھے، مخلوق سے بس اتنا ہی سروکار ہو کہ خالق سے بے توجہی اور بے رغبتی نہ ہونے لگے۔

ان اصولوں کو مدرسہ چلانے میں ملحوظ رکھا جائے، تو اللہ کی رضا بھی ہوگی، مدرسہ میں برکت بھی ہوگی، خواہ بہت بڑی اور شاندار عمارت بن سکے، یا نہ بن سکے۔

واللہ الموفق

اعجاز احمد اعظمی

۲۲؍ شعبان ۱۴۲۹ھ

* * *

مدارس کی حفاظت کیونکر ہو؟

ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے، جمہوریت کا اپنا ایک مزاج ہے، اپنا ایک دستور ہے، اس کا اپنا ایک مخصوص ماحول ہے، اس مزاج کو اس دستور کو اس ماحول کو اسلام سے، اسلامی تعلیمات سے، اسلام کے فکر ونظر سے کوئی مناسبت نہیں ہے، جمہوریت ایک دنیادارانہ نظام ہے، اس کی راہ بھی دنیا ہے، اس کی منزل بھی دنیا ہے، اس کے نشان راہ بھی دنیوی علائم وآثار ہیں، اس کو نہ اللہ سے کوئی واسطہ ہے، نہ رسول سے کوئی مطلب ہے، نہ دین سے کوئی غرض ہے، اس کی اپنی ایک رفتار ہے، اس پر وہ چلتی رہتی ہے، وہ نہ کسی مذہب کی طرف دیکھتی ہے نہ اس کے احکام سے اعتنا کرتی ہے، ہاں وہ اپنے دستور کے دائرے میں جو کہ سرتاسر دنیوی اغراض کا پابند ہے اہل مذہب کی رعایت کرتی ہے، اس لئے نہیں کہ اسے اس دین ومذہب سے کوئی تعلق ومحبت ہے، بلکہ اس لئے کہ اس مذہب کے افراد اس کے دستور واحکام کے دائرے میں شامل ہیں۔ اس کو کسی دین سے کوئی مناسبت نہیں ہے مگر دین والوں سے اس کی غرض وابستہ ہے، اس لئے ان کا لحاظ کر لیتی ہے۔

اس کے برخلاف اسلام ایک خدا کی بندگی واطاعت کا نظام ہے، یہ نہ دنیا کو اپنی منزل بناتا ہے نہ اسے اپنی راہ قرار دیتا ہے، ہاں اس نظام میں دنیا کو برتا ضرور جاتا ہے، لیکن محض اس لئے کہ اس سے آخرت کا راستہ صحیح ہو، اور اس طور پر برتا جاتا ہے کہ اس سے اللہ کی رضا حاصل ہو، دنیا نہ اس کی راہ ہے نہ نشانِ راہ ہے نہ منزل ہے، دنیا تو فقط ایک گزرگاہ ہے، یا ایک سواری ہے تاکہ اس سے گزر کر اور اس پر سوار ہو کر منزل

تک پہونچا جاسکے، دین اسلام کے نظام میں زندگی ایک سفر ہے، راستہ احکام شرع ہیں، منزل جنت ہے، جو حق تعالیٰ کی رضائے دائمی کی قرارگاہ ہے۔

دین اسلام نے اپنے ماننے والوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے دائرۂ اختیار و عمل میں اپنا مخصوص مزاج اور ماحول بنائے رکھیں اور ماحول میں رہ کر منزل کی جانب سفر جاری رکھیں، اور اگر اس ماحول اور اس سفر میں رکاوٹیں اور دشواریاں آئیں تو اپنی قوت کو، اپنی فکر و نظر کو اور اپنی عقل و تدبیر کو کام میں لاکر دنیادارانہ نظام سے بچتے ہوئے، اس کا منہ موڑتے ہوئے، اس کو ڈھکیلتے ہوئے منزل کی جانب بڑھتے رہیں، بچنے کا طریقہ کیا ہو؟ منہ موڑنے کی تدبیر کیا ہو؟ ڈھکیلنے کی طاقت کیونکر ہو؟ اسلام کی تعلیمات اس باب میں بھی مکمل ہیں، اس کیلئے انھیں سمجھنے اور برتنے کی ضرورت ہوگی۔

ہندوستان جیسا کہ معلوم ہے کہ ایک جمہوری ملک ہے، جسے مذہب اسلام سے کوئی غرض نہیں ہے، اور جب غرض نہیں ہے تو اسے اس کی کوئی ہمدردی بھی نہیں ہے، پس اس سے یہ امید رکھنا فضول اور لایعنی امید ہے، جمہوریت تو ملک کے ہر فرد کو اپنے سانچے میں ڈھال لینے کا اہتمام کرتی ہے، اور مسلمان وہ ہے جسے اپنا اسلامی وجود اور اسلامی تشخص محفوظ رکھنا ہے، اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو اپنی منزل کو وہ ہرگز نہ پاسکے گا، بلکہ اس کا سفر جنت سے جہنم کی جانب مڑ جائے گا، پس اسے ہرگز گوارا نہیں کہ اس کا اسلامی وجود اور دینی تشخص برباد ہوجائے، جبکہ جمہوریت کی ساری دلچسپی یہی ہے کہ ہر شخص اپنا ہر تشخص کھوکر جمہوریت میں ضم ہوجائے...... دنیادارانہ نظام اپنی دنیوی منزل پر پہونچ کر جہنم میں جاگرتا ہے، اور اسلامی نظام کا راستہ جب پورا ہوتا ہے، تو وہ اپنے ماننے والے کو جنت میں پہونچادیتا ہے۔

اس دعویٰ کی دلیل حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: **مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَانَشَاءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُوْماً مَّدْحُوْراً O وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤمِنٌ فَاُوْلٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ**

مَّشْکُوْرًا ○ جو کوئی عاجلہ کو یعنی دنیا کو اپنی مراد و منزل بناتا ہے تو ہم اسے اس دنیا میں جو کچھ چاہتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں دیدیتے ہیں، پھر اس کی آخری منزل ہماری طرف سے جہنم متعین ہے، اس میں وہ ذلیل وخوار ہو کر جا گرے گا، اور جو کوئی آخرت یعنی جنت کو اپنی مراد و منزل بناتا ہے اور اس کے لئے اس کی والی جدوجہد کرتا ہے، اور اس پر وہ دل سے ایمان رکھتا ہے، تو البتہ ایسے لوگوں کی کاوش ومحنت قابل قدر اور بار آور ہے۔

مسلمان اس جمہوری ملک میں رہ کر اپنی منزل تک پہونچنے کی جدوجہد کر رہا ہے، اس جدوجہد کے لئے جس علم اور جس عمل کی ضرورت ہے، اس کا مرکز اسلامی مدرسہ ہے، کیونکہ اس راہ کا علم، اس کے نشانِ راہ کا علم اور اس کی منزل کا علم اور پھر اس کے مطابق چلنے کی سمت، اور اس پر عمل کرنے کا حوصلہ اسی اسلامی مدرسہ سے ملتا ہے، اس لئے جمہوریت کو یہ مدرسہ بہت کھٹکتا ہے، وہ اپنی آنکھ کی اس کھٹک کو نکال دینا چاہتی ہے، لیکن چونکہ مسلمانوں کی تعداد سے اس کی غرض وابستہ ہے، اس کو نظر انداز کر کے جمہوریت کی چول نہیں بیٹھے گی، اس لئے وہ براہ راست ان کے دینی اور بنیادی مرکز سے تعرض نہیں کرسکتی، یہی وجہ ہے کہ وہ اس بنیاد کو کمزور کرنے کی راہیں ہمدردی ودلسوزی کی صورت میں تلاش کرتی ہے۔

اس صورت حال میں مدارس اسلامیہ کے تحفظ وبقاء کی جدوجہد کا ایک طریقہ تو وہ ہے جسے موجودہ دور کی اصطلاح میں ’’جمہوری طریقہ‘‘ کہا جاتا ہے، یعنی جمہوری دستور کا حوالہ دے کر حکومت سے اپنے حقوق کا مطالبہ، الیکشن میں ووٹ کی طاقت کا استعمال وغیرہ۔ یہ طریقہ بظاہر مؤثر اور تقاضائے زمانہ سے ہم آہنگ نظر آتا ہے، لیکن حکومت بھی بہت ذہین ہوتی ہے، اور ساتھ ہی قوت کی مالک ہوتی ہے، وہ ایسی تدبیریں اور سازشیں کرتی ہے کہ اس ’’جمہوری مطالبۂ حقوق‘‘ کی ساری ہوا نکل جاتی ہے، پھر مسئلہ اپنی جگہ پر قائم رہ جاتا ہے بلکہ اور سنگین ہو جاتا ہے۔ پس مدارس کے تحفظ

اور بقاء کے لئے اس کے علاوہ کچھ اور سوچنا چاہئے، اور یہ کچھ اور کوئی دور کی بات نہیں ہے بلکہ وہ اپنے گھر کی اصل دولت ہے اور قرآن وسنت کی رہنمائی میں تحفظ وبقاء کا اصل اور بنیادی ذریعہ ہے، اسے ہم چند نقطوں میں بیان کرسکتے ہیں۔

(۱) پہلی بات یہ ہے اسلام اور اسلامی تعلیم کی مرکزی اساس یعنی قرآن کریم کی حفاظت کی بنیاد خود حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے، اسے تو محفوظ رہنا ہی ہے۔ اب سوال ان لوگوں اور اداروں کی حفاظت کا ہے جو اس سے خود کو وابستہ کئے ہوئے ہیں تو ظاہر ہے کہ اگر ان افراد اور ان اداروں کی وابستگی اسلام اور قرآن کے ساتھ صحیح اور پختہ ہے تو حق تعالیٰ کی طرف سے ان کی حفاظت ہوتی رہے گی ورنہ اگر یہ اپنے کو اس سے کسی بھی درجہ میں علیٰحدہ کرلیں گے تو اسی تناسب سے وہ تحفظ وبقاء کے دائرۂ ضمانت سے باہر نکل آئیں گے، سب سے پہلا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ ان مدارس میں کوئی ایسا طریقۂ کار اختیار نہ کیا جائے جو اسلام کی تعلیم سے دور اور اس کی روح کے منافی ہو۔

(۲) مدارس کی بنیادی چیزیں چار ہیں: تدریس، تعلیم، انتظام اور مالیات! ان چاروں شعبوں سے جو افراد وابستہ ہیں وہ سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور ہر ایک کا دوسرے سے ہمہ وقت سابقہ رہتا ہے، ان کے باہمی تعلقات جس قدر خوشگوار ہوں گے، آپسی اعتماد کا ماحول ہوگا، اور ہر ایک کے حق میں دوسرے کی خیر خواہی ہوگی، مدرسہ کی بنیاد مضبوط ہوگی، اور اس پر حق تعالیٰ کی رحمت برستی رہے گی۔ اس سلسلے میں دو حدیثوں کو طریقۂ کار کی بنیاد بنایا جائے۔ ایک تو یہ کہ **لا یومن أحدکم حتیٰ یحب لأخیه مایحب لنفسه**۔ آدمی جو کچھ اپنے حق میں پسند کرے وہ دوسروں کے حق میں بھی پسند کرے۔ اس کے بغیر ایمان کی تکمیل نہ ہوگی، اس کو اگر اپنے عمل کی اساس بنایا جائے تو بغض وعداوت، حسد اور کینہ، عبث وشکایت کا دروازہ بند ہوجائے گا۔

دوسرے وہ حدیث جس میں رسول اللہ ﷺ نے ہدایت دی ہے: **تؤدون**

الحق الذی علیکم وتسألون اللہ الذی لکم (متفق علیہ) کہ جو تم پر دوسرے کا حق ہے اسے خوش دلی سے ادا کرو، اور جو تمہارا دوسروں پر حق ہے اس کا سوال اللہ سے کرو۔ اس حدیث پر جو عمل کرے گا، وہ مطالبات کی کشمکش سے رہائی پا جائے گا، اور حق تعالیٰ کو جب منظور ہوگا سہولت اور برکت کے ساتھ حاجتیں اور ضروریات پوری ہوتی رہیں گی۔

یہ چاروں شعبے اپنے اپنے دائرۂ کار میں اللہ ورسول کی اطاعت کریں گے، تو کوئی معنی نہیں کہ فوز وفلاح سے ہمکنار نہ ہوں: **وَمَنْ يُطِعِ اللهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِيماً**، جو کوئی اللہ ورسول کی اطاعت کرے گا وہ بڑی کامیابی حاصل کرے گا۔ اور ان شعبوں کی باہمی کشمکش مدارس کو کمزور کر دیتی ہے، اور کمزور کو کوئی بھی بیماری لگ سکتی ہے اور کوئی بھی دشمن حملہ کر کے اسے ہلاکت کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔

(۳) نمود ونمائش اسلام کی نظر میں سخت معیوب چیز ہے، بندے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ اس کے پروردگار کو اس کا عمل، اس کا ارادہ، اس کی نیت معلوم ہے، وہی سب کو محفوظ رکھتے ہیں، اور سب پر بدلہ دینے کا وہی وعدہ کرتے ہیں، پس اہل مدارس کا یہ جذبہ ہرگز نہ ہو کہ ہماری شہرت ہو، نیک نامی ہو، اس کے لئے بڑے پیمانے پر اشتہار بازی نہ ہو، شاندار عمارت نہ بنائی جائے، یہ وہ باتیں جن سے اللہ کی ناراضگی آتی ہے اور فتنے سیلاب کی طرح امنڈ کر آتے ہیں۔

(۴) مدرسہ کے لئے مالیات کی تحصیل میں شریعت کے قوانین وآداب کی خصوصی رعایت رکھی جائے، چندے میں مال صرف وہی لیا جائے جس کے حلال وطیب ہونے کا ظنِ غالب ہو، اور انھیں لوگوں سے لیا جائے جو چندہ دینے کو اپنے لئے سعادت سمجھتے ہوں، مدرسہ پر یا مہتمم پر یا سفیر پر اپنا احسان نہ سمجھتے ہوں، بدنیتی سے مال گندہ ہوجاتا ہے، چندہ لینے میں جبر واصرار بالکل نہ کیا جائے، جتنا خوش دلی سے مل جائے اسے عطیۂ الٰہی سمجھ کر قبول کیا جائے، چندہ دینے والوں کے درپے نہ ہوا جائے، نہ ان

کی خوشامد کی جائے، نہ ان کے غلط کاموں پر سکوت کیا جائے، بلکہ حکمت کے ساتھ ان کی غلطی کی تصحیح کی جائے، چندہ دینے والا بھی مخلوق ہے، اور مال جو چندہ میں دیا جاتا ہے وہ بھی مخلوق ہے، مخلوق کو مقصود بنالینا درست نہیں ہے، مخلوق کو مقصود بنا لینے سے بہت سے گناہوں میں آدمی میں پڑ جاتا ہے، وہ جھوٹ بھی بولتا ہے، ریا کاری بھی کرتا ہے، غلط کو صحیح بھی قرار دیتا ہے، دوسروں کی حق تلفی بھی کرتا ہے اور بداخلاقیوں میں بھی مبتلا ہوتا ہے، غرض ڈھیر سارے معاصی میں ملوث ہوتا ہے، یہ چیزیں اندرونی طور پر مدرسوں کو فتنوں کا نشانہ بنا دیتی ہیں۔

(۵) اسی سے مربوط یہ بات بھی ہے کہ مدارس اسلامیہ کو حکومت کے بورڈ سے متعلق نہ کیا جائے، نہ حکومت سے کوئی مالی مدد لی جائے۔ حکومت تھوڑا سا مال دیتی ہے اور مدرسوں سے دیانت، سچائی، قوتِ عمل اور روحانیت کو چھین کر ضائع کر دیتی ہے، یہ موضوع بہت تفصیل کو چاہتا ہے، میں نے صرف اشارہ کر دیا ہے۔

(۶) اسی کے ساتھ اس کا بھی اہتمام کیا جائے کہ بیرونی ممالک میں مدارس کیلئے چندہ کی جدوجہد نہ کی جائے، اس کی وجہ سے ہمہ گیر کمزوریاں راہ پاتی ہیں، بالخصوص جمہوری حکومت کی نظر میں یہ عمل بدترین کانٹا بنتا ہے، جس سے ملک کی اکثریت مار گزیدہ کی طرح تڑپتی اور تلملاتی ہے اور مدرسوں پر گرم گرم نگاہیں پڑنے لگتی ہیں۔

(۷) اسی طرح مال کے خرچ کرنے میں شرعی دستور کا ہمیشہ لحاظ رکھا جائے، مدرسوں میں دی گئی رقوم امانت ہیں، انھیں صحیح مدوں میں بغیر اسراف کے اور بغیر بخل کے اعتدال کے ساتھ خرچ کیا جائے۔

(۸) اساتذہ بطور بذریعۂ معاش کے نہیں بطور اپنی ذمہ داری کے ادائیگیٔ فریضہ سمجھ کر طلبہ کو تعلیم دیں اور ان کی تربیت کریں، وہ اس ادائیگیٔ فریضہ پر حق تعالیٰ کی رضا کا ہمیشہ اہتمام رکھیں، اگر وہ ایسا کریں گے تو آسمانوں میں اور ملکوت میں ان کا لقب ”عظیم“ ہوگا، اور ان کے لئے دنیا کی ہر مخلوق حتیٰ کہ سمندر کی مچھلیاں تک دعا کریں گی،

پھر سوچنا چاہئے کہ جس جگہ اتنی دعاؤں کے اثرات کا نزول ہوگا اس کے تحفظ کا مسئلہ کیا کچھ زیادہ اہم ہوگا۔

(۹) مدرسہ تعلیم گاہ ہے، یہاں طلبہ اور اساتذہ کو تعلیم وتعلّم میں مشغول رکھا جائے، انھیں غیر متعلق کاموں میں نہ مبتلا کیا جائے جس سے تعلیم میں حرج ہو، **وضع الشئ فی غیر محله** (کسی شے کو بے محل استعمال کرنا) ظلم ہے، اور ظلم موجبِ رحمت نہیں ہوتا، مستحقِ لعنت ہوتا ہے: **أَلَا لَعْنَةُ اللهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ**، اور معلوم ہے کہ ظلم کے ساتھ حکومتیں نہیں چل پاتیں، پھر یہ چھوٹا سا ادارہ جسے مدرسہ کہا جاتا ہے کیونکر محفوظ رہے گا؟

(۱۰) اربابِ مدرسہ کو خواہ ان کا تعلق انتظام سے ہو یا تعلیم سے، بہت با اخلاق ہونا چاہئے۔ اسلام کی خاص تعلیم حسنِ خلق ہے، وہ باہم بھی صاحبِ اخلاق ہوں اور اپنے حلقے سے باہر بھی با اخلاق ہوں، انسانوں کو محبوبیت جس قدر حسنِ اخلاق سے حاصل ہوتی ہے کسی اور عمل سے نہیں حاصل ہوتی، آدمی حسنِ اخلاق سے اللہ اور رسول کا بھی بہت قریبی بنتا ہے، اور جب اللہ اور رسول کا محبوب ہوگا تو مخلوق مجبور ہوگی کہ محبت کرے، پھر کون سی حکومت دشمنی کر کے کامیاب ہوسکتی ہے؟

یہ دس امور اختصار سے عرض کردئے گئے ہیں، عمل کی ضرورت ہے، پھر انشاء اللہ تحفظ کا مسئلہ حل ہے۔ (ماہنامہ ضیاء الاسلام، جولائی ۲۰۱۰ء)

☆☆☆☆☆

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

امام بخاری علیہ الرحمہ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کا ایک ارشاد نقل فرمایا ہے: **لتتبعن سنن من كان قبلكم شبراً بشبرٍ وذراعاً بذراعٍ حتىٰ لو دخلوا جحر ضبٍ تبعتموهم**، (بخاری شریف: **كتاب الاعتصام بالكتاب والسنة**)

تم لوگ اگلے لوگوں کی پیروی بالشت بالشت اور گز گز بھر کروگے، حتیٰ کہ اگر وہ کسی گوہ کی بل میں گھسے ہوں گے تو تم بھی ایسا کروگے۔

اس پر صحابہ نے عرض کیا کہ کیا یہود ونصاریٰ کی پیروی؟ آپ نے فرمایا کہ اور کس کی؟

یہ روایت مسلم شریف میں بھی ہے، اور اسے امام حاکم نے بھی نقل کیا ہے، حاکم کی روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ **حتىٰ لو أن أحدهم جامع إمرأته بالطريق لفعلتموه**، اور یہاں تک کہ اگر ان میں سے کسی نے برسرِراہ اپنی بیوی سے جماع کیا ہوگا، تو تم بھی ایسا کروگے۔ حاکم کی روایت میں **لتتبعن** کے بجائے **لتركبن** ہے، یعنی تم اگلے لوگوں کی راہ پر ضرور سوار ہوگے۔

اس کی تشریح میں علامہ عبدالرؤف المناوی فیض القدیر ج:۵، ص:۲۶۱ میں لکھتے ہیں کہ: بالشت کے برابر اور ہاتھ کے برابر پیروی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس امت کے بہت سے افراد اگلے لوگوں یعنی یہود ونصاریٰ اور آتش پرستوں کی تقلید وپیروی کے بہت زیادہ حریص ہوں گے، اور یہ تقلید واتباع گناہوں اور شریعت کی

خلاف ورزی کے باب میں ہوگی، کفر کے متعلق نہیں۔

حدیث کے یہ الفاظ بظاہر خبر ہیں، لیکن مقصود اس سے اتباع اور تقلید سے ممانعت ہے، درحقیقت اس امت کو حکم دیا گیا ہے وہ یہود و نصاریٰ کی تقلید نہ کریں، نہ دین اسلام کے علاوہ کسی اور طریقے کی طرف التفات کریں، کیونکہ نورِ اسلام کے سامنے تمام انوار ماند پڑ چکے ہیں، اور شریعت اسلامی نے دوسری شریعتوں کو منسوخ کر دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی یہ پیشین گوئی درحقیقت آپ کا معجزہ ہے، چنانچہ یہی ہوا کہ آپ کی امت میں بہتیرے لوگوں نے مجوسیوں کا نقش قدم اختیار کیا، ان کی جیسی شکلیں بنائیں، ان کے لباس اختیار کئے، ان کی جیسی سواریاں پسند کیں، جنگوں وغیرہ میں ان کے مخصوص طریقے اختیار کئے، اور بہتوں نے یہود و نصاریٰ کی تقلید میں مسجدوں کو خوب مزین کیا، قبروں کی تعظیم میں اتنا غلو کیا کہ عوام تو قبروں کے پجاری ہی بن گئے، سنیچر کے دن مریض کی عیادت نہیں کرتے، نوچندی جمعرات کو خوشیاں مناتے ہیں، وغیرہ۔

حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ: ابن بطال نے فرمایا کہ آپ کی امت نئی نئی باتوں اور بدعتوں اور اپنی ذاتی خواہشات و نظریات پر چل پڑے گی، جیسا کہ اگلی امتیں بھی اس حادثہ سے دوچار ہوئی تھیں، اور بہت سی احادیث میں متنبہ کیا گیا ہے کہ دورِ آخر شر ہوگا، اور قیامت اشرار ہی پر قائم ہوگی، اور دین تو بس خاص خاص لوگوں میں باقی رہ جائے گا’’ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ جن باتوں پر رسول اللہ ﷺ نے تنبیہ فرمائی تھی وہ اکثر ظاہر ہو چکی ہیں، اور بقیہ بھی ظاہر ہو کر رہیں گی۔

یہ بات حافظ ابن حجر آج سے ساڑھے پانچ سو برس پہلے کہہ رہے ہیں، آج ہوتے اور ہم مسلمانوں کے احوال دیکھتے تو معلوم نہیں کیا کہتے، اب تو دوڑ لگی ہوئی ہے کہ کون کتنا بڑھ کر یہود و نصاریٰ کا طریقہ اختیار کرتا ہے اور حال یہ ہے کہ علم بھی وہی ہے جو یہود و نصاریٰ کے دربار سے آئے، اسی کو پڑھ کر آدمی تعلیم یافتہ ہوتا ہے، دانشور

ہوتا ہے، روشن خیال ہوتا ہے، محض قرآن وحدیث پڑھا تو کچھ نہیں جب تک وہ علم نہ پڑھے جس پر یہود ونصاریٰ یعنی انگریزوں کی مہر توثیق لگی ہو، اگر ہمارے مدارس میں صرف قرآن وحدیث اور فقہ کی تعلیم ہوتی ہے، تو یہ ان مدارس کا نقص ہے، ان میں انگریزوں کی ہنرمندیاں ضرور شامل نصاب ہونی چاہئیں، ورنہ نصاب بیکار ہے، یہ مدارس آثارِ قدیمہ ہیں، ایسی مرعوبیت ومغلوبیت کہ روشنی صرف وہی ہے جو یورپ سے آئے، تنہا اسلام کی روشنی گھپ اندھیاری ہے، یہ بات عوام کہیں تو کہیں، انھیں تو کچھ معلوم نہیں، یہ بات اب وہ لوگ کہتے ہیں، جو اپنے کو علماء کی صف میں شامل کرتے ہیں، اپنے کو دین کا ترجمان سمجھتے ہیں، خود کو اسلام کا مفکر قرار دیتے ہیں، وہ بھی یہود ونصاریٰ ہی کے دامن میں پناہ لینا چاہتے ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے دنیا کو دین کے لئے برتا تھا، جدید نسل کے بزرگ دین کو دنیا کے لئے برتنا چاہتے ہیں، اور یہ یہودیوں اور عیسائیوں کا طریقہ ہے، یہ لوگ دین کا نام ضرور لیتے ہیں، بلکہ دنیا پر دین کا رنگ وروغن چڑھا کر دنیا کو فریب دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ پرانے طرز کے مدارس کی وجہ سے اب بھی جو بہت سے پختہ دینداروں پر دین کا اثر راسخ ہے، اسے چھڑا کر دنیا کا رنگ چڑھا دیا جائے۔ آج نصاب بدلنے کی اسکیمیں ہیں، اس میں کامیابی مل جائے گی تو تہذیب وتمدن میں خود بخود تبدیلی آجائے گی، آج مولویوں میں جو مسلمانوں کی شکل وصورت پائی جارہی ہے، کل کو صورت نہیں پہچانی جائے گی، نہ داڑھی سے، نہ لباس سے، نہ وضع قطع سے، یہ چیزیں رخصت ہوجائیں گی، تو پھر نمازوں کو کون پوچھے گا، قرآن سے کیا مطلب ہوگا، حدیث کے مطالعہ کی دردسری کون مول لے گا۔

اور یہ آثار ان حلقوں میں نمایاں ہوچکے ہیں اور ہوتے جارہے ہیں جن حلقوں نے دینی تعلیم کے دائرے میں دنیاوی تعلیم کو داخل کررکھا ہے، آنکھیں کھلی ہوں تو سب کچھ نظر آرہا ہے۔

اب محض دین کی تعلیم جو خالص دینی علوم پر مشتمل ہو، اجنبی معلوم ہوتی ہے،

کچھ لوگ اس اجنبیت کو دور کرنے کے لئے دنیاوی علوم کو دنیاوی علوم ہی کی حیثیت میں لانا چاہتے ہیں، تاکہ دین کے حاملین دنیا میں اجنبی نہ رہیں، اور بعض لوگ تو اس سے بڑھ کر یہ ستم کرتے ہیں کہ تحریف کر کے دنیاوی علوم کو دینی علم قرار دیتے ہیں، اور دینی علم کی حیثیت سے دنیاوی علوم کو نصابِ تعلیم میں داخل کر کے دین ہی کی اجنبیت کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

حالانکہ حدیث کے مطابق دورِ آخر میں دین اور دینداروں کو اجنبی ہونا اور رہنا ہی مبارک ہے، چنانچہ مسلم شریف کتاب الایمان میں **باب بیان أن الاسلام بدأ غریباً وسیعود غریباً** کے تحت سیّدنا حضرت ابو ہریرہ ؓ کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد درج کیا گیا ہے کہ **بدأ الاسلام غریباً وسیعود غریباً کما بدأ غریباً فطوبیٰ للغرباء**۔ اسلام اپنی ابتداء میں اجنبی تھا، اور جیسا ابتدا میں تھا بعد میں بھی اجنبی بن جائے گا، پس ان اجنبیوں کے لئے بشارت ہے۔

امام نووی شارح مسلم علیہ الرحمہ نے قاضی عیاض کے حوالے سے لکھا ہے کہ اسلام کا جب آغاز ہوا تھا، تو محض چند افراد اس کے ماننے والے تھے (جو زمانے کے رنگ ڈھنگ سے الگ تھے) پھر اس کے عروج و ترقی کا دور آیا، اور عام طور پر لوگ اسلام کے حلقے میں داخل ہو گئے اور دین اسلام کا غلبہ ہو گیا (اب اس کی اجنبیت جاتی رہی) پھر آہستہ آہستہ اس میں گھٹاؤ آتا رہے گا، یہاں تک کہ دین اپنی پوری شکل وصورت میں کچھ ہی لوگوں میں رہ جائے گا، جیسا کہ پہلے تھا۔ یہ ”**الغرباء**“ کون ہیں؟ خود رسول کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے اس کا مصداق سنئے! یہ روایت مسند احمد، ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے منقول ہے، اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ یہ غرباء کون ہیں؟ آپ نے فرمایا **النزاع من القبائل**، یعنی قبیلے کے وہ افراد جو قبیلے اور خاندان سے الگ ہو کر دور ہو گئے ہوں یعنی انھیں اپنے خاندان اور قبیلے کے طور طریقے سے مناسبت نہیں رہی، اس لئے ان سے

الگ تھلگ اجنبی بن جاتے ہیں، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اجنبی بن کر خاندان سے دور ہوجاتے ہوں۔

آج کے ماحول میں دین اور دین کی تعلیم پر پختگی کے ساتھ عمل کرنے والے، دینی مدارس اور ان کے خالص دینی ماحول، زمانہ کے احوال اور رنگ وروپ سے الگ اجنبی بن چکے ہیں، ان کے لئے یہ اجنبیت ہی بجا ہے، اسی پر وہ بشارت کے مستحق ہورہے ہیں، یہ اجنبیت ختم کردی جائے اور دنیاداروں کے حلقے میں انھیں کے دستور اور طریقے کے مطابق ضم ہوجائیں تو دین کہاں باقی رہا، اس لئے جن کو مدارس اور ان کی خالص دینی تعلیم، ان کے اساتذۂ وطلبہ کی ہیئت اجنبی معلوم ہوتی ہے، تو انھیں اجنبی ہی رہنے دیں، وہ اللہ اور رسول کو محبوب ہیں، چاہے دنیا والوں کو ناپسند ہوں، ان کو دنیا والوں سے کیا لینا دینا ہے۔

☆☆☆☆☆

یہود ونصاریٰ کی نقالی اور ان سے مرعوبیت کا یہ رنگ تو علم کے باب میں ہے، اس میں مزید اور بھی تفصیلات ہیں، لیکن اس کے لئے ہمیں عالم اسلام سعودی عرب، مصر، شام اور خلیجی ممالک اور ان کے تعلق سے امریکہ، یورپ اور اسرائیل کے تعلیمی احوال ونظریات کا جائزہ لینا ہوگا۔ یہ ایک دردناک جائزہ ہوگا، اور بہت تفصیل چاہتا ہے جس کی گنجائش اس مختصر اداریئے میں نہیں ہے، اس لئے ہم نے صرف ہندوستان کے مدارس اسلامی تک محدود رہ کر گفتگو کی ہے، علم اور تعلیم میں تو آپ یہود ونصاریٰ کی نقالی ملاحظہ فرما چکے۔ اب عمل اور کردار کی طرف آیئے، تو یہاں معاملہ اور بھی بڑھا ہوا ہے، ہمارے معاشرے کا بڑا حصہ عملاً یہود ونصاریٰ اور مجوس کے رنگ میں رنگین ہوچکا ہے، نہ اسلامی شکل وصورت، نہ اسلامی وضع قطع، نہ اسلامی کردار وعمل، ہر عمل کی سند یورپ میں، امریکہ میں، چہروں پر داڑھی نہیں، کیونکہ نصاریٰ داڑھی منڈاتے ہیں، اسلامی تہذیب میں لباس کی جو وضع ہے کہ چھپائے جانے والا حصہ خوب چھپا رہے اس

کی وضع ظاہر نہ ہو، وہ ختم، ایسا چست اور اتنا چھوٹا لباس کہ ہر عضو کی ساخت نمایاں رہے، کیونکہ انگریزوں کی تہذیب میں اسی کا چلن ہے، مکانوں کی تعمیر کا وہی انداز جو یہود ونصاریٰ کے یہاں رائج ہے، جس میں کسی کا کسی سے پردہ نہ ہو، خاندانی نظام اسی طرز کا جو یورپ کے عیسائیوں اور امریکہ کے یہودیوں سے درآمد کیا گیا ہے، ذرائع آمدنی اور کسب معاش کے وہی طریقے جن پر سودخوار قومیں کاربند ہیں، غرض اسلام کا نام لیا تو جاتا ہے، مگر اس لئے کہ اسے یہود ونصاریٰ کی تہذیب کے حق میں گواہ بنا کر لایا جائے۔ جن لوگوں نے انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی ہے، اور وہاں کے تربیت یافتہ ہیں ان کی غالب اکثریت تو اسی مذکورہ بالا رنگ میں ہے، بعض لوگ بڑھاپے میں کسی بزرگ اور اللہ والے کی صحبت میں کچھ اپنے اندر دینی رنگ کی تبدیلی کر بھی لیتے ہیں، تو زیادہ تر اپنی ذات تک محدود رہ کر! یہ دینی رنگ ان کی اولاد اور خاندان تک نہیں آنے پاتا۔

خیر یہ حضرات تو انگریزی تہذیب کے گھروندوں میں پلے بڑھے ہیں، ان سے اس کے علاوہ کیا امید رکھی جاسکتی ہے، شکایت تو ان حضرات سے ہے جنھوں نے خالص دینی اداروں میں تعلیم پائی ہے، تربیت حاصل کی ہے، جنھیں اس دورِ آخر میں اجنبی بن کر رہنا چاہئے تھا، یہ حضرات بھی انگریزی تہذیب کی نقالی میں انھیں کے طریقے اپنائے جارہے ہیں اور خوش ہیں کہ ہم کام کررہے ہیں، کارنامے انجام دے رہے ہیں، حالانکہ معاملہ برعکس ہے، کیونکہ یہود ونصاریٰ کا طریقہ اختیار کرنا خواہ وہ بظاہر کتنا ہی خوبصورت نظر آئے محمود نہیں ہے، ہمارے یہاں وہی چیزیں لائق تقلید ہیں جن سے ہم پہلے سے دین کے اندر واقف ہیں، چاہے وہ دوسروں کے نزدیک اجنبی ہوں، اور جو طریقے دین کے اندر نئے اختیار کئے جاتے ہیں وہ یہود ونصاریٰ کے یہاں چاہے جتنے معروف ہوں، ہم انھیں منکر سمجھیں گے۔

کوئی نیا طریقہ ہو، خواہ دین میں یا دنیا میں، اسے شریعت کی معروف تعلیمات

پر پرکھا جائے گا، اگر شرعی اصولوں سے کوئی دنیاوی معاملہ ٹکرائے گا، تو اسے یا تو ترک کرنا ضروری ہوگا، یا اس کی اصلاح کی جائے گی، اور اگر دینی معاملہ ہوگا تو صرف اس کے مصالح اور فوائد پر نظر نہیں کی جائے گی، بلکہ دیکھا جائے گا کہ سلف میں یہ طریقہ تھا یا نہیں؟ اسلامی مزاج سے اسے مناسبت ہے یا نہیں؟ پھر یہ کہ وہ نیا طریقہ کہاں سے درآمد کیا گیا ہے؟ اگر سلف میں باوجود ضرورت اور امکان کے اسے اختیار نہیں کیا گیا، یا اسلامی مزاج سے اسے مناسبت نہیں، یا وہ نیا طریقہ یہود و نصاریٰ اور غیر مسلموں سے درآمد کیا گیا ہے، تو وہ ہرگز قابل قبول نہ ہوگا۔

حضرت عبادہ بن صامت ﵁، امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان ﵁ کو ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ کا ارشاد سنا رہے تھے کہ میں نے اللہ کے رسول ابوالقاسم حضرت محمد ﷺ سے سنا ہے، آپ فرما رہے تھے کہ میرے بعد کچھ لوگ تمہارے معاملات کے ذمہ دار ایسے ہوں گے، جو تم کو وہ چیزیں بتائیں گے جو تم نہیں جانتے، اور جن باتوں کو تم جانتے ہو، انھیں وہ نہ جانیں گے اور انکار کریں گے، تو جو کوئی اللہ کی نافرمانی کرے، اس کی اطاعت نہیں ہے، اس لئے اپنے رب کے ساتھ حیلہ سازی مت کرو۔ (مسند احمد، ج:۵، ص:۳۲۵)

مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں منکر ہیں، انھیں اگر کوئی صاحب اختیار شخص بھی مسلط کرنا چاہے تو کوئی حیلہ بہانہ کر کے اسے قبول کر لینا درست نہیں ہے، ایسے منکر اور غلط امور میں کسی بھی مخلوق کی پیروی نہیں کی جائے گی۔

ایک طرف ہم اپنے ہادی و رہبر، اللہ کے آخری پیغمبر ﷺ کے یہ ارشادات پڑھتے ہیں، اور اس کی روشنی میں اسلاف کرام کے تعامل کو دیکھتے ہیں کہ وہ کسی بھی نئی چیز اور نئے طریقۂ کار کا احتساب کر کے شریعت کے دائرے میں رد و قبول کرتے تھے، پھر اپنے زمانے میں عوام کو نہیں خواص کو، عامیوں کو نہیں عالموں کو، کالجوں اور یونیورسٹیوں کو نہیں دینی مدارس کو دیکھتے ہیں کہ اپنے حلقوں میں یعنی دینی حلقوں میں وہ

طریقۂ کار بے تکلف اختیار کرتے ہیں جو یورپ سے یہود و نصاریٰ کی تقلید و پیروی میں درآمد کیا ہوا ہے، ہماری معروف چیز درس و تدریس کے حلقے ہیں اساتذہ وطلبہ کی باوقار مجلسیں ہیں، وعظ وارشاد کے مجامع ہیں، بزرگوں کی صحبتیں ہیں، مشائخ کی خانقاہیں ہیں، ذکر کے حلقے ہیں، علمی مجالس ہیں، افادہ اور استفادہ کے لئے درسگاہیں ہیں۔ طالب علم اپنے استاذ کی خدمت میں اور مرید اپنے شیخ کی صحبت میں عرصۂ دراز تک کسب فیض کرتا ہے، علمی اور دینی مزاج بناتا ہے، پھر اس سے استفادے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

اب لوگوں نے رنگ بدلے۔ پرانی باتیں قدامت کے الزام میں قابل ترک ہوگئیں، اب جو تحفے یورپ سے آئے، ان میں کانفرنسیں، سیمینار، سمپوزیم، توسیعی خطبات، لکچرز، استاذ زائر (وزیٹنگ پروفیسر) اور اللہ جانے کیا کیا طریقے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ہمارے بعض بزرگوں نے فقہی موضوعات پر سیمینار شروع کئے، تو یہ لفظ نامانوس ہونے کے باوجود قدرے مانوس ہوا، لیکن بار بار کے سمیناروں سے تجربہ ہوا کہ یہ فقہی اور دینی مزاج کے خلاف ہے، کسی فقہی موضوع پر سوالات وضع کئے جاتے ہیں، اور کچے پکے لوگوں سے ان کے جواب طلب کئے جاتے ہیں، لوگ اپنے اپنے خیالات کا مجموعہ تیار کر کے جواب کے نام پر بھیج دیتے ہیں، پھر وہ لوگ سیمینار کی تہذیب ولوازم کے ساتھ اکٹھا ہوتے ہیں، بیٹھتے ہیں، جہاں اور جس طریقے سے بیٹھتے ہیں، وہ مجلس علماء سے زیادہ اسمبلی یا پارلیمنٹ کا ہاؤس معلوم ہوتا ہے، کچھ مباحثے ہوتے ہیں، کچھ مناقشے ہوتے ہیں، پھر کمیٹیاں بنتی ہیں، پھر تجویزیں لکھی جاتی ہیں، کچھ پر اتفاق رائے ہوتا ہے، زیادہ تر اختلافی تجویزیں ہوتی ہیں، ان کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ علمی مسائل ومعاملات جو علماء کے درمیان رہ کر متوازن ہوتے ہیں، عوام انھیں اپنے نزدیک قابل اعتماد علماء سے فتویٰ لے کر حاصل کرتے ہیں، اور ان پر عمل درآمد کرتے ہیں، اب یہ مختلف المزاج علماء کے مباحث وخیالات، اہل علم کے حلقہ سے عوام الناس

اوراخبارات کے عوامی اور طوفانی ماحول میں آجاتے ہیں، اور رنگ کچھ کا کچھ ہوجاتا ہے، خاص اہل علم کے مسائل ومباحث عوام کے درمیان اوراخبارات کے صفحات پر آکر کچھ سے کچھ ہوجاتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ سیمیناروں کو خواہ جتنے خوبصورت انداز میں پیش کیا جائے، لیکن ہے یہ **لتتبعن سنن من کان قبلکم** کا مظہر!

اس طریقے کے جلسے اور مجمعے اب سے پہلے مدارس دینیہ اور علماء کے حلقوں میں متعارف نہ تھے، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رہے ہوں تو رہے ہوں، مگر اب وباء کی طرح سیمیناروں کا سیلاب علماء کے دائروں اور مدارس کے حصار میں گھسا جارہا ہے، اوراس پر حال یہ ہے

ہر کہ آمد عمارت نوساخت

سیمینار خاص خاص موضوعات پر ہوتے ہیں، یہ عوامی چیز نہیں ہے، لیکن اربابِ مدارس نے اسے ایک عوامی مجمع بنادیا ہے، بڑے بڑے اشتہارات چھپنے لگے ہیں، ممبرانِ استقبالیہ، ارکانِ استقبالیہ اور نہ جانے کن کن عنوانات سے درجنوں نام چھاپے جاتے ہیں، سڑکوں پر بڑے بڑے مصنوعی گیٹ بنائے گئے، لمبے لمبے اخراجات کی تفصیل شائع کی گئی، پنڈال کو سجانے کا مسرفانہ اہتمام کیا گیا۔ کیا شریعت میں اس اسرافِ بے جا کی گنجائش ہے؟ اسلام میں جو سادگی ہے، وہ کہاں گئی؟ پھر مزید یہ کہ ان پروگراموں کی بسا اوقات تصویر سازی ہوتی ہے جو حکم شریعت کے قطعاً منافی ہے۔

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے

یہود ونصاریٰ کی نقالی نے عام مسلمانوں کو تو جہاں پہونچایا تھا، پہونچایا، علماء اس پر روک لگاتے، اس کی قباحت وشناعت بیان کرتے، اللہ ورسول کی تعلیمات کو عملاً اور علماً پھیلاتے، مگر یہ کیا ہوا کہ روک لگا سکنے والے خود نقالی کی رَو میں بہنے لگ گئے، سیمیناروں کی کثرت کو دیکھ کر یہ احساس ہونے لگا کہ شاید مدرسوں کا قبلہ ہی بدل جائے گا، دیکھ دیکھ کر ہر ایک کو شوق چرّانے لگتا ہے۔

اور یہ تو مشاہدہ ہے کہ ان تقریبات کی تیاریوں میں تعلیم کا سخت نقصان ہوتا ہے، لیکن جیسے یہ طے ہو چکا ہے کہ تعلیم کا خواہ کتنا ہی کباڑہ ہو، یہ نقالیاں ضرور جاری رہیں۔ مختلف عنوانوں سے دینی مدارس کی تعلیم، ان کی افادیت مجروح کرنے کا جیسے کوئی منظّم منصوبہ چل رہا ہو، مختلف قسم کے مسابقات، الگ الگ ناموں سے جلسے اور اجتماعات، مدارس سے فارغ ہونے والے طلبہ کو متعدد حسین وجمیل ناموں اور پروگراموں کے ذریعے ایسی ترغیبات کہ علمی استعداد کو تو کوئی خاص نفع نہ ہو، لیکن زندگی کا معیار بلند کرنے کی ہوس بڑھ جائے، پھر وہ تنگی ترشی برداشت کرکے دینی خدمت انجام دینے کے اہل نہ رہ جائیں۔

مدارس کے کرنے کا کام یہ ہے کہ جو طلبہ انھیں اللہ کی طرف سے مل جارہے ہیں، ان کی علمی استعداد پختہ کریں، اساتذہ ان پر محنت کریں، ان کی صحیح تربیت کریں، زہد وقناعت، توکل وعزیمت، حق تعالیٰ کی رضاجوئی کا جذبہ پیدا کریں، دنیوی مال ومتاع کو موضوعِ زندگی بنانے سے انھیں دور رکھیں۔ شہرت وریاکاری اور نام ونمود کی ہوس سے ان کے قلوب کو پاک رکھنے کی کوشش کریں۔ اس کے لئے بڑی یکسوئی کی ضرورت ہے، اور اگر یہ طلبہ اور یہ اساتذہ انھیں وقتی اور ہنگامی تقریبات میں مبتلا رہیں گے، آج فلاں مدرسے میں سیمینار ہے، کل فلاں مدرسے میں جلسہ ہے، پرسوں فلاں مدرسے میں کانفرنس ہے، اور ہر جگہ آنے کی، کھانے کی دعوت ہے، بہترین انتظامات ہیں، تو ان مدرسوں اور ان طلبہ واساتذہ کا اللہ ہی حافظ ہے۔

یہود ونصاریٰ کی تقلید کس حد تک مذموم ہے؟ اور اس کی قباحت کس درجہ ہے؟ اس کا اندازہ ایک حدیث سے ہوتا ہے، جس کو حافظ ابن حجر نے فتح الباری ''کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ'' میں حدیث لتتبعن سنن من کان قبلکم، کی شرح کے ذیل میں نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضرت انس ؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کب ترک کیا جاسکتا ہے؟ آپ

نے فرمایا: **إذا ظهر فيكم ماظهر في بني اسرائيل إذا ظهر الادهان في خياركم والفحش في شراركم والملك في صغاركم والفقه في رذالكم** ، جب تم میں وہ حالات ظاہر ہو جائیں، جو بنی اسرائیل میں ظاہر ہوئے تھے، جب اچھے لوگوں میں مداہنت ظاہر ہو، اور برے لوگوں میں بے حیائی، اور چھوٹوں میں حکومت اور کم ظرفوں میں فقہ ظاہر ہو۔ (تب امر بالمعروف چھوڑا جاسکتا ہے، اور نہی عن المنکر بھی)

اس حدیث میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل میں جن خاص برائیوں کا ظہور عام ہو گیا تھا، وہ یہ ہیں، کہ اچھے اور نیک لوگ مداہنت برتنے لگیں۔ یعنی بری چیزوں کو دیکھیں تو نہ صرف چشم پوشی کریں، بلکہ باتوں کی صنعت اور بناوٹ سے اور برتاؤ کے طرز سے گویا ان کی حوصلہ افزائی کرنے کا رُجحان ہو جائے، اور جو برے ہیں وہ عام برائیوں سے آگے بڑھ کر بے حیائی اور فحاشی میں جا پڑیں، اور حکومت کی باگ ڈور ایسے معمولی اور ناکارہ لوگوں کے ہاتھ میں آجائے، جو منصب حکومت کی عصمت وآبرو کو مجروح کردیں، اور دینی علوم ایسے کم ظرفوں کے حصے میں آجائے، جو نہ دین کی قدر جانیں اور نہ علم کی، ان کے لئے دین اور علم ایک دنیوی کاروبار بن کر رہ جائے۔ جب یہ صورت حال ہو، تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک کرنے میں آدمی معذور ہے۔

صاحب فتح الباری نے ایک اور حدیث نقل کی ہے، اور یہ روایت امیر المومنین حضرت عمر فاروق ؓ سے ہے، کہ دین کی خرابی اس وقت ہوگی جب علم چھوٹوں کی جانب سے آئے، تو بڑے لوگ اسے تسلیم کرنے سے انکار کریں گے، اور لوگوں کی بھلائی اس وقت ہے جب علم بڑوں کی طرف سے آئے، اور چھوٹے اس کی پیروی کریں۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ مشہور امام لغت ابوعبید نے فرمایا کہ چھوٹے ہونے سے مراد مرتبے کا چھوٹا ہونا ہے، عمر کا نہیں، مطلب ہے کہ علم اور دین کی عظمت وبلندی سے جن لوگوں کی طبیعتوں کی پستی میل نہیں کھاتی، اور وہ خود علم کی وجہ سے بلند ہونے کی

صلاحیت نہیں رکھتے، علم ہی کو نیچے اتار دیتے ہیں۔ یہ چھوٹی طبیعت اور مرتبہ کے لوگ جب علم کی باتیں کریں گے، اور اسے نیچے اتار کر کریں گے، تو بڑے لوگ اسے قبول نہ کریں گے، اور اس میں کشمکش کی صورت پیدا ہوگی۔

آج حقیقت یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ سے درآمد کئے ہوئے سیمیناروں سے بنی اسرائیل کی یہ خرابی خوب پھل پھول رہی ہے، اچھے لوگ مداہنت کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں، ان سیمیناروں میں جو موضوعات چھیڑے جاتے ہیں، اور جس جس طرح اظہارِ خیال ہوتا ہے وہ تو بجائے خود ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ اس کے علاوہ بے تحاشا اسراف، تصویر سازی، ویڈیو گرافی، نام و نمود کی شورشیں اور اللہ جانے کتنے کتنے منکرات ظاہر ہوتے رہتے ہیں، لیکن یہ اچھے حضرات منکرات کی ان تجارت گاہوں سے نہ احتراز کرتے، اور نہ وہاں رہ کر مؤثر طریقے پر ٹوکتے۔ اور بروں کی بے حیائی کا اس دور میں جو عالم ہو گیا ہے، وہ تو ایک طویل داستانِ درد ہے کہ قلم کا جگر اس کے تذکرے سے شق ہوتا ہے۔ انتظام کی اور حکومت کی باگ ڈور جن ہاتھوں میں ہے ان کی کمینگی اور پستی کا یہ عالم ہے کہ سوائے دولت بٹورنے اور اپنے خویش و اقارب اور اپنی قوم کی جائز و ناجائز ترقی و عروج کے ان کا اور کوئی مقصد ہی نہیں معلوم ہوتا۔ اور علم دین کی نسبت سے جو لوگ منسوب ہیں، وہ بھی دنیا و دولت اور شہرت و نمود، نیز خود غرضی و ریاکاری کی دوڑ میں کسی دنیادار سے پیچھے نہیں رہ جانا چاہتے **الا ماشاء اللہ**۔ پس اللہ ہی سے مدد کی طلبگاری ہے۔

یہ باتیں تلخ ضرور معلوم ہوں گی، مگر ان تقریبات کا ضرر کھلی آنکھوں دکھائی دے رہا ہے، اس لئے عرض کر دیا۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

☆☆☆☆☆

وفاداری بشرطِ اُستواری اصل ایمان!

نحمدالله ونصلی علیٰ رسوله الکریم وعلیٰ آله وأصحابه الذین هم نصروا الدین القویم، أما بعد!

ایک بات ذہن میں عرصہ سے گردش کر رہی تھی، اسے سوچتا رہتا تھا، اس کے مالہ وماعلیہ پر غور وتدبر کرتا تھا، اس کی اہمیت کا وزن دل میں محسوس کرتا تھا، اس کے کچھ کچھ اجزا کبھی کبھی دل سے زبان پر آتے تھے، مگر مجموعی اعتبار سے موضوعِ سخن بن کر وہ بات کبھی شرمندۂ تکلم یا سپردِ قلم نہ ہوسکی۔ متعدد بار سوچا مگر گفتگو کا رُخ کسی اور طرف مڑا، اور بات دوسری طرف چلی گئی۔ ۱۵؍ربیع الآخر ۱۴۲۸ھ کو دس بجے دن میں مدرسہ کے طالب علموں سے خطاب کرنا تھا، طبیعت میری خراب تھی، کئی ماہ سے یکے بعد دیگرے پھوڑے نکل رہے تھے، ایک اچھا ہوتا تو دوسرا نکل آتا۔ ایک روز پہلے ایک پھوڑا تکلیف دے رہا تھا، ڈاکٹر کے یہاں سے دوا منگوائی، تو اس نے ایسی دوا دیدی جس میں نیند کا اثر تھا، ایسی دوائیں جن میں نیند کا اثر ہو، مجھ پر قیامت کا ستم ڈھاتی ہیں۔ نیند کی زیادتی کا تو یونہی مریض ہوں، اور اس قسم کی خواب آور دوائیں میرے پورے جسم میں نیند بن کر دوڑتی ہیں اور رویں رویں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ کل وہ دوا میں نے کھائی، اور آج تک مدہوشی کی کیفیت میں ہوں، دس بجے سے کچھ پہلے اسی مدہوشی میں سوگیا، ٹھیک دس بجے آنکھ کھلی، اور میں طلبہ کے مجمع کی جانب یہ سوچتا ہوا چلا کہ آج ان سے کیا کہوں، معاً ذہن میں قرآن کریم کی یہ آیت گونجی: لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ، اور پھر اسی کے ساتھ غالب مرحوم کا یہ شعر ذہن کے افق پر چمکنے لگا — ؎

وفاداری بشرطِ اُستواری، اصل ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

پھر میں یہی سوچتا ہوا طلبہ کے مجمع میں پہونچ گیا، میں نے طلبہ سے کہا کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: لَنْ تَنالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ، اس آیت کریمہ میں حق تعالیٰ نے **البر** کا کلمہ استعمال فرمایا ہے، **البر** کا ترجمہ تم لوگ نیکی اور بھلائی کرتے ہو، لیکن یہ اس کا التزامی معنی ہے، تم جانتے ہو کہ لفظ تین طرح کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ایک وہ معنی جس کے لئے وہ لفظ وضع کیا گیا ہے، بنایا گیا ہے، یہ معنی مطابقی کہلاتا ہے، دوسرے کبھی لفظ بولتے ہیں اور اس کا اطلاق اس کے معنی کے جز پر ہوتا ہے، اسے معنی تضمنی کہتے ہیں، تیسرے یہ کہ لفظ کا اطلاق نہ معنی موضوع لہٗ پر ہو، نہ اس کے جز پر، بلکہ اس کے کسی لازمی معنی پر ہو، اسے معنی التزامی کہتے ہیں۔

مثلاً تم نے کہا کہ میں نے ’’گھڑی‘‘ خریدی، تو اس لفظ سے اس کا وہ معنی مراد ہے، جس کے لئے لفظ ’’گھڑی‘‘ کی وضع ہوئی ہے، اور فرض کرو اس کی سوئی ٹوٹ گئی ہے، تب بھی تم کہتے ہو کہ گھڑی بگڑ گئی ہے، یہاں دیکھو گھڑی اپنے پورے معنی کے لحاظ سے نہیں بگڑی ہے، صرف اس کی سوئی خراب ہوئی ہے، جو گھڑی کا ایک جز ہے، لیکن کہا کہ گھڑی بگڑ گئی ہے، تو یہاں گھڑی کا اطلاق اس کے ایک جز پر ہوا ہے۔ کبھی تم کہتے ہو کہ وقت دیکھو، اور اس کا معنیٰ ہوتا ہے کہ گھڑی دیکھو، ظاہر ہے کہ وقت کا معنی وہ گھڑی نہیں ہے، جو خریدی گئی ہے اور جس کا ایک جز سوئی ہے، پس یہاں وقت کا نہ معنی مُطابقی مراد ہے اور نہ تضمنی، بلکہ وقت معلوم کرنے کے لئے چونکہ گھڑی دیکھنا لازم ہے اس لئے یہی التزامی معنی مراد ہے۔

اسی طرح سمجھو کہ **البر** کا ایک وہ معنی ہے جس کے لئے یہ لفظ وضع کیا گیا ہے اسے سمجھو۔ عبارت کے سمجھنے میں یہ ایک خاص گُر ہے کہ لفظ کا معنیٔ مُطابقی معلوم رہے، پھر اسی سے اس کا استعمال اس کے اجزاء ولوازم اور متعلقات کی طرف پھیلتا رہتا ہے،

مگر اصل کلید وہی معنیٔ مطابقی ہے، جب یہ کلید ہاتھ آگئی تو باقی اس کے استعمالات اور معانی کا سمجھنا سہل ہوجاتا ہے۔

البر کا معنیٔ مطابقی کیا ہے؟ قرآن میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے، اگر ان سب پر اور ان کے معانی کے قدرِ مشترک پر غور کیا جائے تو اس کا معنیٔ مطابقی ہاتھ آجائے گا۔ کبھی یہ لفظ اللہ تبارک تعالیٰ کے لئے استعمال ہوا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: **إنه هو البر الرحيم** ، کبھی بندے کے لئے استعمال ہوا ہے، چنانچہ فرمایا: **براً بوالديه** اور **براً بوالدتی** ، اور فرمایا **إن الابرار لفی نعیم** ، تو کبھی فرشتوں کے لئے فرمایا: **كرامٍ بررة** ، عمل کے متعلق ارشاد ہے: **لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ** الخ ، ان آیات پر اور ان کے معانی و مشمولات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ **البر** کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کا حق پورا کیا جائے ، اور اس میں کوئی کوتاہی نہ کی جائے ، خواہ وہ خدا کا حق ہو، ماں باپ کا حق ہو، یا خلق خدا کا حق ہو، اس کے علاوہ ان حقوق کا ادا کرنا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے جو عہد و معاہدے ، قول وقرار ، قسم وحلف اور دوسرے معاملات سے پیدا ہوئے ہیں، پھر التزاماً اس کے دائرے میں وہ تمام نیکیاں اور بھلائیاں جمع ہوجاتی ہیں، جو عدل یا احسان کے تحت آسکتی ہیں، **بَرٌّ** اور **بَارٌّ** اسی سے بنے ہوئے صفت کے صیغے ہیں، **برا بوالديه** اس سعادت مند بیٹے کو کہیں گے، جو اپنے ماں باپ کا فرمانبردار اور ان کے حقوق پورے پورے ادا کرنے والا ہو، **بر في يمينه** کے معنی اس نے اپنی قسم پوری کردی، اللہ تعالیٰ کے لئے **بر** کی صفت استعمال ہوئی ہے، اس لئے کہ اللہ نے بندوں کے جو حقوق اپنے ذمے لئے ہیں یا ان سے وعدے کئے ہیں، وہ ان کو ایک ایک کرکے دنیا و آخرت میں پورا کریں گے، اس تفصیل سے واضح ہوا کہ حقوق وواجبات ہوں یا نیکیاں اور بھلائیاں سب اس کے وسیع دائرے میں شامل ہیں۔

اس لئے اس لفظ کے ترجمے میں اردو کا ایسا لفظ چاہئے، جو اس کے مشمولات

اوراس کے وسیع دائرے کواپنے دامن میں سمیٹ لے۔ اس کے لئے اردو کا ایک لفظ ’’وفاداری‘‘ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، اس کا بھی ایک وسیع مفہوم ہے، جو’’بـــر‘‘ کے مفہوم اوراس کے تمام متعلقات کواپنے احاطہ میں لے لیتا ہے۔

وفاداری، انسانیت کی عظیم ترین خوبی ہے، وفاداری میں جو جتنا کامل ہوگا اتنا ہی وہ بلند انسان ہوگا، مقصد بلند ہواور آدمی اس مقصد بلند کا وفادار ہو، یہ کمال کا فردِ اعلیٰ ہے، اللہ کا وفادار ہو، رسول کا وفادار ہو، یہ انسانیت اور ایمان کی معراج ہے، آدمی نے کسی سے کوئی وعدہ کیا، کسی سے قول وقرار کیا، اس میں پکا ثابت ہوا، اس میں وفاداری کا نقش جمایا، یہ آدمیت اور اخلاق کی بلند ترین منزل ہے، یہ تو بڑی چیزیں ہیں، آدمی تو کسی گھٹیا مقصد کا عہد کرتا ہے اوراس کی پاسداری اور وفاداری میں جان دیتا ہے، تو بطور عبرت کے وہ بھی تعریف کا مستحق ہوتا ہے، اوراسے لوگ اس کی بلندی میں شمار کرتے ہیں، مرزا غالب دیکھو کیا کیا کہتے ہیں،

وفاداری بشرطِ اُستواری، اصل ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

وفاداری، پختگی کے ساتھ ہو، اس میں کوئی تزلزل نہ ہو، اس کے خلاف کا وسوسہ نہ ہو، وفاداری پر جما تو جما، اس سے ذرا بھی انحراف نہ کیا تو سمجھو کہ ایمان کی اصل اسے حاصل ہے، اصل ایمان یہی ہے کہ وہ پختہ وفادار ہو، دیکھو برہمن نے بت پرستی کا عہد باندھا ہے، تو اگر چہ یہ کفر ہے لیکن اس نے کفر کے ساتھ اتنی وفاداری کی، کہ بت خانے میں بتوں کے قدموں پر جان دیدی، تو اب یہ اس کا مستحق ہے کہ دنیا کی مقدس ترین جگہ، جو مرکز ایمان ہے یعنی خانۂ کعبہ، اسے وہاں دفن کیا جائے، کیونکہ اس نے اصل ایمان کو نباہ دیا ہے۔

مرزا غالب نے وفاداری کی عظمت واہمیت کو کتنے اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے، یہ سمجھانے کا ایک بلیغ انداز ہے، اور ایک عجیب وغریب تعبیر ہے۔ واقعہ یہی

ہے کہ وفاداری اللہ کو پسند ہے، رسول کو پسند ہے، دیکھو رسول اکرم ﷺ کے جد امجد حضرت اسماعیل علیہ السلام کا تذکرہ حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے، اور کتنی محبت اور پیار سے کیا ہے، فرمایا: **وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ إِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا** (سورہ مریم:) کتاب میں تم اسماعیل کا تذکرہ کرو، وہ وعدے کے سچے تھے اور رسول نبی تھے، اور اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے، اور وہ اپنے مالک کے پسندیدہ اور پیارے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی چار صفتیں بیان فرمائیں۔ (۱) وعدے کے سچے تھے، (۲) رسول تھے، (۳) نبی تھے، (۴) اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے، پھر ان کا مقام و مرتبہ بیان فرمایا کہ وہ حق تعالیٰ کے پسندیدہ اور مانے جانے بندے تھے۔

مشہور بزرگ حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی علیہ الرحمہ بڑے صاحب ذوق و وجد اور بڑے صاحب محبت و درد بزرگ تھے، ایک مرتبہ انھوں نے اپنی مجلس میں جہاں علماء بکثرت موجود تھے، دریافت فرمایا کہ **وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا** کا کیا مطلب ہے؟ لوگوں نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اردو کے الفاظ میں اس کا ترجمہ کیا، مولانا چاہ رہے تھے کہ زبانِ محبت میں ترجمہ ہو، فرمایا اس کا ترجمہ سنو، اور ''تھا وہ اپنے رب کا پیارا'' یہ فرما کر چیخ ماری، اور آپ پر گویا کیفیت مدہوشی کی طاری ہوئی، اس کے واقعے کے بعد دو مہینے سخت علیل رہے۔ (تذکرہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی)

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پیارے اور پسندیدہ ہونے کی وجوہ میں، پہلی وجہ صادق الوعد یعنی وعدے کا سچا ہونا اور وفادار ہونا بیان کیا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتنی اہم چیز ہے۔ رسول اور نبی ہونا، انسانیت کا سب سے اہم ترین منصب ہے، لیکن وہ ایک اجتبائی اور غیر اختیاری عہدہ ہے، اس کا ذکر بعد میں اور وعدے کے وفا کرنے کا ذکر پہلے آیا ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ حضرت سفیان ثوری علیہ الرحمہ

نے فرمایا، کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ایک شخص سے وعدہ کیا تھا کہ میں اسی جگہ رہوں گا تم جا کر واپس یہیں آؤ، وہ گیا اور بھول گیا، سال بھر کے بعد وہ شخص آیا، حضرت اسماعیل علیہ السلام سال بھر وہیں اس کا انتظار کرتے رہے، کہتے ہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے وہاں ایک مکان بنالیا تھا، وہاں سے ہٹے نہیں۔ خود غرض دنیا تو اسے بیوقوفی کہے گی کہ اس قدر انتظار کا کیا کام تھا، مگر اللہ تعالیٰ اس ایفاء عہد کی تعریف فرما رہے ہیں، سال بھر وعدہ کی بنا پر انتظار کی سختیاں جھیلتے رہے، اس کی وجہ سے وہ حق تعالیٰ کے پسندیدہ قرار دئے گئے۔ وعدہ کا وفا کرنا واقعی اخلاقِ انسانی کی معراج ہے۔

خود رسول اللہ ﷺ وعدہ کی وفاداری میں معروف تھے، علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ایک صحابی سے نقل کیا ہے کہ میں نے آغازِ نبوت سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خرید کا ایک معاملہ کیا تھا، میرے ذمہ کچھ بقایا رہ گیا تھا، میں نے عرض کیا آپ یہیں رہئے، میں آتا ہوں، وہ کہتے ہیں کہ میں وہاں سے آیا، تو بھول گیا اور تیسرے دن پہونچا، تو آپ تشریف فرما تھے، آپ نے فرمایا کہ جوان! تو نے مجھے مشقت میں ڈال دیا، میں تین دن سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ (سورہ مریم:۵۴،۵۵)

وعدے کا پورا کرنا، صرف انسانیت کی بات نہیں ہے، یہ ایمان اور دین کی بات ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **لا دين لمن لا عهد له**، جس کو عہد کی پاسداری نہیں اس کے پاس دین نہیں۔ اور آپ نے فرمایا: **آية المنافق ثلٰثة: إذا حدث كذب وإذا وعد أخلف وإذا أوتمن خان**، منافق کی تین علامتیں ہیں، جب بات کہے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے، اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ سوچ لو منافق ہونا کھلم کھلا کافر ہونے سے بدتر ہے، منافق کے لئے جہنم کا سب سے سخت اور نچلا حصہ ہے، تو بے وفائی اور عہد اور وعدے کا پورا نہ کرنا سمجھ لو کہ کتنا شدید گناہ ہے۔

وفاداری جہاں بھی ہو، قابل مدح ہے، زمانۂ جاہلیت میں ایک چھوٹی سی

ریاست کا مالک سموئل بن عادیا نامی رئیس تھا، اسی دور میں عرب کا مشہور شاعر امرأ القیس بھی تھا، امرأالقیس پر کسی دشمن نے حملہ کیا، یہ حالانکہ خود بہت بہادر تھا، مگر اسے تاب مقابلہ کی نہ رہی، بھاگ کر سموئل بن عادیا کے پاس پہونچ گیا، اوراس سے پناہ کا طالب ہوا۔ سموئل نے پناہ دیدی، دشمنوں نے سموئل کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا، اور مطالبہ کیا کہ امرأالقیس کواس کے حوالے کیا جائے، سموئل نے انکار کیا، دشمنوں نے کسی حیلے تدبیر سے سموئل کے اکلوتے بیٹے کو پکڑلیا، اور اسے کھڑا کر کے مطالبہ کیا کہ یا تو امرأالقیس کو ہمارے حوالہ کردو، ورنہ ہم لڑکے کی گردن ماردیں گے۔ معاملہ سخت کشمکش کا تھا، ایک طرف تو نوعمر اکلوتا بیٹا بے بسی کی موت مارا جارہا ہے، دوسری طرف قول وقرار کی پاسداری ہے، سموئل نے کہا کہ بیٹے کی گردن کٹ سکتی ہے، لیکن باپ کی زبان نہیں کٹ سکتی، پھر یہی ہوا کہ ایفاء عہد کی تکمیل میں بیٹے کی جان چلی گئی، لیکن سموئل بن عادیا کی وفاداری سارے عرب میں ضرب المثل بن گئی۔

ایران کا ایک رئیس ہرمزان نامی حضرت امیر المومنین سیّدنا عمر فاروقؓ کے پاس گرفتار کر کے لایا گیا، یہ آدمی بہت عیار اور چالاک ہے، اوراسلام کیلئے خطرناک ہے، اس لئے اس کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔ قتل سے پہلے اس نے پانی مانگا، آپ نے ایک پیالہ پانی اسے دینے کا حکم دیا، وہ ہاتھ میں پیالہ لئے کچھ سوچ رہا تھا، پھر اس نے درخواست کی کہ جب تک پانی پی نہ لوں، مارا نہ جاؤں، حضرت عمرؓ نے منظور کیا، اس نے یہ سن کر پیالہ پھینک دیا اور کہا کہ میں پانی نہیں پیتا، اس لئے شرط کے مطابق آپ مجھے قتل نہیں کرسکتے، پھر ہرمزان نے کلمہ پڑھا۔ (الفاروق: ۱۶۴، العقد الفرید، ج: ۱، ص: ۱۱۵)

دیکھتے ہو عہد کی پاسداری کہاں تک پہونچی ہوئی ہے، لیکن یہ آسان کام نہیں ہے، بسا اوقات بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے، تب وفاداری کے کسی مرتبے تک انسان پہونچتا ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: لَنْ تَنَالُوْاالْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ، کامل نیکی اور وفاداری تمہیں اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک اپنی محبوب اور

پسندیدہ چیز خرچ نہ کرو۔ نیکی اور وفاداری کا مرتبہ حاصل کرنے کے لئے بہت کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ سموئل بن عادیا نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربان کردیا، تب وفاداری میں ضرب المثل بنا، سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے قول کی تکمیل کے لئے ایک ایسے شخص سے قتل کا حکم اٹھالیا، جو بار بار دھوکہ دے چکا تھا، اور سیاسی لحاظ سے جس کا قتل کرنا عین ضروری تھا۔

میں تم طالب علموں سے پوچھتا ہوں کہ وفاداری کی اہمیت تم سمجھتے ہو یا نہیں؟ اچھا سمجھ گئے تو بتاؤ کہ تمہیں کس کا وفادار بننا ہے؟ تم نے ٹھیک کہا، تمہیں اللہ اور اس کے رسول کا وفادار بننا ہے، اپنے نفس کا نہیں، اپنی خواہشات کا نہیں، اپنے خاندانی رسم ورواج کا نہیں، اللہ کی وفاداری میں، رسول کی وفاداری میں، شریعت محمدی کی وفاداری میں، نفس کو، نفس کی خواہشات کو، اپنے گردوپیش کو قربان کرنا پڑے گا۔ یہ ایک مشکل کام ہے، بالخصوص نفس کی خواہش کو ترک کرنا بیحد مشکل کام ہے، لیکن اگر یہ نہ کیا، تو اپنے نفس کے وفادار ہوئے اللہ کے نہیں، لیکن یہ بھی سمجھ لو، مشقت جھیل کر، محنت برداشت کرکے جب تم وفاداری کا مقام حاصل کرلوگے، تو حق تعالیٰ کی طرف سے نوازشیں بھی بہت ہوں گی۔

تم نے وفاداری کی کچھ مثالیں سنیں، اب ریشم میں ٹاٹ کا پیوند لگاتا ہوں، شاید اس سے کچھ نصیحت حاصل ہو، اگرچہ میرا حال یہ ہے کہ کاہل ہوں، کمزور ہوں، کس منہ سے وفاداری کا نام لوں، وفاداری تو شیر دل لوگوں کا کام ہے، جو حقیقۃً اللہ ورسول سے سچی محبت اور سچا عشق رکھتے ہوں، میرا حال تو یہ ہے ؎

کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو
ہوگا کسی دیوار کے سائے تلے میر

مجھ سے کیا ہوسکا کہ میں ان جانبازوں کی قطار میں کھڑا ہونے کی کوشش کروں، جن کے نام سے وفاداری کی دنیا روشن ہے، سنو مرزا رفیع سودا، میر ہی کی طرح اردو کے بڑے شاعر ہیں، وہ کہتے ہیں۔ ؎

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہکن بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

لیکن شاید کچھ سامانِ نصیحت ہو، بتاتا ہوں، بمبئی میں ایک صاحب ثروت کے مکان پر تھا، ان کا تعلق قدرے دینداری سے بھی تھا، کہنے لگے مولانا آپ وعظ کہتے ہیں، ایک ایسی چیز آپ کو دکھاتا ہوں جو آپ کے وعظ وتقریر کیلئے مفید ہوگی، پھر کہنے لگے کہ قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ جنگل میں جانور کس طرح بغیر کھائے پیئے، صرف ہوا کے سہارے مدتوں زندہ رہتے ہیں؟ میں نے پوچھا یہ منظر آپ مجھے کس طرح دکھائیں گے، کہنے لگے ویڈیو کیسٹ کے ذریعہ ٹی۔ وی پر! میں نے معذرت کی، اور کہا کہ میں مجمع عام میں ٹی۔ وی دیکھنے کو حرام کہتا ہوں، اگر خلوت میں، میں وہی کام کروں گا تو اللہ ورسول سے بغاوت ہوگی۔ میرے وعظ کے لئے قرآن وحدیث اور بزرگوں کے حالات وواقعات کافی ہیں، حافظ شیرازی نے ایسے واعظوں کے بارے میں جو خلوت وجلوت کا رنگ الگ الگ رکھتے ہیں کہا ہے۔

واعظاں کیں جلوہ بر محراب ومنبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگر می کنند

یہ واعظ حضرات جو منبر ومحراب پر جلوؤں کی نمائش کرتے ہیں، جب خلوت میں جاتے ہیں تو دوسرا کام کرتے ہیں۔

میرے انکار پر بھی وہ مصر رہے، وہ اپنے بیٹے کو بتاکید حکم دیتے رہے کہ فلاں کیسٹ تلاش کرو، وہ کیسٹوں کے انبار میں مسلسل تلاش کرتا، اور میں کانپتا تھراتا رہا کہ کہیں وہ مل گئی، اور مجھے مجبور کیا گیا، تو وہ دین وشریعت کے ساتھ وفاداری کہاں رہی، جس کو میں سوچا کرتا ہوں، پھر میں نے دل ہی دل میں خداوند ذوالجلال سے مناجات کی، اور ڈھونڈھنے والا پسینہ سے تربتر ہوگیا اور وہ کیسٹ نہیں ملی۔

سنتے ہو بچو! ہم کسی کے نہیں ہیں، ہم اللہ کے ہیں، اس کے رسول کے ہیں، ہماری وفاداری انھیں سے متعلق ہے، وہ جس سے کہیں گے ہم اپنا رشتہ جوڑیں گے، اور

جس کے متعلق حکم دیں گے اس سے ناطہ توڑ لیں گے۔

اس راہ میں نفس ہو، زمانے کے تقاضے ہوں، رشتے ناطے ہوں، اپنے پرائے ہوں، اللہ و رسول کا حکم نامہ لے کر آئیں، پھر ہم خدمت کیلئے تیار ہیں، اور خدا کا حکم نامہ نہیں ہے، تو کوئی بھی ہم سے وفا تو دور کی بات ہے تعمیل تقاضا کی بات بھی نہ سوچے۔

یہ ہے تو ایک مشکل بات! بہت مشکل بات! لیکن اللہ و رسول کی وفاداری اس سے بہت بلند ہے، میرا تجربہ ہے کہ تمام کاموں میں مشکل ترین کام نفس کی خواہشوں پر عین اس کے تسلط اور ہیجان کے وقت لگام لگانا ہے، یہ بہت مشکل کام ہے، لیکن اگر کسی نے ہمت کر کے اس منزل کو سر کر لیا تو پھر اس کی ترقی اور اس کے عروج کی کوئی حد نہیں رہتی۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب بھوپالی علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے کہ مشہور بزرگ حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید قدس سرہٗ کی خدمت میں ایک صاحب ریاضت ہندو آیا، اور بیٹھتے ہی مراقب ہو گیا، مراقبہ سے سر اٹھایا، تو بولا کہ حضرت آپ کا دل نہایت صاف شفاف ہے، اس میں کوئی کجی اور اونچ نیچ نہیں ہے، لیکن ایک سخت عیب یہ ہے کہ بالکل سیاہ ہے، فرمایا کہ تم کمال کے صاحب کشف ہو، بھلا یہ تو بتاؤ کہ یہ کشف کا کمال تمہیں کیونکر حاصل ہوا؟ بولا کہ میرے گرو نے ابتداء میں ہی مجھ سے عہد لیا تھا کہ نفس کی خواہشات ولذات سے کنارہ کش رہوں گا، اور اس کی خواہشات کی ہمیشہ مخالفت کروں گا، حضرت نے فرمایا واقعی نفس کی مخالفت سے بڑے بڑے کمالات حاصل ہوتے ہیں، مگر تم ایک بات بتاؤ کہ مسلمان ہو جانا، اور دین اسلام میں داخل ہونا تمہارے نفس کے خلاف ہے یا نہیں؟ اس نے کہا بے شک! آپ نے فرمایا پھر اسے قبول کرو، اس نے کہا کہ ہاں عہد کی پاسداری تو یہی ہے کہ میں اس دین کو قبول کر لوں، اور میرے گرو کہا کرتے تھے کہ تمہارے اندر مسلمانوں جیسے باس آتی ہے، سو آج یہ بات پوری ہوئی، اور وہ مسلمان ہو گیا، دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے ہی اس کی حالت بدل گئی، اب وہ نہایت مؤدب ہو کر حضرت مرزا صاحب قدس سرہٗ کے پاس بیٹھ گیا،

اور کہا کہ اب آپ کا دل سورج سے زیادہ روشن ہے۔ فرمایا کہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو وہ میرا نہیں تمہارا دل ہے، پہلے سیاہ دیکھا تھا، تو بھی وہی تھا، اب روشن دیکھ رہے ہو، تب بھی وہی ہے، میرا دل آئینہ ہے، اس میں تم نے اپنا ہی دل دیکھا ہے، پہلے وہ کفر کی وجہ سے سیاہ تھا، اب اسلام کے نور کی وجہ سے روشن ہے۔

دیکھو اس نے ایک عہد پورا کیا، اپنے وعدے کا وفادار تھا، تو اللہ نے اس کی برکت سے ضلالت سے کتنی آسانی سے ہدایت کی راہ پر ڈال دیا۔

تو طالب علمو! بلکہ یہ بات تمام مسلمانوں سے ہے کہ تم نے مدرسہ ہی کی نہیں، اسلام کی چہار دیواری میں داخل ہو کر ایک عہد کیا ہے کہ ہم اللہ کے ہیں، اللہ ہمارے ہیں، ہم ان کے وفادار ہیں، اس عہد وفاداری کے بعد چاہے جہاں سے، اور چاہے جدھر سے، کتنا ہی خوبصورت سے خوبصورت نظریہ وضع ہو، ہماری وفاداری اسی ایک در کے ساتھ وابستہ رہے گی۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جب اتباعِ رسول کا راستہ لیا، تو پھر کوئی بڑی سے بڑی ترغیب انھیں ہلا نہ سکی۔ آج امت کا حال بدلا ہوا دکھائی دیتا ہے، دنیا والوں کے طور وطریق کو دیکھ دیکھ کر لوگ وفاداری کی راہ چھوڑے جارہے ہیں، دین کا علم کم یا بالکل نہیں! اور دنیاوی علوم وفنون کی اہمیت اتنی بڑھ گئی ہے، جیسے اصل تعلیم وہی ہو، شکل وصورت غیروں کی، لباس اور وضع قطع غیروں کی، معاشرت غیروں کی، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اسلام کی کوئی چیز پسند نہیں ہے، یہ کس قدر بیوفائی ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ وفاداری کی راہ چلو گے، تو بہت سے محبوبات ومالوفات کو چھوڑنا پڑے گا، لیکن جتنی جتنی نفس سے دوری ہوگی، اتنا ہی وفاداری کے بلند سے بلند تر مقامات تک رسائی ہوتی رہے گی۔ آخر وہی تو فرماتے ہیں کہ: لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ، کچھ قربان کئے بغیر کوئی درجہ کیونکر حاصل ہوگا؟

اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں۔ تمت تمت تمت

مدارس اسلامیہ

نحمدهٗ ونصلی علیٰ رسوله الکریم!

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے ختم ہونے کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ اور دینی شعائر واحکام کی ترویج واشاعت میں ان اسلامی مدارس ومکاتب کا خاص دخل رہا ہے، جو وسائل کی بے مائیگی کے باوجود محض اللہ کے توکل پر دین کا چراغ جلائے بیٹھے رہے۔ ایک لمبا عرصہ گزر گیا اس طویل عرصہ میں اس کے اندر کوئی ایسی حکومت نہیں آئی، جو اسلام اور مسلمانوں کے تئیں ہمدردی کا مخلصانہ جذبہ رکھتی، بلکہ جو طاقت بھی حکومت بن کر آئی، اس نے اسلام اور مسلمانوں کو فنا ہی کرنا چاہا، لیکن اللہ کی شان ہے کہ تمام مخالفانہ طوفانوں اور آندھیوں کے باوجود اسلام زندہ ہے، اسلامی کتب باقی ہیں، علماء ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں، اور جس سے جتنا بن پڑتا ہے اسلام کی خدمت کر رہا ہے۔ ارادہ اور مشیت اللہ تعالیٰ کی، لیکن اسباب میں ذریعہ یہی اسلامی مدارس بنے ہیں، ان مدارس کے ذریعہ دین کا علم اپنی اصلی شکل کے اندر باقی رہا، پھر اس علم اور علم کے اوپر عمل کرنے والی شخصیات کی برکت سے ایک جماعت مسلسل باقی رہی، جو بطور نمونے کے دین کی نمائندگی کرتی رہی۔ یہ حضرات دین ودیانت کے پیکر ہوتے، ان کا ہر ہر عمل کتاب وسنت کے سانچے میں ڈھلا ہوتا، طالب علم قرآن وحدیث پڑھتا جاتا، اور اس کا عملی نمونہ اپنے ان اساتذہ واکابر میں دیکھتا جاتا، پھر اس کے نتیجے میں اس کا ایک خاص ذہنی وقلبی رویہ بنتا، اور وہی رویہ اس کی زندگی بھر کے لئے رہنما بنتا، وہ خود بھی اپنی استعداد کے مطابق اس

سانچے میں ڈھلتا، اور جو اس کے دائرۂ اثر میں آتا، ڈھلتا چلا جاتا، ان مدارس میں پہونچ کر، ان علماء کی صحبت میں بیٹھ کر، ان کی صورتیں دیکھ کر بے ساختہ اللہ تعالیٰ یاد آتے، آخرت کی فکر قلب میں جاگزیں ہوتی، دل کی دنیا میں انقلاب آتا۔

آخر کوئی بات تھی کہ ایک ہندو زمیندار پنجاب کا رہنے والا، دارالعلوم دیوبند کی دارالحدیث میں اتفاقاً پہونچ جاتا ہے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ بخاری شریف کا درس دے رہے ہیں، وہ بھی بیٹھ جاتا ہے، جب حضرت پڑھا کر فارغ ہوجاتے ہیں، اور اٹھ کر دارالحدیث سے باہر نکلتے ہیں، تو بہت سے لوگ لپک لپک کر مصافحہ کی سعادت حاصل کرتے ہیں، اس جوان کے دل میں بھی کچھ خیال آتا ہے، ڈرتا ڈرتا یہ بھی پہونچتا ہے اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیتا ہے، ہندوانہ لباس میں ملبوس ایک ہندو نوجوان جب ہاتھ بڑھاتا ہے، تو حضرت کا ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھتا ہے، اور استفہامیہ نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز ہوجاتی ہیں، اسے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا بے ساختہ بول اٹھتا ہے کہ مجھے مسلمان بنالیجئے، اور حضرت اسی جگہ راستے ہی میں زمین پر بیٹھ جاتے ہیں اور کلمہ پڑھا دیتے ہیں۔

اس طرح کا ماحول تھا، مدارس کا، اور اربابِ مدارس کا! حضرت مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری نور اللہ مرقدہٗ کی شخصیت ایک زمانے میں آسمانِ خطابت کی بدر کامل نہیں، بلکہ آفتابِ جہانتاب تھی، عزت واکرام کی بڑی سے بڑی بلندی جو ہوسکتی ہے، انھیں حاصل تھی، لیکن وہ بندہ اپنے نفس کا غلام نہ تھا، اللہ کے لئے اس کا مرنا جینا تھا، ایک صاحب کے یہاں زینے پر چڑھ رہے تھے، اوپر سے ایک بھنگی اتر رہا تھا، شاہ صاحب کا جاہ وجلال دیکھا، تو وہ حواس باختہ ہوگیا۔ زمینداری کے دور میں بھنگیوں کی جو دُرگت تھی آج اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا، شاہ صاحب کو دیکھ کر وہ ایک طرف سمٹنے لگا، شاہ صاحب نے بے ساختہ فرمایا تم بھی انسان ہو، کیوں ڈرتے ہو، یہ کہتے کہتے اسے پکڑ کر سینے سے لگالیا۔ اللہ جانے اس پر کیا اثر پڑا کہ دوسرے دن پورے خاندان

سمیت شاہ صاحب کے قدموں میں آگیا اور جہنم سے نجات حاصل کرلی۔ انھیں علماء نے اور انھیں مدارس نے لوگوں کے دین وایمان کو باقی رکھا، اور انھیں سنبھالا۔

یہ مدارس اب بھی ہیں، ان میں پڑھنے پڑھانے والے اب بھی ہیں، اور میں یہ بھی نہیں کہتا کہ یہ بالکل بانجھ ہوگئے ہیں۔ دین کا تحفظ اللہ تعالیٰ کو منظور ہے، اب بھی انھیں مدارس کے اُفق سے علم وعمل کے بدرو ہلال طلوع ہوتے ہیں، اب بھی انھیں سے روشنی پھیلتی ہے، لیکن اب بکثرت ایسی چیزیں مدارس کی طرف منسوب ہوکر سننے میں آتی ہیں اور ان کا مشاہدہ بھی ہوتا ہے جن کا انتساب مدارس کی طرف کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ بہت سے لوگ جو مدارس اسلامیہ کا احتساب کرتے ہیں، وہ زیادہ تر مدارس کے نصابِ تعلیم کو نشانہ بناتے ہیں، لیکن جہاں تک اس حقیر نے .... جو ابتداء عمر سے اب تک مدارس میں ہی رہا ہے............ دیکھا اور سمجھا ہے، مسئلہ نصابِ تعلیم کا نہیں ہے، نصابِ تعلیم نظری اعتبار سے خواہ کتنا ہی اچھا ہو، اگر اسے سلیقہ سے پڑھایا نہ گیا، اسکی تکمیل نہ کی گئی، تو اس سے کیا حاصل ہوگا؟ اصل مسئلہ مدارس کے انتظامی اور تربیتی امور کا ہے۔

اربابِ انتظام کو محنت وکوشش کرکے اساتذہ اور طلبہ کو ساتھ ملاکر ایک ایسا ماحول بنانا چاہئے جس میں طلب علم اور تحصیل کمال کے لئے وقت فارغ ملے، ذہن ودماغ پڑھنے کی طرف متوجہ ہو، اپنی تعلیم کی قدر وقیمت کا احساس ہو۔

اساتذہ پڑھانے صرف رسمی ڈیوٹی نہ سمجھیں، بلکہ اپنا فرض سمجھ کر مطالعہ میں محنت کریں، طلبہ کو شفقت ومحبت کے ساتھ روزانہ اتنی مقدار میں پڑھائیں، جوان کی طلب کو آسودہ بھی کرسکے اور ان کی طاقت وتحمل سے زیادہ بھی نہ ہو، پھر سرسری طور پر ان کی نگرانی بھی رکھیں، کوئی نامناسب چیز ان کی طرف سے آئے تو مہربانی سے اس پر ٹوک دیں۔ ٹوکنے سے برائی سمٹتی ہے، ورنہ پھیلتی چلی جاتی ہے، خود اپنے قول وعمل سے طلبہ کو تعلیم کے کام میں لگائے رکھیں۔

پھر طلبہ بھی ہمہ وقت یہ خیال رکھیں کہ ان مدارس میں اتنا وقت لگانے کا کیا مقصد ہے؟ اگر صرف وقت گزارنا ہے، تو بربادی کے علاوہ اور کیا ہے؟

ان تینوں کارکنوں کی ذمہ داری ہے کہ مدرسہ کے اور آپس کے سبھی معاملات میں طریقۂ شرعی اور سنت نبوی کا خاص اہتمام کریں۔

لیکن افسوس کا، سخت افسوس کا، بلکہ خون کے آنسو رونے کا محل ہے کہ یہی دینی مدارس جہاں سے علم کا نور پھیلتا ہے، انھیں مدارس میں اقتدار کی کشمکش ہوتی ہے اور اس کشمکش کا حل نہ شریعت میں تلاش کیا جاتا، اور نہ سنت میں، اس کے لئے لوگ کفر کی عدالت میں پہونچ جاتے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ ایک مدرسے میں عدالت نے دو متحارب گروپ کو تا فیصلہ مدرسہ کے انتظام سے بے دخل کر کے ایک غیر مسلم کو انتظام کی کرسی پر بیٹھا دیا ہے، بھیڑیا بکریوں کی گلہ بانی کرے گا، تو بکریوں کا کیا حال ہوگا؟ کس قدر شرم و غیرت کا مقام ہے کہ وہ لوگ جو حدیث و سنت کو اپنا امتیاز بنانے کے مدعی ہیں، ایک غیر مسلم کو اپنے اوپر مسلط کئے ہوئے ہیں، اور غیرت کا نام تک نہیں، اگر متحارب گروپ میں ذرا بھی غیرت ہوتی تو سب نزاع اسی وقت برطرف کر دیتے اور کم از کم یہ ذلت گوارا نہ کرتے، مگر بے حسی کا عالم یہ ہے کہ خوش ہیں۔ اللہ جانے کس حدیث پر یہ عمل کر رہے ہیں۔

ابھی حال میں سنا کہ ایک ممتاز دینی مدرسہ میں طلبہ، انتظامیہ اور محلّہ کے لوگوں میں کوئی کشمکش ہوئی، الزام ہر ایک دوسرے کے سر ڈالتا رہا، بات بڑھ گئی، باہر کے سب طلبہ ڈھائی پونے تین سو کے قریب یکا یک مدرسہ سے نکل گئے۔ اربابِ انتظام نے سخت رویہ اختیار کیا کہ نکل گئے تو انھیں واپس نہیں لینا ہے، دوسرے مدارس کو بھی منع کر دیا کہ وہ انھیں پناہ نہ دیں، پھر چند دنوں کے بعد کیا ہوا کہ خود ہی دوبارہ واپس لینے لگے۔

دوبارہ لینا کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے، قابل اعتراض بات یہ ہے کہ

انھیں نکلنے ہی کیوں دیا گیا؟ اور اتنا کہہ دینے سے آدمی اپنی ذمہ داریوں سے بری نہیں ہوسکتا کہ طلبہ بڑے نالائق ہوتے ہیں، وہ لیاقت سے خالی ہوتے ہیں جبھی تو مدرسوں میں آتے ہیں۔ اربابِ انتظام اور اساتذہ کا فریضہ ہے کہ وہ لیاقت پیدا کریں، لیکن کیا اس کے لئے مدارس میں محنت ہوتی ہے، خود اساتذہ اور اربابِ انتظام معاملات ونزاعات میں شرعی حدود کا پاس ولحاظ نہیں کرتے، طلبہ کو انتہائی حقیر وذلیل سمجھتے ہیں، جاہ ومنصب کے لئے اور معمولی معمولی فائدوں کے لئے وہی طریقے اختیار کرتے ہیں، جو عام طور پر دنیادار کرتے ہیں، پھر وہی اثرات طلبہ پر پڑتے ہیں، تو طلبہ قصوروار ہوتے ہیں، اور خود پاک باز برقرار رہتے ہیں۔ یا للعجب

لیکن کیا کیجئے، مصیبت یہ ہے کہ ان خالص دینی مدارس کو لوگوں نے کافر حکومت کی غلامی میں دے دیا ہے، حکومت کے کارکنوں کو ہماری شریعت سے کیا دلچسپی، اور اگر ہے بھی تو تخریب کے واسطے۔ ہمارے مدارس کے کارکنان بس مطمئن ہو بیٹھے ہیں کہ تنخواہ زیادہ مل رہی ہے، چاہے دین ودیانت کا جنازہ نکل جائے، ملازمت مستقل ہوگئی، تنخواہ زیادہ ہوگئی، حکومت کی پشت پناہی حاصل ہوگئی، اب کوئی کچھ بنا بگاڑ نہیں سکتا ہے۔ خواہ پڑھاؤ خواہ نہ پڑھاؤ، رجسٹر پر دستخط کافی ہے۔ ایسی حالت میں کس خیر کی توقع کی جاسکتی ہے۔

اس مسموم فضا میں وہ مدارس جو حکومت کی امداد سے کنارہ کش ہیں، وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، فضا میں سمّیت پھیلتی ہے، تو صحت مند لوگ بھی بخار میں مبتلا ہوجاتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ یہ مدارس بھی اپنی آبرو بچانے میں بسا اوقات ناکام ہوجاتے ہیں۔

منتظمین اور اساتذہ کو اپنا احتساب شدت سے کرنا چاہئے، زیادہ تر پانی یہیں مرتا ہے، طلبہ تو ابتداءً سادہ تختی ہوتے ہیں، ان پر جو چاہئے لکھئے، یہ قوم کی ہمارے پاس امانت ہیں، ان کو علم سے آراستہ ہونا چاہئے، شریعت ان کا مزاج بننا چاہئے، اور یہ

بات صرف ہماری تقریر، ہماری زجر و توبیخ اور ہماری سزا و عقاب سے نہیں حاصل ہوگی، ہمیں پہلے خود شریعت کے سانچے میں ڈھلنا چاہئے، اور یہ اس لئے نہیں ہم طلبہ کے لئے نمونہ ہیں بلکہ اس لئے کہ اللہ کا یہی حکم ہے، ہم اللہ کے بندے ہیں، ہمیں ان کا حکم بجالانا ضروری ہے، اگر ہم اپنے کو احکام شرع کی بجا آوری سے مستثنیٰ کرلیں، اور دوسروں کو ہی اس کا ذمہ دار قرار دیں تو حق تعالیٰ کی تہدید أَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ کے مصداق ہوں گے کہ دوسروں کو نیکی کی تلقین کرتے ہیں اور اپنے آپ کو بھلائے بیٹھے ہیں۔ فإلی اللہ المشتکی

طالب علموں کی نالائقی کا رونا، رونا، درحقیقت اپنی نالائقی کا اعلان واشتہار ہے۔ ہم تعلیم دینے میں ناکام ہیں، تربیت کرنے میں فیل ہیں، ورنہ یہ تو نہیں ہوتا کہ سب کے سب نالائق ہوجائیں۔ صحیح طریقے سے تعلیم و تربیت ہوگی، تو زیادہ تر طلبہ ڈھنگ کے ہی رہتے ہیں، کچھ ایسے ہوتے ہیں، جو تربیت کے اثر کو قبول نہیں کرتے، لیکن اچھوں کے مجمع میں انھیں شرارت کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اور عموماً تجربہ یہی ہے کہ طلبہ میں بغاوت اور شرارت سے بدرجہا زائد اطاعت اور محبت کا مادّہ ہوتا ہے، کبھی کوئی بات اس کے برخلاف ہوتی ہے، تو وہ کوئی وقتی اور عارضی ہیجان ہوجاتا ہے، جو ادنیٰ اشارہ سے ختم ہوتا ہے، لیکن ہمارے اہل انتظام اس وقتی ہیجان کو دائمی شرارت قرار دے کر اس کے مطابق کارروائی شروع کردیتے ہیں اور انجام برا نکلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خیر فرمائیں۔

☆☆☆☆☆

مدارس عربیہ اور مسابقے

کچھ دنوں سے ہمارے عربی دینی مدارس میں ایک نیا کام شروع ہوا ہے، اور اب وہ پرانا ہوتا جارہا ہے، اور پرانا ہونے کے بعد اسے تقدس بھی حاصل ہوجائے گا، اس کے بعد اگر کوئی ٹوکے گا تو لوگوں کو تعجب ہوگا کہ ایک مقدس اور معتبر کام پر کیوں اعتراض ہورہا ہے، بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ اس وقت بھی بہت سے لوگ اظہارِ تعجب کریں گے۔ یہ نیا کام ہے تقریر وتحریر اور قرأت قرآن میں مسابقات کا! متعدد مدارس میں خطابت وغیرہ کے مسابقے کرائے جاتے ہیں اور ان میں دوسرے مدارس کو اور ان کے طلبہ کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے، اب سے پچاس سال پہلے ان مسابقوں کو کوئی مدرسہ جانتا بھی نہ تھا، اب اس کا زور وشور ہے، کہا یہ جاتا ہے کہ اس سے طلبہ کی ہمت افزائی ہوتی ہے، ان میں محنت کرنے کی لگن پیدا ہوتی ہے، علم کا جذبہ بیدار ہوتا ہے، وغیرہ۔ یہ باتیں بظاہر خوشنما ہیں، لیکن جہاں تک اپنے بزرگوں اور اسلاف کے طریقوں پر غور کیا جاتا ہے نیز مدارس کے بنیادی مقصد کی روشنی میں اسے دیکھا جاتا ہے اور تجربات کی کسوٹی پر اسے پرکھا جاتا ہے، تو ان مسابقوں کا نتیجہ **إثمهما أكبر من نفعهما** کا مصداق نظر آتا ہے، یعنی اس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ ہے۔

اس بات میں تو کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے اسلاف اور بزرگانِ علم اس طرح مسابقوں سے واقف نہ تھے، ان کی تاریخ علمی جدوجہد اور کاوش ومحنت کی ایک تابناک تاریخ ہے، اس میں ایک خاص قسم کی یکسوئی، اور تحصیل علم کے حضور مکمل انقطاع کی کیفیت نظر آتی ہے۔ اساتذہ ہیں، درسگاہیں ہیں، اور طلبہ تمام مشاغل سے

یکسو ہو کر تحصیل علم میں لگے ہوئے ہیں۔ علمی استعداد ٹھوس بنائی جا رہی ہے، کتابوں کے مطالعے، مذاکرے اور علم کی بحث وتکرار کے علاوہ اور کوئی مشغلہ نہیں ہے۔

ان مدارس کا بنیادی مقصد علماء راسخین کو پیدا کرنا ہے، جن میں علمی استعداد ہو، کتابوں کے سمجھنے کا سلیقہ ہو، ان کی اخلاقی حالت درست ہو، اپنے اخلاق وعمل سے دین حق کے چلتے پھرتے نمونہ ہوں، قرآن وحدیث اور ان کے معاون دوسرے علوم میں مہارت رکھتے ہوں، آگے یہ بات واضح ہوگی کہ ان مسابقوں سے مذکورہ بالا مقصد کو نقصان پہونچتا ہے۔

اب تجربات کی بات سنئے! سب جانتے ہیں کہ علم! جو فی الحقیقت علم کہلانے کا مستحق ہے، یعنی علم دین جو مجموعہ ہے قرآن وحدیث کے معارف وحقائق کا، اس کے حاصل کرنے میں کتنی یکسوئی اور انہماک درکار ہے، دھواں چھینکتے ہوئے چراغوں کی لو کے سامنے لوگوں نے طول طویل راتیں جاگ جاگ کر کاٹی ہیں، تب کہیں جا کر اس کا جلوہ کچھ انھوں نے دیکھا ہے، آج ان مسابقوں جب میں طلبہ کو جھونکا جاتا ہے، تو وہ اپنے اَسباق اور اپنی کتابوں سے بے نیاز ہو کر مقابلہ کی تیاری میں ایسا منہمک ہو جاتے ہیں کہ علم کا ذوق مردہ سا ہو جاتا ہے، ساری لگن ان کی بھی اور اہل مدرسہ کی بھی یہ ہوتی ہے کہ خطابت یا قرأت میں ہمارا اور ہمارے مدرسہ کا رنگ جم جائے، پھر یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ ان مسابقوں سے باہم طلبہ میں بلکہ بعض اوقات مدارس میں چشمک اور رقابت پیدا ہوتی ہے، اس کے نتیجے میں اختلافات جنم لیتے ہیں، آپس میں حسد کی چنگاری سلگتی ہے، اور یہ چیز مسابقہ میں شریک ہونے والے طالب علم کے شوقِ علم کو بھی اور اس کے اخلاق ووضع کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے، اس سے کتنی ایسی اخلاقی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، جو دین وشریعت کی نگاہ میں مہلک ہیں۔

اہل مدارس کو اپنے ارادہ واختیار سے ایسا ماحول نہیں بنانا چاہئے جس میں طلبہ کی تعلیم میں کوئی خلل پڑے، بلکہ مدارس کی فضا ایسی بنانی چاہئے کہ طلبہ کا ذوقِ علم

بڑھے، استعداد کی فکر پیدا ہو، مطالعہ و مذاکرہ کا شوق روز افزوں ہو، اور اس کے ساتھ وہ باہمی اختلافات وتنافس سے بچیں۔ ہر وہ چیز جس سے دلوں میں خلاف وشقاق کا بیج پڑے، اس کو مدارس سے دور رکھنا چاہئے، اور طلبہ پر واضح کردینا چاہئے کہ تم ایک بڑے مقصد کے لئے مدرسوں میں جمع ہوئے ہو، ہر وہ بات جس سے تمہارا یہ مقصد مجروح ہوتا ہو، اس سے کوسوں دور رہو، یہ محنت وکوشش کا وقت ہے، اس میں اِدھر اُدھر کی مشغولیت زہر ہے، اگر طالب علم اس تربیت کے زیر اثر رہے گا، تو انشاء اللہ ذی استعداد بھی ہوگا اور صاحب اخلاق بھی!

پھر ان مسابقوں میں نقد یا اور کسی شکل میں انعام بھی رکھا جاتا ہے، طلبہ میں اس سے ایک طرح کی لالچ پیدا ہوتی ہے، لالچ کے بعد حصولِ مال کو مقصد بننے میں دیر نہیں لگتی۔ ہمارا علم دنیا سے بے رغبت ہونا سکھاتا ہے اور مسابقے ٹھیک اس کے برعکس حرصِ مال میں مبتلا کرتے ہیں، اس طرح علم دین کو بھی دنیاوی فنون کی مانند مال ہی کی میزان پر تولنے کا ذہن بنتا ہے، جو علم دین کے بنیادی مقصد کے بالکل خلاف ہے۔

یہ مسابقے دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک طریقہ یہ ہے کہ مسابقہ کرانے والا مدرسہ دوسرے مدارس اور ان کے طلبہ کو دعوتِ شرکت دیتے ہیں، مسابقوں کے باب میں عام مزاج یہی ہے، اس میں ضرر زیادہ ہے، اس مدرسہ کا بھی ضرر ہے جہاں مسابقہ کا پروگرام ہوتا ہے، کیونکہ کافی پہلے سے تیاریاں کرنی پڑتی ہیں، متعدد مدارس کے طلبہ واساتذہ بطور مہمان کے آئیں گے، ان کے شایانِ شان میزبانی کا انتظام کرنا ناگزیر ہے، اور ظاہر ہے کہ اس انتظام کا بار طلبہ واساتذہ پر ہی ہوتا ہے، تو ایک طرف تو بے تحاشا مال خرچ ہوتا ہے، اور دوسری طرف انتظامی مصروفیات کی وجہ سے طلبہ واساتذہ دونوں کا مزاج تعلیم سے ہٹ جاتا ہے، بلکہ ایک طرح کی بے ذوقی! بلکہ بدذوقی پیدا ہوجاتی ہے۔

اور جن مدارس کے طلبہ شرکت کرتے ہیں ان کا بھی تعلیمی حرج بہت ہوتا ہے،

مسابقہ کی تیاری، پھر سفر کر کے جانا، پھر ذرا اونچ نیچ سے شکایات کا پیدا ہونا، یہ سب چیزیں مشاہدے میں آتی رہتی ہیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جس مدرسہ میں مسابقہ کا پروگرام ہے، صرف وہیں کے طلبہ اس میں حصہ لیں، اس کا ضرر کم ہے، مگر ضرر سے خالی یہ بھی نہیں ہے، البتہ اس ضرر کی لپیٹ میں براہ راست دوسرے مدرسے نہیں آتے۔

لکھنے والا خود بھی ایک مدرسے میں ہے، مدرسوں کے نشیب وفراز سے واقف ہے، طلبہ کی تعلیم وتربیت کا عملی تجربہ رکھتا ہے، اسے طبیعتوں کی پیچیدگی کا بھی اندازہ ہے، ایک عرصہ تک اسی میدان میں رہنے اور مدارس کے ماحول کے دیکھنے کے بعد اسی رائے پر وہ پختہ ہے جس کو تحریر کیا۔ اس وقت اجمالی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے، ہوسکتا ہے کہ کسی وقت اس پر مفصل لکھنے کی نوبت آئے۔

☆☆☆☆☆

تعلیم وتعلم کا اسلامی نظریہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے اپنے مواعظ میں اور ان کے خلیفہ عارف باللہ مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے ملفوظات میں عبرت وموعظت سے لبریز ایک حکایت سنائی ہے۔

> حکایت یہ ہے کہ کسی گاؤں میں ایک آدمی تاڑ کے درخت پر چڑھا، چڑھنے کو تو چڑھ گیا، مگر اترنے کا جب ارادہ کیا تو نیچے دیکھ کر اسے لرزہ طاری ہوگیا، بہت گھبرایا، اس کی ہمت جواب دے گئی، پریشانی کے عالم میں چیخنے چلانے لگا، شور سنا تو گاؤں کے لوگ جمع ہوگئے، ہر ایک فکر کرنے لگا کہ اسے صحیح سلامت کس طرح اتارا جائے، کسی کو تدبیر سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس گاؤں میں ایک ”لال بجھکڑ“ رہتے تھے، جو ہر معاملہ میں اپنی رائے رکھتے تھے، اور اسے چلاتے تھے، وہ آگئے، ان کے سامنے صورت حال آئی تو سر جھکا کر غور کیا، دائیں بائیں نظر تفکر ڈالی، سر کو ہلایا اور بولے بات سمجھ میں آگئی۔ ایک موٹی اور لمبی رسی لاؤ، وہ لائی گئی، چند نوجوانوں سے فرمایا اسے پوری طاقت سے اوپر پھینکو، اور درخت پر چڑھے ہوئے آدمی کو حکم دیا کہ اسے پکڑ لینا، کسی طرح وہ رسی اس آدمی تک پہونچی، اس نے اسے پکڑ لیا، حکم ہوا کہ اپنی کمر میں باندھ لو، تعمیل کی گئی۔ نوجوانوں کو ارشاد ہوا کہ پوری طاقت سے کھینچو، انھوں نے زور لگایا تو وہ بے چارہ زمین پر گر کر مردہ ہوگیا، لوگوں نے ملامت کی کہ یہ کیا طریقہ آپ نے اختیار کیا کہ آدمی مر گیا، بہت سنجیدگی سے جواب دیا کہ اس کی قسمت میں موت ہی تھی، ورنہ میں نے اسی تدبیر سے بہتوں کو کنویں سے نکالا ہے۔

ہے تو یہ ایک لطیفہ! مگر غور کرنے والوں کے لئے اس میں عبرت ونصیحت کی ایک دنیا پنہاں ہے، سوچنے کی بات ہے کہ جو تدبیر کنویں میں گرے ہوئے آدمی کو نکالنے کے لئے کام میں لائی گئی اور وہ ہمیشہ کامیاب رہی، جب کسی ''عقل کل'' نے بعینہٖ وہی تدبیر ایک ایسے شخص کے لئے جو تاڑ کی بلندی پر چڑھا ہوا تھا، استعمال کی، تو نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا، وہی تدبیر یہاں نہ صرف یہ کہ ناکام رہی بلکہ ہلاکت کا باعث بنی۔

بات یہ ہے کہ ہر ایک تدبیر اور ہر ایک عمل کے لئے موقع اور محل ہوتا ہے، برمحل تدبیر کی جائے تو کامیاب رہتی ہے، اور وہی تدبیر بے محل کام میں لائی جائے، تو بجز ناکامی، بلکہ بربادی کے کوئی اور نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

آج ہر طرف غل ہے کہ مسلمان دنیا میں ذلیل وخوار ہے، زندگی کی ہر دوڑ میں پچھڑا ہوا ہے، اس کے حالات قابل افسوس ہیں، دنیا کی دوسری قومیں آسمانِ عروج وترقی پر چڑھی جارہی ہیں، اور مسلمان ہے کہ روز بروز انحطاط کی طرف مائل ہے، یہ رونا عام مسلمانوں کے حق میں تو ہے ہی! علماء کے حق میں بھی یہی فریاد سنی جاتی ہے، کہ معاشرے میں ان کا کوئی مقام نہیں، ان کے پاس تعلیم کا وہ معیار نہیں ہے، درس کا وہ نصاب نہیں ہے، جس سے یہ معاشرہ میں اپنی قیمت منوا سکیں۔ زمانے کی ترقی کی دُہائی دے کر بہت سے لوگ فکرمند ہیں کہ اسلام کے نام لیواؤں کو کیونکر اس مصیبت سے نجات دلائی جائے، اور ان کا کھویا ہوا مقام انھیں دوبارہ عطا کیا جائے۔ یہ فکر بالکل صحیح ہے مگر اس کیلئے جو تجویزیں، جو فارمولے، جو تدبیریں سامنے آرہی ہیں، ان میں بیشتر کا حال وہی ہے، جو اوپر والی حکایت میں بیان کیا گیا۔

تعلیم، تجارت اور ملازمت پر بہت زور دیا جاتا ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ تعلیم اور تجارت پر کسی قوم کی تہذیب اور اقتصادی حالت کا مدار ہے، مگر اس سلسلے میں اسلام کا ایک خاص مزاج اور خاص نظریۂ ومقصد ہے، دنیا کی دوسری قوموں سے بالکل

الگ! اسلام میں تعلیم وتجارت کا مقصد بھی الگ ہے، اور اس کا طریقہ بھی علیٰحدہ ہے۔ ہمارے یہاں تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی معرفت حاصل ہو، اسلام کے احکام کا صحیح علم ہو، اللہ کی خشیت کا مزاج بنے، سنت نبوی کے اختیار کرنے کا قلبی داعیہ پیدا ہو، دنیا سے بےفکری اور آخرت کی فکرمندی طبیعت بن جائے، پھر اس کے نتیجے میں انسان کی زندگی عبادت واطاعت کے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے۔

اور اس کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ علم کا طالب ادب واحترام کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے دیندار اور معتبر اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرے، اور عبادت سمجھ کر علم کو حاصل کرے، اور زندگی بھر اس سلسلہ کا احترام کرے، جس سلسلے سے علم کی دولت اس تک پہونچی ہے۔

اور دنیا کی دوسری قوموں کے نزدیک تعلیم وتعلم اور پڑھنا پڑھانا ایک تجارت ہے، کاروبار ہے، اس کو دنیاوی سود وزیاں کے معیار پر پرکھا جاتا ہے، پھر اس مقصد کے لحاظ سے خالص تجارتی انداز اس کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ یہی حال تجارت کا ہے، اسلام میں تجارت حلال روزی حاصل کرنے، اور اس سے اللہ کی عبادت یعنی زکوٰۃ ادا کرنے، اور اللہ کے دئے ہوئے مال سے اللہ کے بندوں کی بےغرض ہوکر مدد کرنے کیلئے ہے۔ پھر یہ تجارت بھی عبادت بن کر رہتی ہے، اور دنیا کی دوسری قوموں کے لئے تجارت صرف حصول مال کا ذریعہ ہے، پس ان کا مقصد بھی الگ ہے اور طریقہ بھی الگ ہے۔

اب اگر مسلمانوں کو بھی اسی مقصد اور اسی طریقۂ کار کی دعوت دی جائے، جو دوسروں کا مقصد اور طریقہ ہے، اور دعویٰ کیا جائے کہ اسی طریقہ سے دنیا کی قومیں بلند ہوئی ہیں، اس لئے مسلمان بھی یہی طریقہ اختیار کرکے نجات حاصل کرسکیں گے، تو وہی ”لال بجھکڑ“ والی بات ہوگی کہ میں نے اسی طریقہ سے بہتوں کو کنویں سے نکالا ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ بہت سے وہ حضرات جن کے علم وتفقہ پر بہت اعتماد کیا جاتا

ہے، انھوں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر دوسری قوموں کی چال اختیار کر لی ہے، اور اس کو تقاضائے زمانہ کا خوبصورت عنوان دے کر گوارا بناتے ہیں، مثلاً زمانے کا تقاضا یہ ہے کہ لڑکیوں کے لئے اقامتی درسگاہیں کھولی جائیں، اس کی دلیل میں تعلیم وتعلم کی فضیلت میں جو حدیثیں وارد ہیں، انھیں پیش کیا جاتا ہے، اور اس بات میں مرد وعورت کو مساوی قرار دیا جاتا ہے، حالانکہ عورتوں کے لئے علٰیحدہ مدرسے واسکول خالص انگریزوں کی دین ہے۔ ان کے یہاں عورت کے سلسلے میں جو نظریہ ہے، اور عورت کو جس نگاہ سے وہ دیکھتے ہیں اس لحاظ سے تو عورت تعلیم گاہ میں ہو تو وہاں بھی بہتر ہے، قحبہ خانہ میں ہو تو وہاں بھی مستحسن ہے، کسی اجنبی مرد سے پارکوں، ہوٹلوں میں ہم آغوش ہو تو بھی کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اسلام نے عورت کو جو مقام ومرتبہ عطا کیا ہے، اس کے لحاظ سے کسی بھی باب میں مرد وزن کی مساوات کا...... مطلقاً مساوات کا...... دعویٰ غلط ہے، لیکن انگریزوں کی نقالی میں لوگ اپنی لڑکیوں کو بصد شوق بلکہ بصد فخر گھروں کی چہار دیواری سے نکال کر مدارس کی کھلی فضا میں بھیج رہے ہیں، اور دینی تعلیم کے نام پر نہ جانے انھیں کیا بنا رہے ہیں، مدارسِ نسواں تو بہت چل رہے ہیں، مگر ہم نہیں دیکھتے کہ عورتوں میں کوئی خوشگوار تبدیلی آئی ہو۔

عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ آج کا کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے، ایسا بھی نہیں ہے کہ اسلام نے اس سے چودہ صدیوں تک بے اعتنائی برتی ہو، اور اب اچانک اس نے اس کی اہمیت کو پہچانا ہو، عورتوں میں تعلیم وتعلم کا دستور آغازِ اسلام ہی سے رہا ہے، لیکن اس کے لئے ایسا طریقہ اختیار کیا جاتا تھا کہ عورتوں کی ناموس بھی محفوظ رہے، آنکھوں میں حیا بھی باقی رہے، اور ضروری علم سے بہرہ ور بھی ہو جائے، اور اب جو طریقہ اقامتی درسگاہوں کا اختیار کیا گیا ہے، اس میں اس کی چادر عصمت محفوظ رہ جائے، حیا وتکلف باقی رہ جائے، ذرا مشکل ہے۔ اسلام کی تعلیمات اور اسلام کے مزاج سے وہی طریقہ ہم آہنگ ہے، جو ہمارے اسلاف نے اختیار کیا تھا، اور یہی ایک مسئلہ نہیں ہے، دیکھا

جاتا ہے کہ زندگی اور معاشرہ میں جو بھی مسئلہ ابھرتا ہے، اسے ’’جدید‘‘ اور ’’تازہ ترین‘‘ کا عنوان دے کر اس کا حل بے تکلف دوسروں کے خیالات ونظریات میں تلاش کیا جاتا ہے، غور کیجئے تو مسلمانوں کے لئے یہ ایک بڑا مسئلہ ہے، بنیادی لحاظ سے مسلمان غیبی حقائق اور فکر آخرت کے ساتھ مربوط ہیں، مگر اسی کے ساتھ مادیت اور دنیا کی تہذیب بھی ان پر مسلط کردی گئی ہے، ان دونوں عقیدوں اور نظریوں کی جہت بالکل علیحدہ ہے، اس کشمکش میں مسلمان ع

روکے ہے مجھے ایمان تو کھینچے ہے مجھے کفر

کی حیرت میں مبتلا ہے۔ حضرت امام مالک علیہ الرحمہ کا ارشاد ہے کہ: **لن یصلح آخر هٰذه الامة إلا بما صلحت به أولها**، اس امت کا آخری دور کی بھی اصلاح اسی طریقے سے ہوگی، جس طریقے سے اس کے دورِ اول کی ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح علم وفہم عطا فرمائے۔

☆☆☆☆☆

مدارسِ اسلامیہ عربیہ کا موضوع

مدارسِ اسلامیہ عربیہ کا موضوع جیسا کہ سب پر آشکارا ہے کہ علم دین کی خدمت اور علماء دین کا تیار کرنا ہے۔ علم دین، تین علوم کا مجموعہ ہے، (۱) قرآن، (۲) سنت وحدیث، (۳) اور علم فقہ۔ مجموعی طور پر انھیں تینوں علوم پر دین وشریعت کا مدار ہے، انھیں تینوں کی بقاء سے دین وشریعت کی بقاء ہے، اور ان تینوں کے تعلم وتعلیم میں خلل ہوگا، تو اسی کے بقدر دین وشریعت سے لوگوں میں جہل پیدا ہوگا، اس سے دوری ہوگی۔

ہندوستان میں جب تک مسلمانوں کی حکومت تھی، اس وقت تک مسلم حکمرانوں کی ذمہ داری تھی کہ وہ دین کی حفاظت وصیانت کے طریقوں کو بروئے کار لاتے رہیں، اور اس کام کے لئے باستثناء چند، مسلم سلاطین توفیق پاتے رہے، ان سلاطین کے سایۂ عاطفت میں علماء ومشائخ دین اسلام کی قندیلیں ملک کے طول وعرض میں روشن کرتے رہے۔ سلطان قطب الدین ایبک سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر تک ، دوسرے لفظوں میں مسلمانوں کے فاتحانہ مبارک داخلے سے شروع ہو کر خدا بیزار انگریزوں کی نحس دراندازیوں تک علماء ومشائخ اور حضراتِ صوفیہ کی مساعی اور کاوشوں کی ایک روشن اور روح پرور داستان ہے، کہ انھوں نے ان مسلم بادشاہوں کے زیر سایہ اس وسیع ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہدایت کی لہر دوڑا دی۔

پھر جب انگریزوں نے سیادت وحکومت کے تخت پر غاصبانہ قبضہ کیا، تو حکومت کے زوال کے ساتھ اندیشہ تھا کہ کہیں قلوب سے دین اسلام ہی کا صفایا نہ

ہو جائے، کیونکہ عام رعایا کا رُجحان حکومت کے نظریہ اور اس کے فکر کے تابع ہوتا ہے، دنیا جانتی ہے کہ انگریزوں کا نظریہ کیا ہے؟ ان کے خیالات کیا ہیں؟ ان کے ساتھ دنیا کی مصنوعی چمک دمک تھی، فلسفہ، سائنس، نفسیات، معاشیات اور دوسرے نہ جانے کن کن بھاری بھرکم اصطلاحوں سے لیس ہو کر ایک نئی تہذیب، نئے تمدن کے نئے نئے تماشے ان کے ساتھ تھے، ایسی صورت حال میں سخت اندیشہ تھا کہ حکومت کے زوال کی زخم رسیدہ قوم آنکھ بند کر کے اسی نئی حکومت کے پیچھے چل پڑے گی، اتنا ہی نہیں، اس پر مزید طرہ یہ تھا کہ مسلمانوں میں ہی ایک طاقت ور اور موثر طبقہ انگریزی تہذیب وتمدن کی بے چون وچرا نقالی اور بغیر کسی ترمیم واصلاح کے اس کی پیروی کا داعی اور منادی بن کر اٹھ کھڑا ہوا تھا، اور وہ بآوازِ بلند پکار رہا تھا کہ:

> ”اے میرے دوستو! اے کالج کے طالب علمو! تم یقین جانو کہ ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ خدا کی طرف سے ایک رحمت ہے، اس کی اطاعت وفرمانبرداری اور پوری وفاداری ونمک حلالی، جس کے سایۂ عاطفت میں ہم امن وامان سے زندگی بسر کرتے ہیں، خدا کی طرف سے ہمارا فرض ہے، میری یہ رائے آج کی نہیں بلکہ پچاس ساٹھ برس پہلے سے ہے، میں اسی رائے پر قائم اور مستقل ہوں، گورنمنٹ انگریزی اور قوم انگریز مسلمانوں کے ساتھ روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔
>
> اے مسلمانو! اگر تم بھی سچے خلوص اور سچی محبت اور سچی وفاداری اور سچی نمک حلالی سے گورنمنٹ انگریزی کے مطیع اور فرمانبردار رہو گے، تو خدا نے جو اپنے حاکم کی اطاعت کا فرض تم پر کیا ہے، اس کو بھی ادا کرو گے، اور اگر تم اپنے میں اور انگلش قوم میں کچھ دوری سمجھتے ہو، اس کو بھی دور کر دو گے، کیونکہ سرکار انگریزی کی خیر خواہی جو ہم پر حکومت کرتی ہے سب سے پہلا ہمارا فرض ہے۔
>
> سلطان عبد العزیز خاں مرحوم جب لندن میں آئے تھے، تو ان کی دعوت اور مہمانداری کے لئے ایک شاندار محل سجایا گیا تھا، میں جب لندن گیا، تو میں نے اس محل کو دیکھا تھا، اس میں جابجا در ودیوار پر کریسنٹ اور کراس یعنی ہلال وصلیب کے

نشان آپس میں ملے ہوئے تھے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ انگریزوں اور مسلمانوں کے اتحاد واتفاق کی یادگاری کی مبارک علامت ہے۔

اے دوستو! یہی نشان میں نے اپنے کالج کے لئے بھی اختیار کیا ہے، مجھے امید ہے کہ تم اس نشان کو اپنے دلوں میں بھی نقش کرو گے، اور یاد رکھو گے کہ اس کالج کا بڑا مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں اور انگریزوں میں اتحاد ہو، اور وہ ایک دوسرے کے اغراض میں یک جان و دو قالب ہو کر جیسا کہ اس نشان میں کریسنٹ اور کراس ایک جان دو قالب ہیں، شریک رہیں گے۔ اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ میری یہ آرزو پوری ہو۔ (روئداد محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، ج:۹، ص:۱۶۹،)

(نقش سرسیّد، مرتبہ ضیاء الدین لاہوری، ص:۹۷۔)

اور یہی داعی اور منادی آواز دے رہا ہے کہ:

”اصلی مقصد اس کالج کا یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اور بالتخصیص اعلیٰ درجہ کے مسلمان خاندانوں میں یورپین سائنسز اور لٹریچر کو رواج دے، اور ایک ایسا فرقہ پیدا کرے جو از روئے مذہب کے مسلمان اور از روئے خون اور رنگ کے ہندوستانی ہوں، مگر باعتبار مذاق اور رائے وفہم کے انگریز ہوں۔

(ایڈریس اور اسپیچیں، دیباچہ، ص:۲،) (حوالہ سابق، ص:۹۸)

ان حالات میں کیا یہ اندیشہ غیر متوقع ہے کہ مسلمان، قومی حیثیت سے فاتح حکمراں کے ساتھ جب مفتوحانہ وابستہ ہوں گے، تو اپنے دین ومذہب کو خیرباد کہہ دیں گے، یہ ایک سخت مصیبت تھی جس سے اس وقت امت مسلمہ دوچار تھی، حکومت وسیادت ملت اسلامیہ کے ہاتھ سے نکل چکی ہے، جس قوم نے حکومت کی باگ ڈور پر قبضہ کیا ہے، وہ ایشیا کی نہیں یورپ کی قوم ہے، اس کا مذہب الگ، اس کی تہذیب جدا، اس کی زبان علیٰحدہ، اور صلیبی جنگوں میں عرصہ دراز تک الجھنے کی وجہ سے اس کا سینہ مسلمانوں کے بغض وعناد کی آگ میں دہک رہا تھا، وہ قوم جب فاتح بن کر مسلمانوں کے تخت حکومت پر بیٹھتی ہے، تو إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً أَفْسَدُوهَا

وَجَعَلُوْا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً (سورۃ النمل:۳۴)(یہ دنیا کے بادشاہ جب کسی آبادی میں گھستے ہیں تو اسے تباہ وبرباد کر دیتے ہیں، اور وہاں کے معزز باشندوں کو ذلیل وخوار بنا کر رکھ دیتے ہیں) کا مظاہرہ پوری قوت کے ساتھ کرتی ہے، وہ دور عجب ابتلاء کا تھا، حساس دل تڑپ رہے تھے کہ اس نازک صورت میں دین ومذہب اور ملت اسلامیہ کو اس گردابِ بلا سے نکال لے جانے کی راہ کیا ہو؟ یہ ایک دردناک سوال تھا، اس وقت علماء کی جماعت نے ہتھیار بھی اٹھایا، اور میدانِ جہاد میں نکل آئے، ان سے پہلے سلطان فتح علی ٹیپو والیٔ میسور نے جان کی بازی لگا کر اس سیلابِ بلا کو روکنا چاہا تھا، مگر قضاوقدر کی مشیّت اور تھی، اب بظاہر اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہ تھی کہ میدان جنگ سے یکسو ہو کر حفاظت دین کے نئے قلعے تعمیر کئے جائیں، جن کی چہار دیواری میں یکسو ہو کر دینی علوم، دینی اعمال، فکر آخرت، رضاءِ الٰہی کا اہتمام کیا جائے، چنانچہ اس کے لئے پہلا قلعہ دیوبند میں تعمیر کیا گیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے طول وعرض میں اس کے نقش قدم پر بہت سے قلعے اپنی بنیادوں پر ابھر آئے۔

تو ان مدارس کا موضوع اور ان کی غایت دنیا نہیں، تحفظ دین ہے، اور الحمد للہ اپنے موضوع پر یہ مدارس بہت کامیاب رہے۔ حق تعالیٰ نے ان کے ذریعے دین وشریعت کی ایسی حفاظت فرمائی کہ آج بھی دین کی تعلیمات روشن اور واضح ہیں۔ آج ہندوستان وپاکستان اور بنگلہ دیش میں دین ومذہب کی جو روشنی نظر آرہی ہے، وہ انھیں مدارس کا فیض ہے، جنھوں نے دنیا والوں کی دنیاوی ترقیوں اور ان کی چمک دمک سے آنکھیں بند کر کے کچھ ایسے سرفروشوں اور جانبازوں کو تیار کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے، جن کا مقصد زندگی معاش نہیں، مال نہیں، حطامِ دنیا نہیں، حکومت نہیں، منصب نہیں، عیش وعشرت نہیں بلکہ دین ہے، آخرت ہے، رضائے الٰہی ہے، ان کے سامنے دنیا اپنی تمام دلآویزیوں کے ساتھ آتی ہے، مگر اس پر وہ نگاہِ غلط انداز بھی ڈالنے کے روادار نہیں ہوتے، قوم انھیں طعنہ دے، غیر انھیں گالی دیں، اپنے انھیں حقارت سے دیکھیں، مگر وہ

کسی اور ہی دھن میں ہیں، ایسے لوگ پہلے زیادہ تیار ہوتے تھے، اب کم ہو گئے ہیں، مگر بحمد اللہ مدارس بانجھ نہیں ہوئے ہیں، انھیں کی کوکھ سے اللہ کے دیوانے اب بھی پیدا ہوتے ہیں۔

اب ہم ان لوگوں سے گزارش کرتے ہیں، جو مدارس کی فقیرانہ مگر استغنائی زندگی سے واقف نہیں، جو اپنی عیش وعشرت کی کوٹھیوں سے باہر نکلنے کی زحمت نہیں کرتے، جن کی تعلیم دینی نہیں، جن کا مزاج دینی نہیں، جنھیں دین اور علم دین کی ابجد سے بھی شناسائی نہیں، جو اللہ ورسول کی وفاداری نہیں دنیا کی حرص وہوس میں مبتلا ہیں، ان سے گزارش ہے کہ وہ مدارس کو اپنے دنیادارانہ مشوروں سے پریشان نہ کریں، کالج اور یونیورسٹیوں کے اندر پڑھانے والے لمبی لمبی تنخواہ پاتے ہیں، اس کے برخلاف مدارس جو مسلمانوں کے چندے سے چلتے ہیں، ان کی خدمت کرنے والے معمولی، بقدر کفاف سے بھی کم تنخواہ پر کام کرتے ہیں، مگر یہ اجرِ آخرت کے امیدوار ہوتے ہیں، ان کو جب وہ مشورے دیئے جاتے ہیں جو بڑے بڑے سرمائے کے متقاضی ہوتے ہیں، تو خیال آتا ہے کہ یہ حضرات کس قدر ناواقف ہیں؟ یہ مشورے تو دے دیتے ہیں، لیکن یہ نہیں سوچتے کہ جن کو مشورہ دیا جا رہا ہے، ان کی چادر کتنی بڑی؟ پھر وہ مشورے صرف دنیاوی فوائد کے لئے ہوتے ہیں، جن سے دین الٰہی کے سرفروشوں نے صرفِ نظر کر رکھا ہے۔

مشہور ہے کہ ایک راجہ سے شکایت کی گئی کہ رعایا فاقوں سے مر رہی ہے، تو اس بھولے اور ناواقف راجہ نے کہا کہ کیا میری رعایا کو پلاؤ قورمہ بھی کھانے کو نہیں ملتا؟ اس نے اپنے دسترخوان کی معمولی چیز دیکھی اور رعایا کے سر اسے تھوپنا چاہا، ایسے ہی ہمارے دورِ حاضر کے مشورے دینے والے روشن خیال حضرات ہیں، وہ نہیں دیکھتے کہ اہل مدارس کس مقصد کو لے کر چل رہے ہیں، اور ان کے سامنے کیا دقتیں اور رکاوٹیں ہیں؟ بس وہ کسی کانفرنس، کسی سیمینار، کسی اجلاس میں مشورے دے کر سمجھتے ہیں کہ خیر

خواہی اور ہمدردی کا حق ادا کر دیا، اور اگر ان سے کہا جائے کہ اپنی بڑی بڑی آمدنیوں کا کچھ حصہ دین کے لئے بھی مختص کیجئے تو جیب خالی ہو جاتی ہے۔

بلکہ حد تو یہ ہے کہ وہ عبادتیں جن میں مال کا خرچ ہے، ان میں یہ صاحبانِ ثروت کچھ پیچھے ہی رہتے ہیں، حج میں عوام کا طبقہ بہت دکھائی دیتا ہے، تاجروں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے، لیکن انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ جو سرکاری ملازمتوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں بڑی بڑی تنخواہیں وصول کرتا ہے، اس کی تعداد ناقابل بیان حد تک کم ہوتی ہے، قربانی ہو، عام صدقات وخیرات ہوں، ہر جگہ یکساں حال ہے۔ یہ باتیں میں دل پر جبر کر کے لکھ رہا ہوں، بہت سے حضرات کو ناگواری ہوگی، مگر یہ ناگواری اس لئے گوارا ہو رہی ہے کہ مدارس کے سلسلے میں بہت سے الٹے سیدھے مشورے اور زیادہ ناگوار ہوتے ہیں۔

اور اب تو بات ہمارے دانشوروں سے آگے بڑھ کر حکومت کے دفتروں تک جا پہونچی ہے، حکومت کے ارکان بھی مختلف انواع واقسام کے مشورے دینی مدارس کو دینے لگے ہیں، ان کے ساتھ وعدے بھی، اور بہت سی وعیدیں بھی، پھر بعض مدارس متاثر بھی ہو جاتے ہیں، اسی طرح بعض وہ لوگ جو علم دین کی طرف منسوب ہیں، وہ بھی دنیاداروں کی ریس میں دوڑ لگانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔

اربابِ مدارس اپنا احتساب کریں، تعلیماتِ الٰہی اور ارشاداتِ نبوی کی روشنی میں اپنی کمی کوتاہی کو دیکھیں اور انھیں دور کرنے اور قرآن وسنت کی طرف پلٹنے کا اہتمام کریں، لیکن انگریزی درس گاہوں کا پیوند نہ لگائیں، جن کے بنیادی مقاصد کی وضاحت بانیِ اول کے قلم سے آپ پڑھ آئے ہیں۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِلْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِکَ مِنَ الْقَوْمِ الْکَافِرِيْنَ

☆☆☆☆☆

منصبِ تدریس
اور
حضراتِ مدرسین

مولف

مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب

ان نونہالانِ علومِ نبوت کے نام

جو بساطِ تدریس پر تازہ وارد ہوئے ہیں یا وارد ہونے والے ہیں۔ ان میں میرے فرزند بھی ہیں، میرے طلبہ بھی ہیں، اور دوسرے اہل محبت وخدمت بھی ہیں، جن کے قلوب قرآن وسنت پر مرمٹنے کے جذبات سے سرشار ہیں۔

جوانوں کو مری آہِ سحر دے پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدا یا آرزو میری یہی ہے مرا نورِ بصیرت عام کر دے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

یہ بندہ خاکسار، جب سے اس نے ہوش کی آنکھ کھولی ہے، اپنے آپ کو مدارس دینیہ اسلامیہ کے حصار میں پا رہا ہے، بچپن اسی حصار میں گزرا، جوانی کی عمر اسی حصار میں کٹی، اب بڑھاپا بھی یہیں گزر رَہا ہے۔ حق تعالیٰ سے دعا و التجا کرتا ہوں کہ عمر کا جتنا حصہ باقی ہے وہ بھی اسی حصار میں بخیر و خوبی گزرے۔ بزرگوں سے بھی، دوستوں سے بھی اور ان سے بھی جنھوں نے اس ظلوم وجہول کو اپنے لئے معلم واستاذ بنایا، یہی درخواست ہے کہ میرے حق میں یہ دعا ضرور کریں۔

مدرسوں میں رہ کر میں نے اور کچھ سیکھا ہو یا نہ سیکھا ہو لیکن اتنی بات میرے دل میں بطور حق الیقین کے راسخ ہوگئی ہے کہ یہ مدارس باوجود اپنی بہت سی اندرونی کمزوریوں کے، اس دور میں دین اسلام کی حفاظت کے لئے مضبوط قلعے ہیں، جو خدائی نصرت و اعانت کے ماتحت چل رہے ہیں، حق تعالیٰ کو اپنے دین کی بقا منظور ہے، اس کا کام انھیں مدارس سے لے رہے ہیں۔ آج جو حضرات ''علماء کرام'' کے معزز لقب سے یاد کئے جاتے ہیں، اور جن سے دین کے احکام و مسائل زندہ ہیں، وہ سب انھیں مدارس کے پروردہ ہیں۔

یہ مدارس جن عناصر سے مرکب ہیں، ان میں اہم ترین عنصر اساتذہ و معلمین کا ہے، طلبہ اپنے دل و دماغ کی سادہ تختیاں اور اپنے مزاج و طبیعت کی بے رنگ استعداد، ان اساتذہ کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ ان پر یہ حضرات علم و حکمت کے ان نقوش کو مرتسم کریں، جو انھیں بطریق تواتر رسول اللہ ﷺ سے حاصل ہوئے ہیں، اور ان بے رنگ استعدادوں میں وہ رنگ بھر دیں، جسے ''صبغۃ اللہ'' (اللہ کا رنگ) کہا جاتا ہے، اساتذہ کی ذمہ داریاں اس لحاظ سے نازک ہیں، ان کا رتبہ بلند ہے، تو ان کے فرائض بھی بہت اہم ہیں۔

میں مدرسوں میں پہلے متعلم کی حیثیت سے رہا ہوں، اور اب عرصہ سے معلم کی حیثیت سے ہوں، نظم و انتظام سے میرا تعلق صرف ضرورت کے بقدر رَہا ہے، مدرسی کے

تجربات بہت ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے مجھے جو اولادیں عطا فرمائیں، انھیں بھی میں نے اللہ کے بھروسے مدارس ہی کے حوالے کیا، بلکہ انھوں نے مدارس کی چار دیواری میں ہی آنکھ کھولی ہے، ہر چیز سے پہلے انھوں نے مدرسہ ہی کو دیکھا اور جانا ہے۔ روزی رساں اللہ تعالیٰ ہیں، میری آرزو ہمیشہ یہی رہی ہے کہ یہ دین کی خدمت میں اپنے آپ کو فنا کردیں۔

میں عرصے سے سوچ رہا تھا کہ مدرسین کے فرائض اور ذمہ داریوں سے متعلق ایک تحریر مرتب کروں، جس سے مجھے بھی فائدہ پہونچے اور ان دوستوں کے بھی کام آئے، جو خدمت کے اس راستے پر چل رہے ہیں، ادھر چند ماہ سے میرے کئی دوست اور میرے فرزند، جو ایک تازہ اور جدید مدرسہ، جو شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی نور اللہ مرقدہٗ کے نام نامی سے منسوب ہے، میں انتظامی اور تدریسی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں، بار بار یاد دلاتے رہے کہ اس موضوع پر کچھ کہئے، کچھ لکھئے۔

میں بھی سوچتا رہا کہ لکھوں، لیکن کیونکر لکھوں، کیا اُسلوب اختیار کروں؟ پھر بطور مقالے کے اسے لکھنا شروع کردیا تھا کہ دفعۃً دل میں یہ بات آئی کہ میرے فرزند عزیز مولوی حافظ محمد راشد سلّمہٗ ایک سال قبل دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوکر آئے ہیں، اور سال بھر سفر حضر میں میرے ساتھ رہے ہیں، ان سے اس موضوع پر متعدد بار گفتگو ہوئی، اب وہ تدریس کی خدمت پر فائز ہونے والے ہیں، میں نے سوچا کہ اس موضوع کا مخاطب انھیں کو بنا کر تحریر مرتب کروں، چنانچہ یہ مقالہ بشکل مکتوب مرتب ہوگیا، فرزند عزیز کی مخاطبت نے میرے لئے کچھ ایسے تجربات اور کچھ ایسی آپ بیتیوں کو لکھنا سہل کردیا، جنھیں میں لکھنا چاہتا تھا مگر عام مقالہ ومضمون میں ان کے لئے کیا طرز واسلوب اختیار کروں؟ یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، اللہ نے یہ مشکل مکتوب کی شکل میں آجانے کی وجہ سے حل کردی، **وللہ الحمد**

اس مکتوب کے مضامین اصلاً مدارس عربیہ اسلامیہ کے حضراتِ اساتذہ ومعلمین کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے ہیں، لیکن ان کی افادیت مسلمانوں کے ہر طبقہ کے لئے عام ہے، اساتذہ بھی، اہل انتظام بھی، طلبہ بھی، اور دین سے محبت رکھنے والے حضرات بھی، سب ان شاء اللہ اپنے حق میں اسے مفید پائیں گے۔

پہلے یہ ماہنامہ ضیاء الاسلام میں شائع ہوا، اس کے بعد میرے محترم اور صاحب علم

وفضل دوست مولانا قاری شبیر احمد صاحب دربھنگوی مہتمم مدرسہ اسلامیہ شکرپور، بھرواڑہ ضلع دربھنگہ نے اپنے ادارہ سے رسالہ کی شکل میں شائع کیا، اب جبکہ مدارس اسلامیہ کا دوسرا ایڈیشن شائع ہورہا ہے، خیال ہوا اسے اس کے ساتھ شائع کردیا جائے تاکہ اس کی افادیت مزید عام ہوجائے۔

یہ مکتوب ایک پرانے تجربہ کار خادم علم دین کی طرف سے، ان نوآموز حضرات کی خدمت میں ایک خصوصی تحفہ ہے، جو ابھی خدمت دین علم کے میدان میں نووارد ہیں، یا اس میدان میں اترنے کی تیاری کررہے ہیں، خدا کی ذاتِ عالی سے امید ہے کہ اس کے ذریعے سے ان حضرات کے لئے آگے بڑھنے کا صحیح رخ متعین ہوگا، اور یہ حضرات دین اور علم دین کی خدمت کرکے دنیا میں بھی سرخروئی حاصل کریں گے، اور آخرت کے بلند درجات بھی انھیں حاصل ہوں گے۔ میرا تجربہ ہے، اور دوسروں کی زبانی بھی بارہا سننے میں آیا، اور خود قرآن وحدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ آدمی کے مشاغل ومصروفیات میں افضل ترین اور مفید ترین مصروفیت تدریس کی ہے، اس کے ذریعے سے دنیا میں جو وقار ملتا ہے اور جو عزت حاصل ہوتی ہے، اس کے سامنے دوسری تمام عزتیں ہیچ ہیں۔ سچے بے لوث محبت کرنے والے، خدمت کرکے شکر گزار ہونے، استاذ کی خوشی کو متاعِ زندگی سمجھنے والے مخلص افراد جتنے اس دائرۂ عمل میں ملتے ہیں اور کہیں نہیں ملتے، اور آخرت کی آبرو تو مقصود ہے وہ بھی اس راہ سے بدرجۂ کمال حاصل ہوگی، ان شاء اللہ

لیکن واضح ہو کہ ہمارا موضوعِ گفتگو علم دین ہے، علم دنیا نہیں۔

یا اللہ! اپنے فضل وکرم سے اس کے مرتب، اس کے مخاطب اور اس کے قاری سب کو اپنی خاص نگاہِ رحمت سے نواز دیجئے۔ علم دین کی روشنی کو عام فرمادیجئے، اور جو لوگ اس روشنی کے حامل اور امین ہیں انھیں اپنی خاص بارگاہ میں باریابی بخشئے، اور پیغمبر ﷺ کے نقش پر چلائیے، اور اس پر استقامت عطا فرمائیے، آمین یارب العالمین

اعجاز احمد اعظمی

۱۵؍رجب ۱۴۳۰ھ

◆ ◆ ◆ ◆ ◆

منصبِ تدریس اور حضراتِ مدرسین

الحمدللّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد
وآلہ وصحبہ اجمعین، اما بعد

فرزندِ عزیز! **وفقنی اللہ وإیاک لمایحبه ویرضاه**

السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاته

تمہاری اور ہماری حیات کتنی ہے، اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے، زندگی کا جو حصہ گزر گیا، اسے ہم نے جان لیا اور جو آنے والا ہے وہ نامعلوم ہے، جو وقفہ گزر کر ماضی بن گیا، وہ زندگی کا ایک مرحلہ تھا، یہ مرحلہ رسمی طالب علمی کا تھا، رسمی اس لئے کہ علم ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے، اس کی طلب سے کوئی بھی عالم کبھی فارغ نہیں ہوسکتا، جتنا وہ سیکھ چکا ہوتا ہے اسی کی روشنی میں دیکھتا ہے، کہ ابھی بہت کچھ ہے جو اس کے احاطۂ علم سے باہر ہے، اس لئے اگر وہ علم کا شائق ہے اور اس کی کسی حد پر قناعت کر کے بیٹھ جانے والا نہیں ہے تو وہ ہمہ دم گرمِ جستجو رہتا ہے، اور جہاں تک پہونچتا ہے اس کی نگاہِ جستجو آگے کی طرف لگی رہتی ہے

ہم وہ رَہرو ہیں کہ چلنا ہی ہے مسلک جن کا

امام دارمیؒ نے حضرت حسن بصری علیہ الرحمہ کا ایک ارشاد نقل کیا ہے، فرماتے ہیں: **منهومان لایشبعان ،منهوم فی العلم لایشبع منه ومنهوم فی الدنیا لایشبع منها ۔** (سنن دارمی، **باب فی فضل العلم والعالم**) دو حریص ایسے ہیں

جو کبھی آسودہ نہیں ہوتے، ایک علم کا حریص کہ اس سے کبھی سیر نہیں ہوتا، ایک دنیا کا حریص کہ وہ بھی کبھی آسودگی نہیں پاتا۔

امام دارمی نے یہ ارشاد حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کا بھی نقل کیا ہے۔

غرض یہ کہ حقیقی طالب علمی تو تادم رخصت قائم رہتی ہے، لیکن رسمی طالب علمی جو کہ عبارت ہے ہر مشغلہ سے یکسو ہو کر تحصیل علم میں مشغول ہونے، اساتذہ کے حضور میں زانوئے ادب تہ کرنے اور تعلیم وتدریس کے مخصوص ماحول میں سمٹے رہنے سے، وہ مرحلہ اب اختتام کو پہونچا۔

اب تمہاری طالب علمی ایک دوسرے مرحلے میں داخل ہوئی ہے، یہ ہے تعلیم وتدریس کا مرحلہ! یہ مرحلہ پہلے مرحلے سے زیادہ نازک، اور ذمہ داریوں کے ساتھ زیادہ گرانبار ہے، ان نزاکتوں، ذمہ داریوں کو سمجھنا اور نبھانا ایک مشکل عمل ہے، مگر اللہ تعالیٰ جس کے لئے آسان فرمادیں۔

تم نے پوچھا ہے کہ اس مرحلہ میں تمہیں کیا طریقۂ کار اختیار کرنا چاہئے کہ دنیا میں بھی سرخرو رہو اور آخرت میں بھی فلاح حاصل ہو، اس سوال کا جواب میں تمہیں تفصیل سے دوں گا، میں رسمی طالب علمی کے بعد تعلیم وتدریس کے مرحلے میں ۱۳۹۱ھ کے آغاز سے داخل ہوں، کچھ دن اس طرح گزرے کہ میں طالب علموں کو پڑھاتا تو ضرور تھا، مگر وہ کسی مدرسہ کی ضابطہ کی مدرسی اور ملازمت نہ تھی، یہ سلسلہ کم وبیش ڈیڑھ سال رہا، اس وقفہ میں مَیں تھا اور میرے طلبہ تھے، اور کسی تیسرے کا اس میں دخل نہ تھا۔

ایک قلیل وقفہ چند ماہ کا ایسا بھی گزرا، جب میں ایک مدرسہ میں مدرس ہوا، مگر بطور ملازمت کے نہیں بلکہ اعزازی طور پر، پھر ۱۳۹۳ھ کے اواخر سے باقاعدہ ایک مدرسہ میں ملازمت اور تنخواہ والی تدریس کا آغاز ہوا۔

میں دورِ طالب علمی میں مکتبی تعلیم کو مستثنیٰ کر کے چھ برس عربی مدارس کی چہار

دیواری میں رہا ہوں، پھر ڈیڑھ دو سال کے وقفہ کے بعد اڑتیس سال سے مسلسل مدرسوں میں ہوں، طالب علمی تین مدرسوں میں بسر ہوئی، مدرسی چار مدرسوں سے ہوتی ہوئی پانچویں مدرسے میں بیس سال پورے کر چکی ہے، تجربہ اور آزمائش کا ایک خاصا طویل وقفہ گزار چکا ہوں، اس عرصہ میں جو کچھ پڑھا، پڑھایا، دیکھا، لوگوں کو برتا، مختلف سرد وگرم مرحلوں سے گزرا، تلخ وشیریں معاملات کا تجربہ کرتا رہا، انھیں قرآن وحدیث اور اسلاف کی سیرتوں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی، تو مزاج وطبیعت کا خاص رنگ بن گیا ہے، اسی رنگ ومزاج کے تحت کچھ باتیں، کچھ تجربے، کچھ نصیحتیں لکھتا ہوں، شاید تم کو کچھ نفع ہو، کام کرنے کی راہ کھلے، اور شاید میرے لئے بھی نافع ہو۔ **لعل اللہ**۔۔۔۔

کیا تدریس ذریعۂ معاش ہے؟

تم رسمی طالب علمی سے فارغ ہو کر تدریس کے لئے مدرسہ میں قدم رکھ رہے ہو، تو یہ بات کبھی سوچی کہ مدرسہ میں تدریس کی خدمت کے لئے قدم رکھنا کیا عبادت ہے؟ کیا یہ تمہارا دینی فریضہ ہے؟ یا یہ ایک ذریعۂ معاش ہے؟ جس سے تم اپنی، اپنے گھر والوں اور اپنے والدین کی روزی مہیا کرو گے، ان کی خدمت کرو گے؟ تم نے مدرسہ میں رہ کر جو علوم حاصل کئے ہیں، اور ان کے جو فضائل وامتیازات اساتذہ سے اور علماء سے سنے ہیں ان کا حاصل اور تقاضا یہ ہے کہ علم دین کی تعلیم وتدریس ایک خالص دینی اور عبادتی کام ہو، تم نے سنا ہوگا، بلکہ تم نے دوسروں سے کہا بھی ہوگا کہ تعلیم دین اور تعلیم قرآن بجائے خود ایک دینی فریضہ ہے، یہ دنیاوی اجرت اور مزدوری سے بے نیاز بلکہ برکنار ہے۔ متقدمین اکابر سلف نے اس کو جائز نہیں رکھا ہے، احادیث میں اس کے اشارے بھی ملتے ہیں، بلکہ صراحت بھی ہے، البتہ متاخرین نے ضرورت کی بنیاد پر اس کی اجازت دی ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ تعلیم وتدریس کو معاش سے نہ جوڑا جائے، چنانچہ عہد سلف میں اور اس کے بعد دنیا میں انگریزوں

کے تسلط سے پہلے اصحاب علم کے درمیان عام فضا یہی رہی ہے کہ لوگ للہ فی اللہ طالبان علوم نبوت کی خدمت کرتے تھے، ان میں بعض ممتاز اہل علم ودین کے لئے مسلمان حکومتوں کی جانب سے کچھ جاگیریں عطا ہوتی تھیں، کچھ وظائف کبھی مل جاتے تھے، مگر تعلیم وتدریس کا مشغلہ ان کے لئے ذریعۂ معاش نہ ہوتا، تعلیم وتعلم کا طور اس دور میں عموماً یہی ہوتا۔ بعض علماء سرکار ودربار کی ملازمت اختیار کرتے، بعض اوقاف سے مستقل وظیفہ یاب ہوتے، اہل تدریس میں ان کی تعداد کم ہوتی، اور جو لوگ ملازمت ووظائف کی طرف رُخ کرتے وہ بیشتر اپنا علمی ودینی وزن مسلمانوں کے قلوب سے کھو دیتے، قدر ومنزلت انھیں مدرسین کی ہوتی جو اجرت اور مزدوری سے کنارہ کش ہوکر علم اور دین کی خدمت کرتے اور انھیں کا فیض عام بھی ہوتا، میرے اس اجمال کو چاہو تو تاریخ اور تذکروں کے اوراق میں ڈھونڈھ سکتے ہو۔

انگریز اور انگریزی تہذیب کا سیلاب دنیا میں آیا، تو اس نے تمام پچھلی اچھی قدروں پر ہلہ بول دیا، اس تہذیب میں آخرت اور جنت دوزخ کا کوئی تصور چونکہ نہیں ہے اس لئے اس نے تمام اعمال وخدمات کو معاش کے ساتھ جوڑ دیا، اور چونکہ اس ''عاجلہ'' میں فوری سود وزیاں کا مسئلہ ہے، اس لئے دین سے دور اور کمزور طبیعتیں اس پر ٹوٹ پڑیں، اس تہذیب کی بدتہذیبی کا اثر یہ ہوا کہ ہر وہ کام اور ہر وہ خدمت جس سے کوئی معاشی نفع وابستہ نہ ہو، قطعاً لائق التفات نہیں رہا، ہمارے موجودہ دور میں ''معاشی اکتساب'' کی وہ حکمرانی ہے کہ آدمی کسی میدان میں اسی وقت قدم رکھتا ہے جب یہ اطمینان کرلیتا ہے کہ کامیاب ہوگا جب بھی معاش کا انتظام ہوگا اور ناکام ہوگا جب بھی معاش کی راہ کھلے گی، مال ودولت کمانے کی جو دوڑ اس عہد میں چل رہی ہے، ہم لوگ اس کا تصور نہیں کرسکتے۔

پیغمبروں اور انبیاء **صلوات اللہ وسلامہ علیہم** نے اپنی قوموں سے ایک بات کہی تھی: **وماأسئلكم عليه من أجرٍ إن أجرى إلا على الله** (میں تم سے کسی بدلے کا سوال نہیں کرتا، میرا معاوضہ تو اللہ کے حوالے ہے) انبیاء کا یہ فرمان قطعاً نظر انداز

کر دیا گیا، اب تمامتر معاوضہ اسی دنیا میں اور لوگوں ہی سے چاہئے۔

انگریزوں کی خدا فراموشی نے ہر ایک کو معاش کی چوکھٹ پر سجدہ ریز کر دیا، مادہ پرستی کے اس دور بھی میں آخرت کے اجر وثواب کے امیدوار بہت تھے، لیکن ظلمت کا سایہ آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ میں تمام دنیا کی بات نہیں کرتا، ہندوستان میں علماء ختم ہو رہے تھے، ان کی درسگاہیں ویران ہو رہی تھیں اور جو طوفان اٹھ چکا تھا اور اس کا دائرہ بڑھ رہا تھا، دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ بہت جلد علم دین، جس کی بنیاد ’’اجر آخرت‘‘ پر ہے، فراموشی کی نذر ہو جائے گا۔

اللہ کی حکمت بالغہ کو دین اور علم دین کا تحفظ منظور تھا، ایک ایسی تدبیر قلوب پر القاء ہوئی کہ علم دین بھی باقی رہے اور اس کی بنیادی اینٹ یعنی **إن أجری إلا علی اللہ** بھی باقی رہے، اور معاش کا مسئلہ بھی قدرے اسی راہ سے حل ہو جائے۔

چنانچہ دار العلوم دیوبند کے طرز کے مدارس الہام ہوئے، ان مدارس میں تعلیم کی بنیاد خالصۃً للہ رہی، لیکن پڑھنے پڑھانے والوں کی معاش کا بھی قدرے انتظام کر دیا گیا۔ اور اس کے لئے ان مدارس کو عوامی حلقوں کے ساتھ مربوط کر دیا گیا، مسلمانوں کی حکومت ختم ہو رہی تھی، نئی حکومت وہی تھی جس کے جلو میں یہ تمام دُنیوی طوفان چل رہے تھے۔ ان حکومتوں سے تو امداد نہیں لی جاسکتی تھی، عوامی حلقوں سے حصول خیر کا انتظام کیا گیا اور علم دین کی بقاء وتحفظ کی راہ ہموار کی گئی۔

مدارس میں تنخواہ کی شکل میں جو معاش کا انتظام کیا گیا تھا، وہ ایک ناگزیر ضرورت تھی، اصل مدار اللہ کے لئے تدریس وتعلیم پر تھا، چنانچہ مدارس کی ابتداء میں بکثرت ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ اہل انتظام ایک مدرس کی تنخواہ بڑھانا چاہتے ہیں اور وہ مدرس انکار کر رہا ہے، اور اضافہ کو قبول نہیں کیا۔

تمہیں حیرت ہوگی، ایسے مخلصین کو میں نے بچشم خود بھی دیکھا ہے، بڑے اکابر کی بات نہیں کرتا۔ ایک غیر معمولی نہیں، معمولی مولوی ایک مسجد میں امام ہے، مسجد سے ملحق ایک

مکتب ہے، اس میں تعلیم بھی دیتا ہے، اور تنخواہ کل سو روپئے ہے، یہ آج کی تاریخ سے چالیس سال قبل کی بات ہے، اس مولوی کے انتظام اور تعلیم کی برکت سے مدرسہ کا چندہ خاصا بڑھ گیا، اہل انتظام نے اس امام اور مدرس کی عدم موجودگی میں مشورہ کر کے تنخواہ ڈبل کر دی، جب وہ امام آیا تو اسے معلوم ہوا، اس نے سب اہل مشورہ کو جمع کیا، اور معذرت کر دی کہ میرے لئے وہی تنخواہ بھاری پڑ رہی ہے، میں اپنے کو اور بوجھل کیوں کروں؟

لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، قلوب سے یہ اثر کمزور ہوتا گیا، سامنے سرکاری اور انگریزی مدرسوں کا متوازی نظام بھی چل رہا ہے، جس کا سارا لب لباب تحصیل معاش ہے، ان میں اساتذہ بڑی تنخواہیں پاتے ہیں، اتنی بڑی کہ دینی مدارس کا ایک مدرس پورے سال میں جتنی تنخواہ پاتا ہے، کالج کا ایک لیکچرر اور پروفیسر اس سے زیادہ تنخواہ ایک ماہ میں سمیٹ لیتا ہے، پھر سرکار دربار نے ایک دام ہمرنگ زمین اور پھینکا، ان دینی اور عربی مدارس کو امداد و تعاون سے نوازا، اور یہ مدارس تعاون لے کر محض ذریعۂ معاش بن کر رہ گئے۔ ان تعاون زدہ مدارس سے دین کی روح تو نکل گئی، یا بہت کمزور پڑ گئی، البتہ معاش کی جہت قوی ہو گئی، پہلے مدارس کی تنخواہ ایک ناگزیر ضرورت تھی، اب وہ مقصود و معاش بن گئی ہے۔

اب رہ گئے وہ مدارس جو حکومت کے تعاون سے برکنار ہیں، وہ ابھی تک دین کو اور علم دین کو ایک حد تک سنبھالے ہوئے ہیں، ان میں تنخواہ کی اب بھی وہی ''ناگزیری'' حیثیت برقرار ہے، لیکن باہر کی گرم گرم ہوائیں یہاں بھی داخل ہو رہی ہیں اور یہاں کے دینی واخروی جذبات کو جھلس رہی ہیں، اب کتنے طلبہ ہیں جو طالب علمی سے فراغت پا کر معاش ہی کے لئے ان مدارس میں داخل ہوتے ہیں، معاش کے اس تصور اور نظریے نے مدرسوں میں اہل انتظام کے لئے مالکانہ حیثیت اور اساتذہ کے لئے ملازمانہ ذہنیت کا نظریہ ابھارا، اور اس کی پرورش کی۔ اس نظریہ نے مدارس میں تین فریق پیدا کر دئے، حالانکہ یہ تینوں باہم رفیق ہیں، اور ان کی رفاقت سے بہت عمدہ نتائج کی توقع ہے، ایک فریق دفتر

اہتمام ہے، دوسرا فریق اساتذۂ کرام ہیں، تیسرا فریق وہ لوگ ہیں جو مدرسے کے انتظام سے متعلق خدمات میں ہیں، جیسے منشی، سفیر، باورچی، چپراسی وغیرہ، اور پھر ان تینوں سے جڑا ہوا ایک حلقہ طلبہ کا ہے، جو عام حالات میں مناسب ماحول پاتا ہے، تو تعلیمی دلچسپیوں میں لگا رہتا ہے، لیکن بعض مخصوص حالات میں یہ بھی فریق بن جاتا ہے، خیر اس موضوع پر گفتگو بعد میں ہوگی، ان شاء اللہ

اسی پس منظر میں مَیں نے پوچھا ہے کہ تم نے کیا سوچا ہے؟ علم اور دین کی خدمت کو مقصد بنا کر تدریس کے میدان میں قدم رکھا ہے؟ یا اسے تم ذریعۂ معاش سمجھ رہے ہو؟

اب میری سنو! تم کو معلوم ہے کہ میں اپنی طالب علمی کے آخری مرحلہ میں بعض ناگفتنی احوال میں مبتلا ہوگیا تھا، ان احوال کا میرے اوپر اتنا شدید تاثر تھا کہ میں سوچنے لگا تھا کہ اب مدرسہ میں واپس نہیں ہونا ہے، اس سوچ کے بعد قدرتی بات تھی کہ مجھے سوچنا تھا کہ معاش کے لئے مجھے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے، میں نے اس سلسلے میں مسلسل ڈیڑھ سال تک استخارہ کیا، اور نتیجہ یہ نکلا کہ روزی حاصل کرنے کے تمام دُنیوی ذرائع سے دل اچاٹ ہوگیا۔ اسی دوران ایک صاحب دل اور صاحب نسبت بزرگ سے مشورہ لیا، تو انھوں نے نہایت قطعیت سے فرمایا کہ آپ مدرسہ میں لوٹئے، پھر میری طبیعت یکسو ہوگئی، اور مشیت الٰہی نے مجھے ایک مدرسہ میں پہونچا دیا۔

جب ارادے کا انتشار ختم ہوا، اور مدرسہ میں جانا عزم بن گیا، تب میں نے فکر معاش کو بھی دل سے نکال دیا۔ مدرسہ میں داخل ہونے کا مقصد یہ ٹھہرایا کہ دین اور علم دین کی خدمت کرنی ہے، عام دستور کے مطابق کچھ نہ کچھ تنخواہ تو ملے گی، وہ معاش کی ایک مدد ہوجائے گی مگر نہ وہ مقصود ہوگی، نہ مطمح نظر! مجھے دین کی خدمت کرنی ہے، تنخواہ ہو یا نہ ہو! کم ہو یا زیادہ ہو! اپنی زبان سے نہ تنخواہ کا مطالبہ کروں گا نہ دل اس پر لگاؤں گا۔ مدرسہ میں نہ میں ملازم ہوں گا، نہ حاکم ہوں گا، صرف دین اور علم کا خادم رہوں گا۔ ’’حیلۂ روزی‘‘ تنخواہ کی

شکل میں ہوگی، کافی یا ناکافی، اس سے بالکلیہ قطع نظر، پھر جو کچھ ضرورت ہوگی بجائے کوئی دنیوی ظاہری ذریعہ اختیار کرنے کے محض رزاق مطلق سے دعاء والتجا کروں گا، اس عزم وارادہ کے ساتھ مدرسہ میں قدم رکھا، اب مدرسہ میں اڑتیسواں سال پورا ہونے کو ہے، بحمد اللہ میرے اس عزم وارادہ کو اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل رہی، جب میں مدرسہ میں داخل ہوا تھا، تو بہت ہلکا پھلکا تھا، اب ایک وسیع وعریض کنبہ میرے ساتھ ہے، لیکن کبھی نہیں ہوا کہ میں نے کسی خاص تنخواہ کا تقاضا کیا ہو، یا زبان وقلم سے کبھی تنخواہ مانگی ہو، یا تنخواہ بڑھانے کا کبھی تصور کیا ہو، لیکن اپنے پروردگار کا کس زبان سے شکر ادا کروں کہ انھوں نے تمام کارِ دنیوی کو سہل فرمایا، اور خدمت دین کے لئے فارغ رکھا۔ روزی کی الجھن کبھی دامن گیر نہیں۔

اپنی آپ بیتی میں نے مختصراً اس لئے لکھ دی کہ تمہارے لئے بھی راستہ کھلے، اب پھر سنو! مدرسہ میں داخل ہوئے ہو، تو مقصد صرف خدمت دین اور خدمت علم دین کو بناؤ، مدرسہ والے دستور کے مطابق کچھ نہ کچھ تنخواہ دیں گے، اس تنخواہ کو اپنا حق مت سمجھو، محض عطیۂ الٰہی سمجھو، اور یہ یقین کرو کہ تمہاری روزی جو حق تعالیٰ کی طرف سے متعین ہو چکی ہے اس کا ایک حصہ اہل مدرسہ کی طرف سے تمھیں مل رہا ہے، یہ اتنا حصہ نظر آرہا ہے، باقی غیب میں ہے، اور غیب کی چیز شہود سے زیادہ قطعی اور یقینی ہے، کیونکہ مومن کے ایمان کا تمامتر مدار غیب ہی پر ہے، پس جو کچھ غیب میں ہے اسے یقینی سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے اس کا سوال کرو، دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے نکلے ہیں تو ایک لمبی مسافت طے کر کے مدین پہونچے تھے، تھکے ماندے، اجنبی جگہ، اجنبی لوگ، مگر دو عورتیں خدمت کی محتاج تھیں انھوں نے ان کی خدمت کر دی، اور بہت اچھی طرح خدمت کی، لیکن ان سے اس خدمت کے معاوضہ کا تصور تک نہ کیا، وہ اپنی بکریاں لے کر چلی گئیں، اور موسیٰ علیہ السلام ایک سایہ دیکھ کر اس میں چلے گئے، مدین والوں سے کچھ نہیں فرمایا کہ مسافر ہوں، بھوکا ہوں وغیرہ! بلکہ اللہ کی طرف متوجہ ہو کر فرماتے ہیں: رَبِّ إِنِّی لِمَا أَنْزَلْتَ إِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ، اے میرے رب! جو کچھ آپ

نے مجھ پر نازل فرمایا ہے میں اس کا محتاج ہوں۔ دیکھو موسیٰ علیہ السلام کو یقین ہے کہ میرے لئے خیر اتر چکا ہے، گو میں دیکھ نہیں رہا ہوں، وہ غیب میں ہے، مگر اے پروردگار اسے اپنے پاس دیکھنا چاہتا ہوں، اسی طرح تم دیکھو کہ بقدر تنخواہ روزی تمہیں دکھائی دے رہی ہے، اور باقی غیب میں ہے، اسے شہود بننے کی دعا کرتے رہو۔

مدرسہ میں صرف مدرس اور معلم بن کر داخل ہو، نہ ملازم اور کاروباری! یہ معلّمی کیا ہے؟ اور معلم کو کیسا ہونا چاہئے؟ اسے میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں، اس کے تقاضوں کو کیونکر پورا کیا جائے، اب میں اپنی آپ بیتی ہٹاتا ہوں اور تمہیں امام غزالی علیہ الرحمہ کی خدمت میں لے چلتا ہوں، انھیں سے سنا جائے، وہ اسرارِ شریعت کے ماہر ہیں، ان کی بات سند ہوگی، انھیں کے ارشادات کی روشنی میں دورِ حاضر کے دینی تعلیمی احوال اور مشکلات کا حل بھی تلاش کیا جائے گا۔

امام غزالیؒ کی مجلسِ احیاء العلوم قائم ہے، وہ اس میں فرما رہے ہیں، پوچھنے والو! سنو: جب آدمی علم حاصل کرتا ہے، تو اس کے چار مرحلے ہیں، جیسا کہ تحصیل مال کے بھی چار مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ کمائی اور تحصیل مال کا ہے، دوسرا مرحلہ مالدار ہوجانے کا، تب وہ دوسروں سے مستغنی ہوجاتا ہے، اسے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑتا، تیسرا مرحلہ اپنے اوپر خرچ کرنے کا ہے، یعنی مال سے فائدہ اٹھانے کا، چوتھا مرحلہ یہ کہ اسے دوسروں پر بھی خرچ کرتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ سخی اور فیاض ہوجاتا ہے، یہ آخری مرحلہ افضل ترین مرتبہ اور مقام ہے۔

یہی حال علم کے باب میں بھی ہے۔ پہلا مرحلہ تحصیل علم کا ہے، جس کا نام طالب علمی ہے، دوسرا مرحلہ عالم ہونے کا ہے کہ وہ طالب علمی سے فارغ ہوگیا، اس مرحلے میں وہ سوال کرنے سے بے نیاز ہوجاتا ہے، تیسرا مرحلہ غور و تدبر کا ہے کہ وہ اپنے علم سے خود منتفع ہورہا ہے، چوتھا مرحلہ اپنے علم کو دوسروں تک پہونچانے اور اس کی تعلیم دینے کا ہے، یہ معلّمی

اور مدرسی کا مرحلہ ہے، اور یہ اشرف ترین مقام ومرتبہ ہے۔

جس نے علم حاصل کیا، اس پر عمل کیا، اور دوسروں کو تعلیم دی، یہی وہ ہے جس کے بارے میں مَیں پہلے بتا چکا ہوں کہ وہ آسمان کے غیبی عالم میں فرشتوں کے درمیان ''عظیم'' کے لقب سے معروف ہوتا ہے، یہ ارشاد سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے، یہ شخص سورج کی مانند ہے کہ خود بھی روشن ہے، اور دوسروں کو بھی روشن کرتا ہے، اور مشک کی طرح ہے کہ وہ خود بھی خوشبودار ہوتا ہے، اور دوسروں کو بھی معطر کرتا ہے۔

جو شخص مدرسی اور معلّمی کے منصب پر قائم ہوا، اس نے بہت اہم اور عظیم ذمہ داری سنبھالی، اور بڑا نازک کام اپنے سر لیا، اسے معلّمی کے آداب ووظائف کا بہت اہتمام کرنا چاہئے۔

معلم کے فرائض

دیکھو! امام غزالیؒ فرمارہے ہیں کہ معلم ومدرس کے فرائض اور اس کے وظائف وآداب آٹھ ہیں، ان آٹھوں کا وہ لحاظ رکھے گا تو کامیاب مدرس ہوگا، حق تعالیٰ اسے قبولیت سے نوازیں گے، اس کے شاگردوں کے واسطے سے اس کا فیض عام ہوگا، اور پورے ماحول ومعاشرے میں اس کی برکتیں پھیلیں گی۔ تفصیل سنو!

پہلا فریضہ

شفقت ایسی، جیسی اولاد پر ہوتی ہے

سنو! رسول اللہ ﷺ اس امت کے پہلے معلم ہیں، آپ کا ارشاد ہے، فرماتے ہیں:
إنما أنا لكم مثل الوالد لولده (ابوداؤد والنسائی وابن ماجہ وابن حبان من حدیث ابی ہریرۃ) میں تمہارے حق میں ایسا ہی ہوں جیسا باپ اپنے بیٹے کے حق میں ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی امت کو جہنم کی آگ سے بچانے کی سعی بلیغ کرتے ہیں، والدین اولاد

کو دنیا کی آگ سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں، اس سے کہیں بڑھ کر وہ محنت ہے جو آخرت کی آگ سے بچانے کی ہے، اسی لئے استاذ کا حق والدین کے حق سے بڑھ کر ہوتا ہے، والدین دنیوی وجود اور فنا ہو جانے والی زندگی کے سبب ہیں اور استاذ ہمیشہ کی زندگی کا باعث ہے، اگر استاذ و معلم نہ ہوتا، تو والدین کی وجہ سے جو وجود ملا ہے وہ دائمی ہلاکت کے گڈھے میں گرا سکتا ہے، معلم کی وجہ سے اسے دائمی اخروی زندگی ملتی ہے، لیکن اس استاذ سے وہ استاذ مراد ہے جو علوم آخرت اور علوم دین کا معلم ہے، اور وہ بھی آخرت کے قصد و ارادے سے، یہ نہیں کہ وہ حصولِ دنیا کی غرض سے علوم آخرت کی معلّمی کر رہا ہو۔ اگر دنیا کی غرض سے وہ علوم دین کی معلّمی کر رہا ہے تب تو وہ خود ہلاک ہو رہا ہے، اور دوسروں کو بھی ہلاک کر رہا ہے۔ (احیاء العلوم، ج:۱، ص:۵۵)

میں چاہتا ہوں کہ یہاں معلم کے پہلے فریضے ''شفقت'' کی قدرے تشریح و توضیح کردوں، تاکہ بات واضح ہو جائے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ **إنما بعثت معلماً** (ابن ماجہ و دارمی) میں تو بھیجا ہی گیا ہوں معلم بنا کر، اور یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کا طریقہ اور سنت سب کے لئے معیار ہے، پس معلّمی کے اندر بھی آپ ہی کا طریقہ معیار ہے، اب ہمیں دیکھنا ہے کہ معلم کی حیثیت سے آپ کا برتاؤ اپنے تلامذہ کے ساتھ کیسا تھا؟

اس کا جواب اصولی طور پر یہ ہے کہ انسانوں کے ساتھ آپ کے برتاؤ اور سلوک میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں اور روشن ہے، وہ آپ کی شفقت و مہربانی ہے، زندگی کے کسی بھی مرحلہ میں تم رسول اللہ ﷺ کو دیکھو گے، تو آپ کی شفقت اور عنایت کی جلوہ گری ہر جگہ عیاں ہوگی، کہیں سخت گیری کا شائبہ بھی نہ ہوگا، شاگرد کی سہولت، اس کے ساتھ نرمی، اس کی خیر خواہی، علم سے اس کو معمور کر دینے کا جذبہ اور خیال ہمہ وقت دکھائی دے گا، خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ** (سورۂ آل عمران:۱۵۹) یہ اللہ کی خاص رحمت ہے کہ تم ان کے حق میں نرم مزاج ہو۔ اور دوسری جگہ فرمایا: **لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ**

مِنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ ○ (سورہ توبہ: ۱۲۸)۔

تمہارے پاس تمھیں میں سے ایک رسول آیا ہے جس پہ تمہاری تکلیف کی چیزیں گراں ہیں اور تمہارے اوپر وہ بڑا حریص ہے اور مومنین پر وہ بہت مہربان اور رحم وکرم کا مجسمہ ہے۔

اس شفقت ومہربانی کے کچھ جلوے دیکھتے چلو، ایک نوجوان صحابی مالک بن الحویرث ؓ ہیں، وہ مدینہ کے باہر سے حاضر خدمت ہوئے تھے، انھیں کی زبانی واقعہ سنو، فرماتے ہیں کہ:

> ”ہم چند افراد رسول اکرم ﷺ کی خدمت مبارکہ میں حاضر ہوئے، ہم سب ہمسن نوجوان تھے، ہم بیس رات آپ کی خدمت میں رہے، رسول اللہ ﷺ نہایت مہربان اور نرم دل تھے، اس دوران آپ کو خیال ہوا کہ ہمیں اپنے گھروں کا اشتیاق ہو رہا ہے، تو آپ نے ہم سے دریافت فرمایا کہ تمہارے پیچھے کون کون افراد گھر پر ہیں؟ ہم نے بتایا تو آپ نے ازخود فرمایا کہ تم اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ اور وہیں رہو، انھیں یہاں کی باتیں سکھاؤ اور انھیں حکم دو، اور جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے، ایسے ہی نمازیں پڑھو، جب نماز کا وقت ہو، تو ایک آدمی اذان کہے اور تم میں جو بڑا ہے وہ امامت کرے (بخاری ومسلم)

یہ رسول اللہ ﷺ کی شفقت ومہربانی تھی اپنے تلامذہ پر! کہ ازخود ان کے جذبات وخیالات کو محسوس کیا، اور ایک مناسب انداز میں ان کی طبیعت کا عندیہ معلوم کیا، اور پھر مناسب نصیحتوں کی سوغات دے کر رخصت فرمایا۔ تم بھی مدرس ہونے جا رہے ہو، اس بات کو ہمیشہ یاد رکھو۔

ایک اور واقعہ سنو کہ غصہ اور اشتعال کے موقع پر حضرت ﷺ کا رویہ کیسا رہا؟ اور آپ کے تلامذہ نے اس سے کیا اثر لیا۔ ایک صحابی ہیں، حضرت معاویہ بن حکم سلمی ؓ، وہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی اقتداء میں نماز پڑھ رہا تھا، ایک آدمی کو چھینک آئی،

میں نے کہا **یرحمک اللہ**، یہ سن کر لوگ مجھے آنکھوں کے اشارے سے تنبیہ کرنے لگے، میں نے کہا کیا بات ہے؟ مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ اس پر لوگوں نے ہاتھوں کو اپنی رانوں پر مارا، تب مجھے احساس ہوا کہ یہ لوگ مجھے خاموش کرنا چاہتے ہیں، پھر میں چپ ہو گیا، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو...... میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، میں نے آپ جیسا بہتر معلم نہیں دیکھا، نہ آپ سے پہلے اور نہ آپ کے بعد...... خدا کی قسم! نہ تو مجھے ڈانٹا، نہ مارا، نہ سخت سست کہا، صرف اتنا فرمایا کہ نماز میں گفتگو کی گنجائش نہیں ہے، یہ صرف تسبیح ہے، تکبیر ہے اور قرآن کی تلاوت ہے! (مسلم شریف: کتاب المساجد)

معلّمی کا معیار یہی ہے کہ طالب علم کا دل بول پڑے کہ میرے استاذ کس قدر شفیق ومہربان ہیں! مہربانی کی یہ خوبصورت یاد تازندگی باقی رہ جائے، اس کے نتیجے میں اچھا تذکرہ باقی رہے، جس کی دعا حضرت ابراہیم ﵇ نے کی تھی، **وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْآخِرِیْنَ** (الشعراء:۸۴) میرا سچا تذکرہ پچھلوں میں باقی رکھئے۔

ایک طالب علم کی رسول اللہ ﷺ کس درجہ رعایت اور دل جوئی فرماتے ہیں، ذرا اس کا ایک نمونہ دیکھو! حضرت ابورفاعہ عدوی ؓ، حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے ہیں، جبکہ آپ خطبہ دے رہے ہیں، انھوں نے پہونچتے ہی کہا کہ یارسول اللہ! ایک پردیسی آدمی آپ کی خدمت میں اپنے دین کے متعلق پوچھنے آیا ہے، اسے نہیں معلوم کہ اس کا دین کیا ہے؟

حضرت خطبہ روک کر ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور ان کے پاس بنفس نفیس تشریف لاتے ہیں، فوراً آپ کے لئے وہاں ایک کرسی لائی گئی، جس کے پائے غالبًا لوہے کے تھے، اس پر آپ بیٹھ کر انھیں ان باتوں کی تعلیم دینے لگے، جو اللہ نے آپ کو بتائی تھیں، پھر اس سے فارغ ہو کر اپنی جگہ لوٹ گئے اور خطبہ پورا کیا۔ (مسلم شریف)

امام نووی لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ مسلمانوں کے لئے

کتنے متواضع اور ان پر کتنے مہربان تھے، واقعی معلم کو سوال کرنے والے کے حق میں ایسا ہی لطف وکرم کرنا چاہئے، اور آپ کا کرسی پر بیٹھنا اس لئے تھا کہ باقی حضرات بھی آپ کا کلام سن سکیں اور آپ کو دیکھ سکیں۔ (شرح النووی)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ معلم، کرسی پر بیٹھ کر تعلیم دے تو درست ہے۔

آپ کی مہربانی اور شفقت کے واقعات بہت ہیں، ان کا احصاء کرنا مقصود نہیں ہے، بس یہ سمجھو کہ طالب علموں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں اصلی اور بنیادی چیز نرمی اور شفقت ہے، تمہیں بعض لوگ یہ کہتے ہوئے ملیں گے کہ طلبہ بہت سرکش ہوگئے ہیں ان کے ساتھ سختی کرنی چاہئے، خوب سمجھ لو یہ بات غلط ہے، طلبہ اگر بگڑے ہوئے ہیں، اور تم نے سختی کی اور ظاہر ہے کہ سختی کرنے میں حدودِ شریعت کا لحاظ باقی نہیں رہتا، تو تم بھی بگڑ گئے، جن کی اصلاح کرنے تم چلے تھے، ان کی اصلاح ہوئی یا نہ ہوئی، تم تو بگڑ گئے، اب کون تمہاری اصلاح کرے؟ میں نے بہت دیکھا ہے کہ لوگ طلبہ کی اصلاح کرنے میں خود بہت بگڑ گئے ہیں، گناہگار ہوئے ہیں، اپنی اصلاح، اپنا اخلاق، اپنی دینی حالت مقدم ہے، اور جب تم درست ہوگے تو امید غالب ہے کہ طلبہ کی بڑی تعداد درست رہے گی۔ یہ تصور ہی دل سے نکال دو کہ طلبہ پر سختی کرنی ہے، سختی کرنے کا حکم موقع کے لحاظ سے کفار اور منافقین پر ہے، طلبہ پر نہیں۔

رسول اکرم ﷺ کی وصیت:

حضرت ابوہارون عبدی کہتے ہیں کہ ہم جب کبھی صحابیٔ رسول حضرت ابوسعید خدری ؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو وہ فرماتے: **مرحباً بوصية رسول الله ﷺ** (آؤ، تمہیں رسول اللہ ﷺ کی وصیت کی خوشخبری ہو۔ **أن النبي ﷺ قال: إن الناس لكم تبع وإن رجالاً ياتونكم من أقطار الارض يتفقهون في الدين فإذا أتوكم**

فاستوصوا بھم خیراً (ترمذی شریف: ابواب العلم) نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ، لوگ تمہارے تابع ہیں، اور لوگ تمہارے پاس ہر طرف سے دین کا علم اور اس کی سمجھ حاصل کرنے کے لئے آئیں گے، تو جب وہ تمہارے پاس آئیں، تو میں تمہیں ان کے ساتھ خیر کی وصیت کرتا ہوں، اسے قبول کرو۔

یہی وجہ ہے کہ حضراتِ صحابہ کے پاس جب کوئی شخص علم کا طالب بن کر آتا، تو وہ اس کا **مرحباً بوصیة رسول الله** ﷺ کہہ کر استقبال کیا کرتے تھے۔

پس جن کے بارے میں اللہ کے رسول کی یہ وصیت ہو، اس کے ساتھ کیسا کچھ برتاؤ ہونا چاہئے؟ جب ایک طالب علم، علم کا طلبگار بن کر مدرسہ میں داخل ہوگیا ہے تو اس سے بدگمان نہ ہونا، کہ وہ یونہی آگیا ہے، نوعمر ہے، ناتجربہ کار ہے، غلطی اس سے ہوگی، مگر اسے دل سے مت گراؤ، بلکہ اسے دل سوزی کے ساتھ نصیحت کرو، اسے اس کے مقصد کی طرف متوجہ کرو، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے قبولیت سے نواز دیں۔

معلم اور مدرس کی ذمہ داری بہت نازک ہے، اور درجہ بھی بہت بلند ہے، مدرس کو کبھی اس فکر سے خالی نہیں ہونا چاہئے کہ اس کی ذمہ داری ادا ہورہی ہے یا نہیں؟ اور جو درجہ حق تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے موعود ہے، اس کا اہل وہ بن رہا ہے یا نہیں؟ دیکھو امام غزالیؒ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: **عَلٰی خلفائی رحمة الله، قیل : ومن خلفاءک قال: الذین یحیون سنتی ویعلمونها عباد الله** (احیاء العلوم، ج:۱، ص:۱۱) میرے جانشینوں پر اللہ کی رحمت ہو، عرض کیا گیا آپ کے جانشین کون ہیں؟ فرمایا وہ لوگ جو میری سنت کو زندہ رکھتے ہیں اور اللہ کے بندوں کو اس کی تعلیم دیتے ہیں۔

کیا شبہ ہے کہ ارشادِ نبوت کے مصداق وہی علماء ہیں، جو تدریس اور تعلیم میں لگے ہوئے ہیں، انھیں کی تعلیم سے سنتیں زندہ ہیں، اور یہی طالب علموں کو طریقۂ رسول سکھاتے

ہیں۔

پس سب سے پہلے انھیں کو اس کا اہتمام چاہئے کہ تعلیم اور طلبہ کے ساتھ برتاؤ میں نبی ﷺ کے طریقہ کو عمل میں لائیں، تا کہ وہ سنت زندہ رہے۔

ایک واقعہ تمہیں اور بتاتا چلوں ، یہ واقعہ صاحب فتح الباری حافظ ابن حجرؒ نے کتاب الزکوٰۃ کے شروع میں طبرانی کی معجم کبیر اور ابن السکن نیز ابو مسلم کجّی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

مغیرہ بن عبد اللہ یشکری کہتے ہیں کہ میرے والد کوفہ گئے ، وہاں مسجد میں داخل ہوئے ، تو قبیلہ قیس کے ایک صحابی جنھیں ابن المنتفق کہا جاتا ہے، بیان کر رہے تھے کہ:

> ”مجھ سے رسول اللہ ﷺ کے احوال و اوصاف کا تذکرہ کیا گیا، تو میں آپ کی ملاقات کے لئے نکلا، میری آپ سے ملاقات عرفات میں ہوئی، میں ہجوم میں گھستا ہوا آپ کے پاس جانے لگا، تو بعض لوگوں نے مجھے ٹوکا کہ ایک طرف ہٹو، اور آپ کے پاس بھیڑ نہ لگاؤ، آپ نے سنا تو فرمایا، اس آدمی کو آنے دو، اسے کوئی ضرورت معلوم ہوتی ہے، میں پھر بھیڑ میں گھسا اور آپ تک پہونچ گیا، اور میں نے آپ کی اونٹنی کی نکیل پکڑ لی، پھر مجھ پر کوئی نہیں خفا ہوا۔ میں نے کہا دو باتیں مجھے پوچھنی ہیں، ایک تو یہ کہ جہنم سے میری نجات کیونکر ہو؟ دوسرے یہ کہ جنت میں مجھے داخلہ کیونکر ملے؟ آپ نے آسمان کی جانب نگاہ اٹھائی، پھر میری طرف رخِ انور سے توجہ فرمائی، اور فرمایا تم نے سوال تو مختصر سا کیا ہے مگر بہت بڑا اور طویل سوال کیا ہے، اچھی طرح سمجھو۔
>
> اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو، فرض نمازوں کا اہتمام کرو، فرض زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کا روزہ رکھو۔

اس واقعہ کو پڑھو اور دیکھو، طالب علم کے ساتھ حضور کی سنت کیا ہے؟ میرے بیان کی حاجت نہیں ہے، اب پھر چلو! امام غزالی کی خدمت میں ، وہ مدرس کا دوسرا فریضہ بیان کر رہے ہیں۔

دوسرا فریضہ

للّٰہ فی اللّٰہ تعلیم دینا

اس کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم دینے میں رسول اللہ ﷺ کی پیروی اس لحاظ سے بھی کرے، کہ تعلیم دے کر اس سے کسی اجرت کا، کسی معاوضہ کا طالب نہ ہو، بلکہ طالب علم سے کسی شکر گزاری کی بھی طلب اور آرزو نہ رکھے، اس کا مقصد صرف قربِ الٰہی اور خوشنودیٔ ربانی ہو، طالب علموں پر اپنا کوئی احسان نہ سمجھے، اگر چہ ان پر احسان تو ہے، لیکن مدرس کو چاہئے کہ اپنے اوپر طلبہ کا احسان سمجھے، کیونکہ انھوں نے اپنے قلوب اور اپنے وجود کو اس کے سامنے پیش کر دیا ہے، تا کہ ان میں علم کا بیج ڈال کر اور علم کی زراعت کر کے، یہ خود اللہ کا قرب حاصل کرے، جیسے کسی نے اپنی زمین کسان کو دے دی، کہ وہ اس میں جوتے بوئے، تو اس سے زمین والے کو جو بھی نفع ہو، مگر کھیتی کرنے والے کو اس سے زیادہ نفع ہوگا، اسی طرح معلم کا نفع متعلم سے زیادہ ہے، اگر طالب علم نہ ہوتا، تو استاذ کو یہ گراں قدر فائدہ کس طرح پہونچتا، جب یہ بات ہے تو تم بجائے کسی اور کے اللہ تعالیٰ ہی سے اجر و ثواب کی امید رکھو، انبیاء علیہم السلام کی ندا ہر ایک کی ایک ہی تھی: **یاقوم لاأسئلکم علیه مالاً إن أجری إلا علی الله**، () اے میری قوم! میں تم سے اپنی اس تبلیغ و تعلیم پر کسی مال کا سوال نہیں کرتا، میرا اجر تو اللہ کے اوپر ہے۔ (احیاء العلوم، ج:۱ص:)

یہی وہ بات ہے جس کو میں نے کہا ہے کہ تعلیم کو ذریعۂ معاش مت بناؤ۔ مدرسہ میں داخل ہونا دورِ حاضر کے لحاظ سے ’’حیلۂ روزی‘‘ ضرور ہے، اور اس سے چارہ بھی نہیں ہے، لیکن مقصد نہیں ہے، مقصد تو علوم الٰہیہ کی بقاء، اس کی نشر و اشاعت اور جب تک دنیا قائم ہے، اس کا نسلاً بعد نسلٍ منتقل کرتے رہنا ہے، تا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو۔

موجودہ نظامِ مدارس کی تنخواہ اور ٹیوشن کا فرق:

تم سوچو گے کہ قرآن نے انبیاء کا اُسوہ بیان فرمایا کہ وہ قوموں سے کوئی مالی معاوضہ نہیں چاہتے، اور احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ علوم دینیہ کی تعلیم پر معاوضہ لینا درست نہیں ہے، پھر یہ تنخواہ کیا ہے؟

میں نے جہاں تک اس موضوع پر غور کیا ہے، مجھے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ایک ہے خود اپنا طالب علم جس کو وہ پڑھاتا ہے، اس سے اجرت لیتا ہے، جیسے ٹیوشن میں ہوتا ہے، یا طلبہ سے فیس لے کر تنخواہ حاصل کی جائے، چنانچہ بعض دنیاوی مدارس میں دستور ہے۔ قرآن وحدیث میں تعلیم قرآن اور تعلیم دین پر اجرت لینے کی جو ممانعت آئی ہے اس کی یہی صورت معلوم ہوتی ہے، چنانچہ جہاں جہاں ممانعت کا تذکرہ ہے، غور کروگے تو یہی صورت حال ہوگی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ حکومت اسلامیہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ علوم دینیہ کی تعلیم کا انتظام کرے، حکومت معلمین کو مقرر کرتی ہے، وہ ان کے وظائف متعین کرتی ہے، چنانچہ امیر المومنین سیّدنا عمر فاروق ؓ نے اپنے دور خلافت میں اس کا منظّم شعبہ قائم فرمایا تھا، خاص خاص صحابۂ کرام کو مختلف بلاد وامصار میں تعلیم کے لئے بھیجا تھا، اور بیت المال سے ان کے وظیفے متعین کئے تھے، اپنے عاملوں اور گورنروں کو فرمان جاری کیا تھا کہ قرآن کی تعلیم کے لئے اساتذہ مقرر کریں، اور انھیں وظیفہ دیں، یہ تعلیم قرآن کا معاوضہ نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ جب انھیں ہر کام سے یکسو کرکے خدمت دین میں لگایا گیا، تو ان کی روزی کا کچھ انتظام ضروری ہے، اسلامی حکومت ہے، تو یہ اس کی ذمہ داری ہے، اور حکومت نہیں ہے تو یہ جماعت مسلمین کی ذمہ داری ہے، حکومت نہ ہو تو جماعت مسلمین اس کے قائم مقام ہے، چنانچہ اقامت جمعہ وعیدین کا مسئلہ، نکاح کے فسخ وتفریق کا مسئلہ وغیرہ جو حکومت کی ذمہ داری ہے، وہ نہ ہو تو جماعت مسلمین اس کی ذمہ دار ہے، اس کی تفصیل حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی مرتب کرائی ہوئی کتاب ’’**الحیلة الناجزة**‘‘ میں دیکھو۔

تو اب جو صورت حال مدارس کی ہے، وہ حکومت اسلامیہ کی عدم موجودگی میں جماعت مسلمین کی ذمہ داری پوری کررہے ہیں، یہ جو مدرسین کو تنخواہ دے رہے ہیں بظاہر اجرت معلوم ہورہی ہے، لیکن فی الحقیقت اجرت نہیں ہے، بیت المال سے وظیفہ ہے، جو مسلمانوں کے عمومی چندے سے مرتب ہوتا ہے، مدرس جس کو پڑھاتا ہے اس سے کوئی مالی معاوضہ نہیں لیتا، اور نہ مدرسہ ہی ان سے کوئی تعلیمی فیس لیتا ہے۔ اس لئے اس صورت پر ممانعت کا اطلاق نہ ہوگا۔

لیکن اب یہ مدرس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی نیت درست کرے، اسے ذریعۂ معاش نہ قرار دے، جو کچھ مل جائے اسے عطیۂ الٰہی سمجھ کر اللہ کا شکر گزار ہو، اس مسئلہ پر اربابِ انتظام سے کوئی کشمکش نہ کرے، یہ اربابِ انتظام کی ذمہ داری ہے کہ وہ وظیفہ بقدر کفایت مقرر کریں، ہر ایک اپنا فرض ادا کرے تو کسی کو شکایت نہ ہوگی۔

تم مدرسے میں اسی نیت سے داخل ہوؤ کہ جو ملا وہ عطیۂ الٰہی ہے اور جو کم پڑ گیا، اس کا سوال اللہ تعالیٰ سے کرو، تنگی ترشی تو نبی کی میراث ہے، روزی قلیل ہو، نیت درست ہو، زہد وقناعت ہو، اللہ سے راضی ہو، تو اس میں اتنی برکت ہوگی کہ ہر کام آسان ہوگا۔ مسلمان کا کام روپیوں کی گنتی سے نہیں ہوتا، برکت اور خداوندی نصرت سے ہوتا ہے، كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ، اذن الٰہی ہو تو تھوڑی سی جماعت، فوج گراں پر بھاری پڑتی ہے۔ پس تنخواہ کا گننا چھوڑو، بسم اللہ کرو اور جو کچھ اہل مدرسہ دیں، اسے ان کے ہاتھ سے نہیں اللہ کے ہاتھ سے لو، اور اپنے فرض منصبی میں منہمک رہو، تمہارے اوپر جو طلبہ کی تعلیم وتربیت کا حق ہے، اسے کما حقہ ادا کرنے کی کوشش کرو، اور جس چیز کی کفالت اللہ نے اپنے اوپر لے رکھی ہے، وہ انھیں کے حوالے رہنے دو، اگر تم نے حق ادا کیا، تو وہ بھی حق ادا کریں گے، وَأُوْفُوْا بِعَهْدِيْ أُوْفِ بِعَهْدِكُمْ، تم میرا عہد پورا کرو، میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔ اور اللہ تعالیٰ جب عہد پورا کریں گے، تو اس میں کوئی کسر باقی نہ رہے گی۔

ہاں یہ ہے کہ اپنے طالب علموں سے اپنی کسی منفعت دنیوی کا تصور نہ کرو، نہ تعریف وتوصیف کی، نہ خدمت کی، نہ کسی معاوضہ کی، اگر وہ تمہاری کوئی خدمت کردیں تو اسے اپنا حق نہ سمجھو، بلکہ ان کا احسان سمجھو، اس کا شکریہ ادا کرو، اس پر انھیں دعائیں دو۔

طالب علموں کی خدمت کا مسئلہ بھی بہت نازک ہے، اس میں بہت احتیاط اور ہوشیاری سے کام لینا، ورنہ جتنا بناؤ گے اس سے کہیں زیادہ بگاڑ دوگے، میں اس مسئلہ کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا، خود سمجھ سکتے ہو، اور تفصیلی جزئیات کے حسن وقبح کا فیصلہ کرسکتے ہو۔

تیسرا فریضہ

طالب علم کی خیرخواہی

امام غزالیؒ فرمارہے ہیں کہ تمہیں طالب علم کی خیرخواہی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرنا چاہئے، جو باتیں اس کے لئے مفید ہیں، انھیں خوب اچھی طرح ان کے ذہنوں میں پیوست کردینا چاہئے۔ اگر کسی کو دیکھو کہ وہ اپنی تعلیم کو دنیوی اغراض، جاہ ومنصب یا مال ومنال کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنارہا ہے تو اسے سمجھاؤ۔

امام موصوف کی یہ بات بہت اہم ہے، ہمارے یہاں مدارس کا جو نظام ہے اس میں دارالاقامہ کی بڑی اہمیت ہے، ہر عربی مدرسہ اپنے ساتھ دارالاقامہ رکھتا ہے، طلبہ اس میں ہمہ وقت مقیم ہوتے ہیں، اساتذہ بھی عموماً مدرسہ کی چہار دیواری میں، دارالاقامہ کے اندر ہی رہتے ہیں، یہ انتظام اور موقع طلبہ کے لئے بھی اور اساتذہ کے لئے بھی ایک عمدہ ترین وقت ہے، طلبہ ہر طرف سے یکسو ہیں، مدرسہ کے انتظام میں ان کے سامنے نہ شکم کا کوئی مسئلہ ہے کہ کھانے سے لے کر ناشتہ تک سب کا انتظام موجود ہے، اور نہ صحت کا کہ بیمار ہوں تو دوا بھی اور ڈاکٹر بھی دستیاب ہوتے ہیں، وہ صرف دینی علوم کے لئے یکسوئی کے ساتھ مستعد اور خالی الذہن ہیں، اساتذہ بھی بیشتر فکر دنیا سے آزاد ہوتے ہیں، اس دینی تعلیم

کی برکت سے، بہت سے ایسے مسائل جو اہل دنیا کے لئے دردِ سر بنے رہتے ہیں، ان سے بڑی حدتک یہ بےفکر ہوتے ہیں، ہاں معیارِ زندگی ان کا وہ نہیں ہوتا جو دنیاداروں کا ہوتا ہے، یا جس کے لئے اہل دنیا مرے پڑتے ہیں۔ ایک متوسط معیار پر بحمد اللہ یہ کامیاب ہوتے ہیں، بحمد اللہ کبھی سننے میں نہیں آتا کہ مدرسہ کا مدرس فاقہ کا شکار ہوا ہو، یا اس کے بدن پر کپڑا نہ ہو، یا اس کے رہنے کے لئے بقدر ضرورت سہی! مکان نہ ہو، اس سے زیادہ انھیں کیا چاہئے ، یہ تو قرآن وحدیث میں پڑھتے پڑھاتے ہیں کہ دنیا کی زندگی سفر کی ایک گزرگاہ ہے، منزل نہیں ہے، منزل تو آگے جنت ہے، گزرگاہ میں کوئی شخص زیادہ دلچسپی نہیں لیتا، بقدر ضرورت زادِ سفر مل جائے، ضروری سواری مل جائے، بس کافی ہے، جن کا ایمان یہ ہو ان کے لئے ہزار شکر کا مقام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دینی تعلیم میں لگے لپٹے رہنے سے اتنا زیادہ انتظام کر رکھا ہے، جس سے بہت کم پر ہمارے نبی ﷺ اور ان کے اصحاب ؓ اور ان کے بعد کے اسلاف دنیا گزار لے گئے۔

بہر حال مجھے کہنا یہ ہے کہ طلبہ واساتذہ کی یہ ہمہ وقتی رفاقت بہت زیادہ بابرکت ہے، ان حالات میں استاذ اپنے طالب علم کے ذہن ودماغ میں جو بات چاہے پختہ کرسکتا ہے، یہاں ایک استاد کی ذمہ داری ہے کہ وہ طالب علموں کے قلب ودماغ میں وہ تمام باتیں پختہ کردے، جو علم وعمل اور اخلاق کے محاسن ومعالی ہیں، دنیا کی بے وقعتی، اس کا مقصود نہ ہونا ، مال دنیا کا مطلوب نہ ہونا، ان کے دل میں بیٹھا دیا جائے، اچھے اخلاق کی ان کے قلوب میں پرورش کی جائے، اعمال صالحہ کا ذوق ان میں بیدار کیا جائے، یہ وہ بات ہے جو طالب علم کی انتہائی خیر خواہی کی ہے، اگر ان محاسن میں وہ پختہ ہوا، تو مدرسہ کی چہار دیواری سے دنیائے عمل میں اترے گا، تو کھرا سونا ہوگا، جس کی قیمت کا اندازہ نہیں کیا جاسکے گا۔

تعلیمی خیر خواہی:

خاص تعلیم کے باب میں طالب علم کی خیر خواہی یہ ہے کہ بہت سے تجربوں کے بعد

مدرسہ میں درس کے لئے جس جماعت کی جو کتابیں متعین کی گئی ہیں، اور پڑھانے کے لئے ان کی جو مقدار اور جس طرز کا تعین کر دیا گیا ہے، اسے پابندیٔ وقت کے ساتھ مناسب تدریج کے ساتھ پورا کرا دیا جائے، اس اجمال کی شرح یہ ہے کہ:

(۱) استاذ سبق کا کبھی ناغہ نہ کرے، تعلیم کے جتنے دن مدرسہ میں مقرر ہیں، ہر روز ان کے متعینہ اوقات میں کتاب کا سبق آگے بڑھتا رہے، اور اس میں تدریج رکھے، ابتداء میں جب مناسبت کم ہوتی ہے، تھوڑا تھوڑا سبق پڑھائے، پھر جب مناسبت ہو جائے تو مقدار سبق کی بڑھا دے، اتنی بڑھائے کہ سال کے آخر تک کتاب کا نصاب بآسانی پورا ہو جائے، اس طریقۂ عمل سے نہ طلبہ پر بوجھ زیادہ ہوگا اور نہ کتاب کے سمجھنے میں دقت ہوگی۔

اگر ناغہ ہوتا رہا، خواہ غیر حاضری کی وجہ سے، خواہ مدرسہ میں موجود ہیں اور سبق نہ پڑھایا، خواہ سبق میں طول طویل بے فائدہ، بے مغز تقریروں کی وجہ سے، تو سال کے ایک بڑے حصے میں مقدارِ خواندگی بہت تھوڑی ہوگی، اس سے طلبہ کا نقصانِ حاضر تو یہ ہوگا، کہ بھوک سے کم غذا ملتی رہی اور کمزوری ہوتی رہی، یعنی جب سبق روزانہ نہ ہوگا، یا کم ہوگا تو طلبہ میں بے دلی پیدا ہوگی، محنت کی ضرورت نہ محسوس کریں گے، تو کاہلی بڑھے گی، تو جو کچھ پڑھا ہوگا، وہ اسی وقت کھو چکے ہوں گے، پھر سال کے آخر میں مدرس کو ہوش آئے گا کہ وقت کم ہے اور مقدار زیادہ ہے، تو وہ سبق کی مقدار بڑھائے گا، وقت کی مقدار بڑھائے گا، متعینہ وقت کے علاوہ دوسرے اوقات کو گھیرے گا تو جو مقدار وہ ایک ہفتہ میں پڑھاتا، اسے ایک دن میں پڑھائے گا، تو خود سوچو یہ مقدار طالب علم کو کیونکر ہضم ہوگی، پہلے تو وہ کمی کی وجہ سے سست پڑ گیا تھا، اب زیادتی کی وجہ سے اچاٹ ہو جائے گا، نتیجہ یہ ہوگا کہ بالکل کورا رہ جائے گا، اس لئے اس کا اہتمام بہت ضروری ہے کہ اسباق میں ناغہ نہ ہو، اور نہ غیر متعلق طول طویل تقریریں ہوں، اور نہ اس کے علاوہ مدرس کے اور دوسرے مشاغل ہوں، مدرسین کا سب سے غلط مشغلہ مجلس بازی کا ہوتا ہے، مجلسی گفتگو میں اتنی لذت اور محویت ہوتی ہے کہ

آدمی کو خبر نہیں ہوتی اور وقت برباد ہو جاتا ہے، اس مجلس بازی کی وجہ سے اسباق کا بہت نقصان ہوتا ہے۔

(۲) مدرس کی ذمہ داری ہے کہ اسباق کی تیاری بہت اہتمام سے کرے، کتاب جو زیر درس ہے، اس کا بخوبی مطالعہ کرے، اس کے مشکلات کو اچھی طرح حل کرے اور طلبہ کے سامنے اسے آسان کر کے بیان کرے، بغیر مطالعہ کے ہرگز درسگاہ میں نہ جائے۔ مطالعہ تعلیم کا رُکنِ اعظم ہے، اس سے کبھی غافل نہ ہو، اس سلسلے میں بہت لاپرواہی ہوتی ہے، جس سے طلبہ کا بہت نقصان ہوتا ہے، ان کی استعداد تباہ ہوتی ہے، اور مدرس کی بدنامی اور محرومی الگ ہوتی ہے۔

مدرسین کی ایک مشکل:

تم سوچو گے کہ دورِ حاضر میں دینی اور نیم دینی جلسوں کا رواج بہت ہے، ان جلسوں میں بڑے مدرسوں کے اساتذہ عموماً بلائے جاتے ہیں، متوسط اور چھوٹے مدرسوں میں کوئی باصلاحیت مدرس ہوتا ہے جو تقریر کر سکتا ہے، اسے بھی بکثرت دعوت ملتی ہے، مدرسہ کے باہر اتنے بڑے علماء ملتے نہیں جو اچھا وعظ کہہ سکیں اور عوام ان پر اعتماد کر سکیں، پس لامحالہ مدرسہ کے مدرسین ہی پر نگاہ انتخاب پڑتی ہے، سواریوں کی سہولت کی وجہ سے دور نزدیک سب کا حال یکساں ہو گیا ہے، اس طرح بکثرت مدرسین سفر میں رہتے ہیں، اور سبق کا ناغہ بہت ہوتا ہے بالخصوص بڑے مدرسوں کے بڑے مدرسین اس میں زیادہ مبتلا ہیں، اس سے تعلیم کا بہت نقصان ہوتا ہے، یہ حضرات جب اسفار سے لوٹتے ہیں اور کتاب کی مقدار خواندگی دیکھتے ہیں، تو سبق کی مقدار اور وقت کی مقدار اتنی بڑھا دیتے کہ پڑھنا نہ پڑھنا سب برابر ہو جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں، ہاں یہ ملت اسلامیہ کا عجیب المیہ ہے، مدرسین کو طلبہ کے لئے یکسو

ہونا چاہئے ، مگر یہی جلسوں کی بھی زینت ہیں ، اور واقعی اس سے تعلیم کا نا قابل تلافی نقصان ہوتا ہے ، اس صورت میں طلبہ کا نقصان بھی گوارا نہیں ہوتا ، لیکن مدرسین جلسوں میں نہ جائیں یہ پابندی بھی قابل عمل نظر نہیں آتی ، اس مشکل کا حل کیا ہے ؟

اس سلسلے میں میری ایک تجویز ہے ، وہ یہ کہ مدرسین اپنے اسباق کو اولین اہمیت دیں ، جہاں اسباق کا نقصان نا قابل تحمل ہو رہا ہو وہاں جانے سے معذرت کر دیں ، اور جلسے والوں کو مشورہ دیں کہ اپنے قریبی علماء کو بلا کر وعظ کرا دیں ، ان کا نقصان کم ہوگا ، سفر میں جو وقت لگتا اس کی بچت ہو جائے گی ، گو جلسے والے اس پر راضی نہیں ہوتے ، کیونکہ ان کو بڑا نام چاہئے اور مقامی اور قریبی علماء ان کے نزدیک بڑے نام کے نہیں ہوتے ، اس لئے میں سوچتا ہوں کہ ان رسمی جلسوں کا ڈھانچہ بدل دیا جائے ۔ متعدد علماء پر مشتمل جو جلسے کرائے جاتے ہیں وہ یکسر بند کر دئے جائیں ، بہت سے مدرسین کو ہمہ وقت سفر کرنا نہ ہوگا ، اور منتظمین بھی بہت ساری زحمتوں سے بچ جائیں گے ، اور عوام الناس کو دینی فائدہ بھی زیادہ ہوگا ۔

بہر حال ! یہ تجویز قبول ہو یا نہ ہو ، مدرس کو اپنی ذمہ داری سمجھنی ہوگی ، ورنہ وہ خدا کے یہاں جوابدہ ہوگا ، اسباق کے نقصان کا بھی اور طلبہ کے دل و دماغ کے ضائع ہونے کا بھی !

خارج اوقات میں سبق :

طلبہ کی خیر خواہی کا ایک اہم شعبہ یہ بھی ہے ، کہ اسباق کے لئے مدرسہ نے جو وقت مقرر کیا ہے سبق اسی میں ہو ، دوسرے وقت میں نہ ہو ، طلبہ کا کوئی وقت خالی نہیں ہے ، ایک وقت درس کا ہے ، اور ایک وقت مذاکرے کا ، اور مذاکرہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا سبق ، تو اگر مدرس خارج میں پڑھائے گا تو یہ خارج مذاکرہ کا وقت ہے ، جس وقت میں پڑھاتا تھا اس کو مدرس نے ناغہ کر کے ضائع کیا ، اور خارج وقت میں پڑھا کر طلبہ کے مذاکرہ کو ضائع کیا

، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ پھر ان طلبہ کی استعداد بنے تو کیونکر بنے؟ خارج کے اسباق کا جواز بالکل نہیں ہے۔

چوتھا فریضہ

طلبہ کو غلطی پر تنبیہ مناسب انداز سے کی جائے

میں نے تیسرے فریضہ کی تشریح میں قدرے درازنفسی سے کام لیا، اب پھر چلو مجلس غزالی میں، دیکھو وہ چوتھا فریضہ کیا بتلاتے ہیں۔ سنو فرما رہے ہیں:

> چوتھا فریضہ فن تعلیم کا باریک نکتہ ہے، وہ یہ کہ طلبہ کو کسی غلطی اور اخلاق کی کجی پر تنبیہ کرنی ہو، تو اشارہ کنایہ میں کی جائے۔ اس کی غلطی یا بدخلقی کو کھول کر نہ بیان کیا جائے، نیز انداز تنبیہ مشفقانہ ہو، اس میں محبت وخیر خواہی کی خوشبو بسی ہوئی ہو، بہت سختی اور ڈانٹ ڈپٹ کا انداز نہ ہو، کیونکہ کھل کر تنبیہ کرنے سے ہیبت ختم ہوتی ہے اور خلاف کی جرأت اور اصرار کی لپک بڑھتی ہے، اور لطیف طریقہ پر تنبیہ کرنے سے شریف طبیعتیں اور پاکیزہ نفوس زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ (احیاء العلوم، ج:۱ص:۵۷)

امام صاحب کی یہ بات بہت قابل توجہ ہے، طلبہ کی بھی عزت نفس ہوتی ہے، ان کی طبیعتیں بھی غیور ہوتی ہیں، وہ ہم سے عمر میں چھوٹے اور علم میں کم ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے کہ ان کی طبیعتیں بے حس ہوں، شاگرد ہونے کی وجہ سے وہ ہمارے احترام میں چپ رہ جائیں اور ہماری کڑوی کسیلی کو گوارا کر لے جائیں یہ الگ بات ہے، مگر ان کے احساس کو بھی چوٹ لگتی ہے اور وہ بھی تلملاتے ہیں، اس لئے اگر ان سے کوئی غلطی ہو، تو کڑوے کسیلے الفاظ، ان کے عیب کا صراحۃً اظہار، اور لہجہ کی سختی نہیں ہونی چاہئے، حتی الامکان کنایہ اور تعریض سے کام لینا بہتر ہے، الفاظ وانداز کی بڑی تاثیر ہوتی ہے۔

میں اس جگہ تمہاری عبرت کے لئے اپنے تین تجربے ذکر کرتا ہوں، دو تجربے دورِ

طالب علمی کے ہیں، اس میں مَیں خود اپنے دو بہت ہی محترم استاذوں کی تنبیہ سے مدتوں پریشان ہوتا رہا، اور ایک تدریس کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے، خود میری غلط انداز کی تنبیہ سے ایک طالب علم بہت پریشان ہوا تھا۔ اس سے تمھیں معلوم ہوگا کہ طبیعتوں کی رعایت کتنی ضروری ہے، اور شاید تم کو خود اپنے متعلق بھی کچھ باتیں یاد آجائیں، ان باتوں کو رہنما بنانا چاہئے۔

میں درجۂ عربی سوم کا طالب علم تھا، طالب علمی کے دور میں لاابالی پن کا غلبہ تو ہوتا ہی ہے، پھر میری عمر بھی کم تھی، ایک بزرگ استاد نے ایک سوال جس کا تعلق عام تجربات سے تھا، طلبہ سے کیا، کسی نے کچھ جواب نہ دیا، میری طرف متوجہ ہوکر پوچھا تو میں نے کچھ جواب دیا جو غلط تھا، انھوں نے زجر وتوبیخ شروع کی اور اس میں بہت غلو کیا، اور آخر میں ایک ایسی بات کہہ دی جس سے میں کانپ گیا، یہ علم سے محرومی کی بات تھی، مجھے اتنا صدمہ ہوا کہ ہفتوں اسے سوچتا رہا اور رُوتا رہا، دعائیں کرتا رہا۔ اللہ کا فضل ہوا کہ میں ان استاذ سے نہ بدگمان ہوا نہ عقیدت میں کمی آئی، مگر رویا بہت! اب بھی وہ بات یاد آتی ہے تو کانپ جاتا ہوں۔

ایسے ہی ایک بار جب کہ میں درجاتِ نہائی میں تھا، ایک غلطی پر جو غیر معمولی نہ تھی، ایک استاذ نے بہت سخت لہجے میں ڈانٹا، میں نے معذرت کی تو ان کا لہجہ اور سخت ہوگیا، اور اتنی سخت بات کہہ دی کہ میرے دل میں اس کی تلخی بیٹھ گئی۔ اس کے بعد مدتوں یہ حال رہا کہ اگر کھانا کھاتے وقت وہ بات یاد آتی، تو کھانا تلخ ہوجاتا۔

یہ میری طالب علمی کا تجربہ تھا۔ زمانۂ تدریس میں مَیں اپنی درسگاہ میں بیٹھا تھا، ایک ذہین طالب علم دوسرے طالب علم سے کہہ رہا تھا، میرا کمرہ پہلی منزل پر تھا، وہ طالب علم کمرے سے نیچے، پانی کا نل تھا، وہیں کھڑا دوسرے کو سمجھا رہا تھا کہ، مولانا تم سے ناراض ہیں، تم ان سے جلدی معافی مانگ لو۔ میرے کان میں آواز آئی اور اس کی محبت بھی دل میں

محسوس ہوئی کہ وہ دوسرے کے ساتھ خیر خواہی کی بات کر رہا ہے، کچھ دیر اسے سمجھاتا رہا اور آخر میں ایک ایسی بات میرے کان میں آئی کہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، اس نے کہا کہ ایک مرتبہ مولانا مجھ سے ناراض ہوگئے تھے، اور مجھے ایسی سخت بات کہہ دی تھی کہ میں ایک ہفتہ تک ٹھیک سے کھانا نہ کھا سکا تھا، میں اپنی غلطی کے احساس میں ڈوب گیا، اور سوچنے لگا کہ اپنے استاذ کی ایک بات سے میرا کھانا تلخ ہوگیا تھا، اب میری ایک بات سے میرے ایک طالب علم کا بھی وہی حال ہوا، میں نے اسی وقت اللہ سے معافی مانگی کہ اب ہمیشہ اس کا خیال رکھوں گا، پھر جب کسی کی غلطی پر غصہ آیا اور کچھ کہنا چاہا، تو وہی گفتگو یاد آگئی، میں نہیں جانتا کہ میں اپنی توبہ میں کامیاب رہا یا نہیں؟ لیکن یہ بات یاد ضرور رہتی ہے۔

بس طلبہ کے احساسات وجذبات کی رعایت کر کے انھیں مناسب انداز میں غلطی پر متنبہ کر دینا چاہئے، سخت زبان استعمال کرنے کی شرعاً اجازت نہیں ہے، اور اگر کہیں ہے تو بہت کم! نرمیٔ کلام سے درجات بڑھنے کی بشارت حدیث میں ہے، غلطی پر ٹوکا نہ جائے یہ بھی درست نہیں، لیکن لہجہ اور زبان شستہ نہ ہو یہ غلط ہے، بعض لوگوں کی زبان پر گالی کے الفاظ چڑھ جاتے ہیں اور وہ انھیں غصہ میں بے قابو ہو کر بول دیتے ہیں، بعض طلبہ جنھوں نے نہ کبھی گالی دی ہوتی، نہ سنی ہوتی، سن کر نہایت بددل ہوتے ہیں۔ ایک طالب علم مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں فلاں مدرسے میں چند ماہ رہا پھر بھاگ گیا، کیونکہ وہاں ایک صاحب طلبہ کو گالی دے دیتے تھے۔

تالیف قلب کا ہمیشہ دھیان رہنا چاہئے، یہ بہت ضروری مضمون ہے، اسے ذہن ودماغ میں بسا لو۔

پانچواں فریضہ

کسی فن کی اہمیت نہ گھٹائیں

سنو! امام غزالی مدرسین کا پانچواں فریضہ بتاتے ہیں کہ:

> ایک مدرس جو کسی خاص فن کا درس دیتا ہے، اسے چاہئے کہ دوسرے علوم وفنون جو اس کے درس میں نہیں ہیں، طالب علم کے سامنے ان کی اہمیت نہ گھٹائے، مثلاً ادب کا استاذ ہے، اور اس سے اس کو مناسبت ہے، وہ علم فقہ کی شان گھٹائے، یا علم فقہ کا ماہر علم حدیث وتفسیر کی وقعت کم کرے وغیرہ، بلکہ وہ خواہ کسی علم کا ماہر ہو، طالب علم پر ہر علم کی گنجائش کھلی رکھے، اور اگر وہ کئی علم کا صاحب اختصاص ہے تو تدریجاً ایک علم کے بعد دوسرے علم کی طرف متوجہ کرے۔ (احیاء العلوم، ج:۱، ص:۵۷)

امام غزالی علیہ الرحمہ اپنے دور کے حالات کے مطابق یہ فریضہ بتارہے ہیں، اس دور میں اور اس کے بعد کے اَدوار میں تعلیم کا جو طریقہ تھا وہ یہ کہ الگ الگ فن کے الگ الگ اساتذہ ہوتے تھے، جو اپنے اپنے فن کے طلبہ کو لے کر بساطِ درس بچھائے ہوتے، حدیث کا طالب علم کسی محدث کی خدمت میں حاضر ہوتا، فقہ کا طالب کسی فقیہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتا، علم کلام کا جویا متکلم کے پاس جاتا، منطق وفلسفہ کا چاہنے والا منطقی وفلسفی کا شاگرد بنتا، لغت وادب کا شیدائی لغوی اور ادیب کی جوتیاں سیدھی کرتا۔ انسان کی نفسیاتی کمزوری ہے کہ جس کو جس علم وفن سے دلچسپی ہوتی ہے، دوسرے علم وفن کو وہ قدر ومنزلت نہیں دیتا جس کا وہ مستحق ہوتا ہے، وہ خود بھی اور اس کے طلبہ بھی دوسرے فن کے حق میں انصاف کرنے میں کوتاہی کرنے لگتے ہیں، امام غزالی اس پر متنبہ کرتے ہیں کہ یہ بات طالب علم کی خیر خواہی اور خلوص کے خلاف ہے، مدرس کو خواہ وہ کسی فن کا ہو مدرس ہو، چاہئے کہ وہ دوسرے فن کی تحقیر نہ کرے، تاکہ ایک طالب علم جب کسی فن میں معتد بہ مہارت پیدا کرلے تو دوسرے ضروری اور مفید فن کی تحصیل میں اسے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

دار العلوم دیوبند کے آغاز سے جس طرز کے مدرسوں کا رواج ہوا ہے، ان میں اکابر نے ایسا انتظام کر دیا ہے، کہ تحقیر و تحسین کی یہ کشمکش بہت حد تک کم ہوگئی، کیونکہ علم دین کے لئے ہر ضروری اور معاون فن کو ان حضرات نے درس میں شانہ بشانہ رکھ دیا ہے۔ نحو، صرف، منطق، فقہ، حدیث، تفسیر، بلاغت اور ادب سب تکمیل تک ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں، پڑھانے والے بھی بیک وقت متعدد فنون پڑھاتے ہیں، اس طرح ترجیحات کی گنجائش نہیں نکلتی۔

لیکن اسی طرح کی اس سے زیادہ خطرناک ایک بیماری پیدا ہوتی ہے، جس کے نتائج طالب علم کے حق میں بہت مضر نکلتے ہیں، وہ یہ کہ علوم کی ترجیحات کے بجائے اساتذہ کے درمیان تنافس، بلکہ تحاسد کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، یہ کیفیت دینی اور اخلاقی اعتبار سے بھی زہر ہے، اور طالب علم اور مدرسہ کے لئے بھی مضر ہے۔

پہلے ہر مدرس کی درسگاہ الگ ہوتی تھی، اب یک ہی مدرسے میں کئی مدرس ہوتے ہیں، یہ مختلف استعداد، مختلف طبیعت و مزاج کے ہوتے ہیں، اور مختلف اساتذہ کے تلامذہ ہوتے ہیں، ایک ہی مدرسہ میں پڑھاتے ہیں، طلبہ کی ہر جماعت متعدد اساتذہ سے پڑھتی ہے، پسند و ناپسند کا معیار بھی الگ الگ ہوتا ہے، اس ماحول میں فطرت انسانی کی وہ کمزوری جسے حسد کہا جاتا ہے، بہت زور کرتی ہے، اگر استاذ قلب و دماغ کا کمزور ہوا تو دوسرے پر تنقید و تبصرہ یا شرعی زبان میں غیبت و تنقیص میں مبتلا ہو جاتا ہے، ایک مدرس دوسرے مدرس کو طلبہ کی نگاہ میں اور ماحول کے اندر کم رتبہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس سے طلبہ میں باہم کشمکش پیدا ہو جاتی ہے، پھر تحصیل علم کی سرگرمی ٹھنڈی پڑنے لگتی ہے۔

اس لئے میں تمہیں اس مسئلہ میں بہت تاکید کرتا ہوں کہ ہرگز ہرگز کسی سے حسد نہ ہو، حاسد جب حسد کرتا ہے تو حق تعالیٰ پر اعتراض کرتا ہے، وہ اللہ سے خوش نہیں ہے کہ فلاں کو علمی تبحر و وسعت، مقبولیت و محبوبیت اور خوش تقریری کی دولت کیوں ملی؟ اس سے سمٹ کر میری

طرف کیوں نہیں چلی آتی؟ بھلا بتاؤ، اللہ پر اعتراض کرنے والا کیسے کامیاب ہوسکتا ہے؟ تمہارا طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ جس کسی کی جو خوبی ہو، اسے خوش دلی سے مان لو، اس کا اعتراف کرو اور اس اعتراف کا جو تقاضا ہو، احترام کا، استفادے کا، مدح وتوصیف کا، اس میں بخل نہ کرو، جو نعمت اللہ نے اسے دی ہے تم اس پر راضی ہو، تو اللہ سے راضی ہو، ہرگز ہرگز اس کی تنقیص نہ کرو، نہ صراحۃً نہ کنایۃً، نہ طلبہ کے سامنے نہ اپنے ہم چشموں اور معاصرین کے درمیان! غیبت جیسی کچھ معصیت ہے تم جانتے ہو، پھر آدمی جب غیبت کرتا ہے تو غیبت ہی تک محدود نہیں رہتا، وہ اس کی حد سے گزر کر تہمت اور بہتان کی مہلک اور اندھیری وادی میں جا گرتا ہے، پھر وہ اللہ کے یہاں بھی ذلیل وخوار ہوتا ہے، اور مخلوق بھی اس سے بیزار ہو جاتی ہے۔

فی زمانہ مدارس میں بعض اوقات مدرسوں کی مجلسیں غیبت، بہتان، استہزاء وتحقیر کی غلاظتوں کا انبار بن جاتی ہیں، ان سخت معاصی میں مبتلا ہوکر بھی عالم کے عالم اور بزرگ کے بزرگ بنے رہتے ہیں، معصیت سے بچنا بہت ضروری ہے، اور یہ حقوق العباد قسم کی معصیتیں انسان کے قلب ودماغ کے لئے سخت مضر ہیں اور مرنے کے بعد تو خطرۂ عظیم ہیں، اس لئے مدرسے میں قدم رکھو تو اپنے ہی جیسے یا اپنے سے بڑے علماء کا گوشت نہ کھاؤ۔ اس سے اس طرح بچو جیسے آدمی سانپ سے بچتا ہے، یہ موضوع بہت ضروری ہے، اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو اس پر بہت کچھ لکھتا، لیکن تم تو خود واقف ہو، عاقل کو اشارہ کافی ہے۔

چھٹا فریضہ

طالب علم کو اس کی عقل وفہم کے معیار پر تعلیم دینا

امام غزالی ارشاد فرماتے ہیں کہ:

> طالب علم کو اس کی عقل وفہم کے لحاظ سے علوم کی تعلیم دینا چاہئے، اسے وہ علم اور وہ بات سکھانے کے درپے نہ ہو، جس تک اس کی عقل وفہم کی رسائی

> نہ ہو، ورنہ یا تو علم ہی سے متنفر ہو جائے گا، یا خبط میں پڑے گا، نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہم انبیاء کی جماعت کو پابند کیا گیا ہے، کہ لوگوں کو ان کے مرتبے پر رکھیں، اور ان سے ان کی عقل و درایت کے لحاظ سے بات کریں، اور حضرت ﷺ نے فرمایا، جب کوئی شخص لوگوں کی رسائی عقل سے ورے بات کرتا ہے تو یہ باان میں بعض کے لئے فتنہ بن جاتی ہے۔ (احیاء العلوم، ج:۱، ص:۵۷)

یہ بات بہت واضح ہے، کہ آدمی کے عقل و فہم سے بلند اور غامض بات کا اسے مخاطب بنایا جائے، تو وہ اس کے لئے ایک آزمائش ہوتی ہے، لیکن اب مدرسوں کا جو نظام اجتماعی ہے، اس میں اس فریضہ کی رعایت خاصی دشوار ہے، ایک جماعت میں متعدد طلبہ ہوتے ہیں، اور ہر ایک کی عقل و فہم کا پیمانہ الگ ہوتا ہے، ایک طالب علم کتاب کا مقصد پالیتا ہے، دوسرا بہت کوشش کرتا ہے، تب بھی اس کی رسائی نہیں ہوتی، اس طرح بغیر سمجھے ہوئے اس کا سبق آگے بڑھتا رہتا ہے، روز بروز علم کا وزن اس پر بڑھ رہا ہے، اور وہ ہے کہ اس سے بالکل بے بہرہ ہے، جماعتی درس کا نظام ایسا ہے کہ خواہ وہ کچھ سمجھے یا نہ سمجھے، اس کی ترقی ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ بغیر فہم و ادراک کے فارغ التحصیل بن کر سند لے کر مدرسے کے باہر آجاتا ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ عالم ہے، اور وہ خود بھی اپنے کو عالم کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، حالانکہ وہ علم سے خالی ہے۔

موجودہ تعلیمی نظام میں اس کا حل دشوار ہے، اس صورت حال میں مدرس کیا کرے، وہ خود اکتا جاتا ہے، اور پڑھانے کے لئے جو ضروری محنت ہونا چاہئے اس میں کوتاہی کرنے لگتا ہے۔ اس جماعتی نظام میں سب کو باندھ کر لے چلنے میں سب کی استعدادیں متاثر ہوتی ہیں، ذہین طلبہ اپنے ذہن کے مناسب خوراک نہیں پاتے، کیونکہ کمزوروں کو لے کر چلنا ہوتا ہے، اور کمزور طلبہ کو ذہینوں کے ساتھ اپنی طبعی رفتار سے تیز دوڑنا پڑتا ہے، تو وہ پچھلے سے محروم ہوتے جاتے ہیں، اور اگلا ہاتھ نہیں لگتا، استاذ بھی اس ذہین

وغبی کی کشمکش میں سست ہو جاتا ہے۔

تاہم اس نظام میں بھی کچھ نہ کچھ ایسے نکل آتے ہیں، جن سے علم اور دین کی آبرو باقی رہتی ہے، اس صورت حال میں مدرس کا خلوص، اس کی محنت، دین کو زندہ کرنے کی لگن اور علوم دین کے احیاء وابقاء کی دھن زیادہ موثر ہوتی ہے، استاذ کو ان امور کا جتنا اہتمام ہوگا طالب علم اس سے متاثر ہوگا۔ بہر حال مدرس کو اپنی جیسی محنت کر لینی ہے، اللہ تعالیٰ کا دین باقی رہے گا، اور یہ محنتیں اور تدبیریں موثر رہیں گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

ساتواں فریضہ

مدرس خود صاحب عمل ہو

امام غزالی علیہ الرحمہ نے ساتویں فریضہ کے عنوان سے جو کچھ بیان کیا ہے، وہ چھٹے ہی سے تعلق رکھتا ہے، اسے میں بقدر ضرورت لکھ چکا ہوں، اس کے بعد جسے انھوں نے آٹھویں فریضہ کا عنوان دیا ہے، اسے میں ساتویں فریضے کے عنوان سے لکھتا ہوں، فرماتے ہیں کہ:

> مدرس کو اپنے علم پر باعمل ہونا چاہئے، اس کا فعل اس کے قول کی تکذیب نہ کرے، کیونکہ علم کا ادراک بصیرت سے ہوتا ہے، اور عمل کا پتہ بصارت سے چلتا ہے، اور بصیرت والے کم ہیں، بصارت والے زیادہ ہیں، پس جب اس کا عمل اس کے علم کے خلاف ہوگا، تو ہدایت کا دروازہ بند ہو جائے گا، دیکھو اگر کوئی شخص کسی چیز کو خود کھا رہا ہے اور لوگوں کو منع کر رہا ہے کہ مت کھاؤ، کیونکہ یہ زہر قاتل ہے، تو لوگ اس کی ہنسی اڑائیں گے، اسے متہم کریں گے، اور جس چیز سے انھیں منع کیا جاتا ہے اس کی حرص اور زیادہ بڑھ جائے گی، اور لوگ کہیں کہ اگر یہ چیز عمدہ اور لذیذ نہ ہوتی تو یہ دوسروں کو روک کر خود کیوں کھاتا؟
>
> استاذ کی مثال شاگرد کے حق میں ایسی ہے جیسے ٹھپہ، گیلی مٹی کے حق میں،

> اور جیسے لکڑی سایہ کے حق میں، خود سوچو اگر ٹھپہ نقش و تحریر سے خالی ہوگا تو گیلی مٹی پر کوئی نقش کیسے ابھرے گا، اور لکڑی ٹیڑھی ہوگی تو سایہ سیدھا کیونکر ہوگا۔ کسی کا شعر ہے ؎
>
> **لاتنه عن خلق وتاتی مثله　　　عار علیک إذا فعلت**
> **عظیم**
>
> جب خود کسی چیز کے عادی ہو، تو لوگوں کو اس سے منع نہ کرو، کیونکہ جب تم
> خود اسے کر رہے ہو تو تمہارے لئے بہت شرم و ننگ کی بات ہوگی۔
>
> اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اَ تَـأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ (سورۃ البقرۃ:) کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ اسی لئے عالم کی معصیت، جاہل کی معصیت سے زیادہ مستحق سزا ہوتی ہے، کیونکہ عالم کی غلطی سے بہت سے لوگ بھٹک جائیں گے، اور جس نے کوئی برا طریقہ رواج دیا، اس پر اس کا اپنا گناہ تو ہے ہی، جو اس پر عمل کرے گا اس کا بھی گناہ ہوگا، اسی لئے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ دو آدمیوں نے میری کمر توڑ دی، بے عمل عالم نے، اور جاہل عبادت گزار نے، جاہل اپنی عبادت سے لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے، اور عالم اپنی بے عملی کی وجہ سے! (احیاء العلوم، ج:۱، ص:۵۸)

یہ آخری فریضہ اور وظیفہ ہر مدرس کے پیش نظر ہمہ دم رہنا چاہئے۔ مدرس ایک عالم اور رہنما ہوتا ہے، اولاً اس سے اس کے تلامذہ اور طلبہ علم و عمل کا اکتساب کرتے ہیں، ثانیاً دوسرے لوگوں میں اس کے علم و عمل کا پیغام جاتا ہے، عالم اگر علم کے ساتھ عمل کا پیکر نہ ہو، اس کا علم کچھ اور ہو، اور اس کا عمل کچھ اور ہو، تو یہی صفت اس کے شاگردوں میں سرایت کرے گی، اس طرح نام کے علماء تو بکثرت ہوں گے، مگر حقیقۃً عالم جن کے عالم ہونے کی تصدیق اللہ تعالیٰ بھی کریں، ناپید ہو جائیں گے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ

مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ، اللہ کے بندوں میں، اللہ کی خشیت رکھنے والے علماء ہی ہوتے ہیں، جس عالم کے دل میں اللہ کی خشیت واقعی ہوگی وہ عمل میں پیچھے نہ ہوگا۔

امام ابوبکر محمد بن حسین آجری متوفی ۳۶۰ھ اپنے بیش قیمت رسالہ ''اخلاق العلماء'' میں عالم باعمل، صاحب خوف وخشیت کا حال اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

> وہ خدا تعالیٰ کا شاکر وذاکر ہوتا ہے، محبت خداوندی کی حلاوت سے سرشار، مناجاتِ الٰہی میں فارغ ویکسو، تمامتر طاعت وعبادت کے باوجود اپنے آپ کو گنہگار وخطا کار شمار کرتا اور حسن عمل پر دوام کے باوجود خود کو پُرتقصیر سمجھتا ہے، خدا کی پناہ اس نے ڈھونڈھی، خدا نے اسے قوت بخشی، خدا پر اعتماد وتوکل کیا پھر کسی کا خوف دل میں نہیں لایا، اللہ کو پا کر ہر چیز سے بے نیاز ہوگیا، ہر چیز میں خدا ہی کا محتاج رہا، اس کو اُنس ہے تو محض اللہ سے، اور وحشت ہر اس چیز سے ہے جو خدا سے اسے ہٹادے، اس کا علم بڑھتا ہے تو خدا کی حجت پختہ ہونے سے خائف ہوتا ہے، سابقہ اعمال صالحہ کے سلسلے میں عدمِ قبولیت سے ڈرتا رہتا ہے، تلاوت کلام اللہ کرتے وقت اس کی فکر رہتی ہے کہ اپنے مولیٰ کی بات سمجھ لوں اور سنت رسول میں اشتغال اس لئے ہوتا ہے کہ اس میں تفقہ حاصل کرلے، مبادا کوئی حکم ضائع نہ ہوجائے، قرآن وسنت کے آداب سے مزین ہوتا ہے، اہل دنیا سے دنیاوی عزت کے سلسلے میں کوئی مسابقت نہیں کرتا اور دنیاوی ذلت سے اسے کچھ گھبراہٹ نہیں ہوتی، زمین پر تواضع، وقار اور سکون کے ساتھ چلتا ہے، اس کا دل ہر وقت عبرت پذیری میں مشغول رہتا ہے، اگر کبھی اس کا دل اللہ کی یاد سے خالی ہوجائے تو اس کے نزدیک سخت مصیبت ہے، اگر اللہ کی اطاعت بغیر حضور قلب کے ہو تو سخت محرومی اور خسارہ، ذاکروں کے ساتھ ذاکر، غافلوں کی حالت سے عبرت پذیر، اپنے عیوبِ نفس سے واقف اور اسے مُتّہم جاننے والا، علوم میں اتنی وسعت کہ سمجھ بالکل کھلی ہوئی، جس کا اثر یہ ہے کہ ذاتِ حی وقیوم سے حیا وشرم اس

کے دل میں سماگئی، تمام اعمال میں مشغولی بحق مسلسل اور ماسوااللہ سے انقطاع ویکسوئی مکمل!

اس اقتباس کو بار بار پڑھو اور دیکھو کہ تمہارے اندر ان میں سے کتنے اوصاف ہیں، دھوکہ مت کھانا، نفس کے فریب میں مت آنا، اگر کوئی صفت موجود ہو، تو دل وجان سے اللہ کا شکر ادا کرو، ورنہ استغفار کرو، اپنے اندر ان صفاتِ حمیدہ کے پیدا کرنے کی محنت اور ہمت کرو۔

یہ بات ہمیشہ یاد رکھو کہ تم صرف مدرسہ کے ملازم اور مدرس نہیں ہو، ملازمت کا تصور جن تقاضوں کو پیدا کرتا ہے، وہ تو بہت تھوڑے ہیں اور ذرا سی توجہ سے وہ حل ہو جاتے ہیں، لیکن تمہاری جو اصل حیثیت ہے وہ عالم ہونے کی ہے، اور تم کو عالم ربانی ہونا ہے، اس لئے اگر اس پر دھیان دو گے تو عزت ہی عزت ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی!

☆☆☆☆☆

مدرس بحیثیت کارکن مدرسہ

فرزند عزیز! ایک عالم اور مدرس کو طالب علم کے ساتھ کیسا ہونا چاہئے، اس کی تفصیل بقدرِ ضرورت میں نے لکھ دی ہے، تمہارا اصل کام یہی ہے، اس کام کو جتنے خلوص، لگن، دیانت داری اور شفقت ومحبت کے ساتھ انجام دو گے، اسی کے بقدر ملکوت میں "عظیم" کہلانے کے مستحق ہو گے۔

لیکن اس اصل کام کے انتظام میں دائیں بائیں کچھ علائق وروابط ہیں، جن سے مدرسہ کے موجودہ نظام میں گزرنا، ناگزیر ہوتا ہے، اس کے متعلق کچھ کارآمد باتیں لکھتا ہوں، انھیں بغور پڑھو!

ملازمت

مدرسہ میں جب تم کارِ تدریس کے لئے داخل ہونا چاہو گے، تو سابقہ مدرسے کے انتظام سے ہوگا، یہ انتظام مدارس میں رائج عام دستور العمل کے تحت ہوتا ہے، اور اس انتظام کو نافذ کرنے والا مدرسہ کا مہتمم یا ناظم ہوتا ہے، دستور کے مطابق تمہارا ایک معاہدہ ہوگا۔

(۱) تمہیں کیا پڑھانا ہے؟
(۲) تعلیم کا دستوری وقت کیا ہے؟
(۳) دورانِ تعلیم وقفے کیا کیا ہیں؟ اور کتنے ہیں؟
(۴) تنخواہ کیا ہوگی، اور اس کی کمی بیشی کے قواعد کیا ہوں گے؟

جب یہ اور اس طرح کی باتیں طے ہو جاتی ہیں، تو تمہارا عمل اس مدرسہ میں جاری ہو جاتا ہے، اس ساری کارروائی کے لئے تمہارا واسطہ ناظم مدرسہ سے پڑتا ہے، اس موقع پر تم کو کس طرح ناظم سے اور اہل انتظام سے معاملہ کرنا چاہئے، میں تمہیں بتاتا ہوں۔

اوپر میں نے جو چار دفعات لکھے ہیں، انھیں دو حصوں میں کر کے گفتگو کرتا ہوں، پہلے حصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ تمہیں اپنے آپ کو کس طرح پیش کرنا ہے، دوسرا حصہ تنخواہ اور معاش سے متعلق ہے۔

میں بڑی دیر سے سوچ رہا ہوں کہ یہ بات تمہیں کیونکر سمجھاؤں، ملا کی دوڑ مسجد تک، مومن کی دوڑ پیغمبر تک! اس بات کو سمجھنے کے لئے میں حضور نبی کریم فداہ روحی ﷺ کی خدمت میں حاضری دے رہا ہوں، اور تم کو بھی اسی پاک بارگاہ میں لے کر چلتا ہوں۔ ایک مومن کو کیا ہونا چاہئے، اجتماعی معاشرہ میں اس کی صفت کیا ہونی چاہئے اسے آپ کے ارشادات کی روشنی میں دیکھو، حضرت ابو ہریرہ ؓ فرمانِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نقل کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: **المومن هين لين حتىٰ تخاله أحمق (شعب الايمان للبيهقي)** مومن

متواضع اور نرم ہوتا ہے، اتنا نرم ہوتا ہے کہ تمہیں خیال ہونے لگے کہ یہ بیوقوف ہے۔ ایک دوسرے حدیث سنو! **المومنون هينون لينون كالجمل الانف، ان قيد انقاد وإذا انيخ علىٰ صخرةٍ استناخ** (کتاب الزہد لابن مبارک) اہل ایمان سادہ متواضع اور نرم مزاج ہوتے ہیں، جیسے نکیل کی وجہ سے زخمی نتھنوں والا اونٹ کہ اگر اسے لیجایا جائے تو چلنے لگتا ہے، اور اگر کسی چٹان پر بیٹھایا جائے تو بیٹھ جاتا ہے۔

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن سادہ طبیعت، متواضع اور نرم مزاج ہوتا ہے، اس کے مزاج کی نرمی اس حد تک ہوتی ہے، کہ لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ اصل بات کی تہ تک نہیں پہونچ پاتا، بہت بھولا بھالا ہے، حالانکہ یہ بات نہیں، وہ سمجھدار ہوتا ہے، مگر طبعی شرافت اور نرمی کی وجہ سے ناگوار باتوں کو اس طرح درگزر کرتا ہے جیسے سمجھا ہی نہیں، سوچو کہ رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر دانا اور ذہین وفطین کون ہوسکتا ہے، لیکن رحمتِ الٰہی کا اثر یہ تھا کہ آپ مزاج کے نہایت نرم تھے، **فبما رحمةٍ من الله لنت لهم**، اس نرمی اور شرافت طبعی کا اثر یہ تھا کہ جو کوئی منافق آپ کی خدمت میں آکر کوئی جھوٹ موٹ بھی کوئی عذر پیش کرتا تھا، تو اسے سنتے تھے اور قبول کر لیتے تھے، یہ آپ کی مہربانی اور نرمی تھی، مگر **يقولون هو أذن** منافقین کہنے لگے تھے کہ آپ تو صرف کان ہیں، جو کہا سن لیا، سمجھتے بوجھتے کچھ نہیں، حالانکہ آپ سب کچھ سمجھتے تھے، مگر آپ کی ذہانت وذکاوت، آپ کی نرمی ومہربانی کے سامنے ماند پڑی رہتی تھی۔

تم نے دیکھا رسول علیہ السلام نے جس صفت کو مومن کی شناخت قرار دیا ہے، وہ صفت آپ کے اندر بدرجۂ کمال تھی، یہ صفت اللہ کو محبوب ہے، اللہ کے رسول کو محبوب ہے، ذہانت کی تیزی اور ذکاوت کی حدت نہ اللہ کو پسند ہے اور نہ رسول کو! علامہ سیّد سلیمان ندوی علیہ الرحمہ نے سیرۃ النبی کی ساتویں جلد میں لکھا ہے، بہت عرصہ ہوا پڑھا تھا کہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق ؓ نے زیاد کو کہیں کا عامل (حاکم) بنایا تھا، پھر کچھ دنوں کے بعد معزول

کردیا، حضرت عمر کا معزول کرنا یا تو کمزوری کی بناپر ہوتا تھا کہ یہ حاکم مظلوموں کو انصاف اور اصحاب حق کو ان کا حق نہیں دلا سکے گا، یا خیانت کی وجہ سے ہوتا تھا کہ جب حاکم ہی خائن ہوگا تو حکومت کا اللہ حافظ!

زیاد نے بہت غور کیا، مگر اپنے اندر ان دونوں خرابیوں میں کوئی خرابی محسوس نہیں ہوئی، انھوں نے جرأت کی اور امیر المومنین سے پوچھ لیا کہ کس امر کے باعث انھوں نے معزول فرمایا ہے، تاکہ اس عیب کی اصلاح ہوسکے، امیر المومنین نے فرمایا کہ نہ کمزوری اور نہ خیانت! لیکن بات یہ ہے کہ تم بہت ذہین ہو، میں نہیں چاہتا کہ تمہاری عقل وذہانت کا بار امت پر پڑے۔

یہ وہ ذہانت تھی جو نرمی مزاج سے معتدل نہیں ہوئی تھی، پھر ذہانت کے جو آثار ہوتے ہیں وہ واقعی عام آدمی کے لئے ناقابل برداشت ہوتے ہیں۔

پس جب تم مدرسہ میں انتظام کے ماتحت پابند کارگزار ہورہے ہو، تو تمہارے مزاج کی نرمی تمہاری ذہانت کی تیزی پر غالب رہنی چاہئے، ناظم مدرسہ کے ساتھ تمہارا معاملہ، تمہاری بات چیت نرم اور متواضع ہونی چاہئے، جس سے معروف میں اطاعت بخوشی اطاعت جھلکے، یہ رویہ ہرگز نہ ہو کہ صاحب انتظام کوئی بات کہے، اور تم اپنی ذہانت وذکاوت کے بل پر اس کے کمزور پہلوؤں کو موضوع کلام بنالو، یا اس میں موشگافیاں کرنے لگو، ہر صاحب انتظام اپنے انتظام میں ایسے شخص کو پسند کرتا ہے جس میں اعتراض وانشقاق سے زیادہ انقیاد واطاعت کا جذبہ دیکھتا ہے، تمہیں دین کا کام کرنا ہے، اس کے لئے جس انتظام کے ماتحت تم داخل ہوئے ہو، حتی الامکان اس کی موافقت کرو، تاکہ تمہاری خدمت آرام سے چلتی رہے، جب تک حرام صریح کا حکم نہ ملے اطاعت ہی ضروری ہے، مناسب یا نامناسب، رائے کے اختلاف سے تعلق رکھتا ہے، ہوسکتا ہے کہ تمہاری رائے صاحب انتظام کی رائے کے موافق نہ ہو، اپنی رائے اس پر تھوپنے سے آسان یہ ہے کہ تم اس کی رائے قبول

کرلو اس سے کام میں الجھن نہ ہوگی، اور اگر الجھن ہوگی تو اس کا حل آسان ہوگا۔ نئے مدرسین اس طرح کے مواقع پر حق گوئی کا نام دے کر اپنی رائے بے ڈھنگے پن سے پیش کرنے کو شجاعت اور بے خوفی سمجھتے ہیں، حالانکہ کیا ضروری ہے، جو بات اس تازہ ناتجربہ کار مدرس نے سوچی ہے وہ حق ہی ہو؟ کل کو خود اسی کی رائے بدل سکتی ہے، اس لئے رائے کے اظہار واصرار میں جلدی نہ کرنی چاہئے، اپنی تعلیمی زندگی میں مَیں نے ایسا بہت دیکھا ہے کہ مدرس کو انتظامیہ کی جس بات پر انکار واعتراض ہوتا ہے، اگر کبھی وہ خود اسی ذمہ داری میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کا بھی طرزِ عمل وہی ہوتا ہے جس پر پہلے اعتراض کرتا تھا۔

انتظامیہ سے موافقت اور عدم منازعت کے باب میں ایک مشہور حدیث ہمیشہ یاد رکھو۔

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسا وعظ فرمایا کہ آنکھیں آنسوؤں سے ابل پڑیں، اور قلوب دہل گئے، ہم نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ تو ایسی باتیں آپ نے ارشاد فرمائی ہیں، جیسے کوئی رخصت ہونے کے وقت نصیحت کرتا ہے، تو حضرت! ہمیں آپ کس چیز کی تاکید فرماتے ہیں؟ فرمایا:

(۱) میں تمہیں ایسی روشن شریعت پر چھوڑ کر جاؤں گا، جس کی رات بھی اسی طرح روشن ہے جیسے دن! میرے اس طریق سے وہی انحراف کرے گا جو برباد اور خائب وخاسر ہوگا۔

(۲) جو کوئی تم میں سے زندہ رہے گا وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا، تو تم میری سنت اور اصحاب ہدایت خلفاء راشدین کی سنت جسے تم جانتے پہچانتے ہو، اسی کو لازم پکڑو۔

(۳) اطاعت وفرمانبرداری کو اپنے اوپر لازم کرلو، اگرچہ تمہارا صاحب امر حبشی غلام ہو، اس بات کو تم دانتوں سے مضبوطی سے پکڑلو، مومن کی مثال نکیل سے زخمی نتھنے والے اونٹ کی سی ہے، جہاں اسے لے جایا جاتا ہے چلا جاتا ہے۔ (ترمذی، احمد، ابن ماجہ)

اس حدیث کا ہر مضمون ایک شمع ہدایت ہے، مومن اس شمع کو اپنے ہاتھ میں رکھے تو

کبھی غلط راہ پر نہ جائے گا، مگر میں جو کچھ تم سے کہنا چاہتا ہوں، وہ اس کا آخری حصہ ہے، جس کو میں نے نمبر ۳ کے عنوان سے لکھا ہے، امیر اور حاکم صاحب انتظام ہوتا ہے، خواہ وہ ملک کا حاکم ہو، خواہ کسی چھوٹے ادارے کا منتظم ہو، حتیٰ کہ سفر میں بھی جب چند رفقاء ہوں، تو ایک کو امیر منتخب کر لینے کا حکم ہے، پھر سب اس کی اطاعت کریں، اسی طرح مدرسہ بھی ایک ادارہ ہے، اس میں متعدد شعبے ہوتے ہیں، ان سب کی خدمات تعلیم علم دین ہی کے محور پر ہوتی ہیں، ان سب کا جو منتظم ہو اس کی اطاعت اور موافقت کرنا، ان سب کے لئے ضروری ہے جو اس نظام سے وابستہ ہیں، اسی بنیاد پر کہتا ہوں کہ مدرسین اگرچہ علماء ہیں، علم، بزرگی اور عمل کے اعتبار سے گو ان کا مرتبہ بلند ہو، مگر صاحب انتظام کی اطاعت ضروری ہے ورنہ اصل کام میں خلل ہوگا۔

ہمارے مدرسوں میں یہ کمی دیکھنے کو ملتی ہے کہ مدرسین انتظامیہ کو تنقید و اعتراض کا نشانہ بنائے رہتے ہیں، اور صاحب انتظام بھی مدرسین سے کھنچا کھنچا بدگمان سا رہتا ہے، دونوں طرف یہ غلطی ہے، اہل تدریس نظام مدرسہ میں خود کو اپنے کارہائے مفوضہ کا پابند بنائیں، انتظام کو انتظامیہ پر چھوڑ دیں، جذبۂ اطاعت کے ساتھ، خوش دلی سے کام پورا کرتے رہیں، اہل انتظام کی مدد کریں، جن باتوں میں ان کی رائے اہل انتظام سے متفق نہ ہو، وہاں بھی اطاعت انھیں کی کریں اور انھیں تنقید و اعتراض کا نشانہ نہ بنائیں۔

مدرسین جب انتظامیہ پر تنقید و اعتراض کرنے لگتے ہیں، تو ان کی مجلسیں بدگمانی، غیبت بلکہ تہمت تک میں مبتلا ہو جاتی ہیں، اور وہ مسلسل گناہ میں ملوث ہوتے رہتے ہیں، اور ان کی صحبت میں رہنے والے طلبہ بھی اس سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ اہل تدریس پورے جوش اور لگن سے کارِ تدریس میں لگے رہیں اور انتظام میں دخل نہ دیں، تو تعلیم کا کام خوب ہوتا رہتا ہے، انتظام کی شکایت کرنے کے بجائے اگر کچھ تکلیف اور دقت ہوتی ہے تو اس کا تحمل کریں، اور تعلیم جو بڑی عبادت ہے اس میں مشغول رہیں، مشکلات کا

حل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا جو ارشاد ہے کہ **تؤدون الحق الذی علیکم وتسألون اللہ الذی لکم** (بخاری: علامات النبوۃ/مسلم: مغازی) پر عمل کریں، یعنی ان پر جو مدرسہ، تدریس اور انتظام کا حق ہے، اسے بحسن وخوبی ادا کریں، اور ان کا جو حق اہل انتظام پر ہے، اس کا سوال اللہ سے کریں۔

علامہ عبدالرووف مناویؒ دلیل الفالحین شرح ریاض الصالحین میں لکھتے ہیں کہ:

> ’’وہ حق جو تم پر ہے، یعنی اطاعت کرنا اور نافرمانی اور بغاوت نہ کرنا، اسے تم کرو، اور جو ان پر تمہارا حق ہے، اس کا سوال اللہ سے کرو، وہ ان کے قلوب کو تمہارے حق کی ادائیگی کے لئے مسخر کرے گا، یا تم کو اس کے عوض میں کچھ اور بہتر چیز عطا فرمائے گا، یہ حکام اگر تمہارا حق واجبی ادا نہیں کرتے، تو اس کی وجہ سے ان کے خلاف نافرمانی اور بغاوت جائز نہیں ہے۔‘‘

آگے لکھتے ہیں:

> ’’اس حدیث سے مقدر پر صبر، فیصلۂ الٰہی پر رضا، خواہ وہ مرضی کے موافق ہو یا خلاف، اور علیم وحکیم پروردگار کے لئے تسلیم وتفویض کا سبق ملتا ہے۔ (دلیل الفالحین، ج:۱، ص:۱۴۰)

میرے عزیز فرزند! تم اب اصطلاح کے مطابق علماء کی صف میں آچکے ہو، تمہاری زبان، تمہاری نگاہ، تمہارا قلب گناہوں سے پاک ہونا چاہئے، دل جب گنہگار نہ ہوگا اور زبان بھی معصیت سے پاک ہوگی، تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ تمہارے اعمال درست ہوں گے اور خطائیں معاف ہوتی رہیں گی، سنو! ہمارے تمہارے اور ساری کائنات کے معبود برحق کیا فرماتے ہیں: **يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوا اللهَ قَوْلاً سَدِيْداً يُّصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيُغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَمَنْ يُّطِعِ اللهَ وَرَسُوْلَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِيْماً** (سورۃ الاحزاب:) اللہ کا تقویٰ کیا ہے؟ معصیت سے دل کی حفاظت، اور قول سدید کیا ہے؟ زبان کی درستگی! ان دونوں پر دو وعدے اور ایک بشارت ہے! ایک وعدہ اصلاح اعمال کا، دوسرا

وعدہ مغفرتِ ذنوب کا، ان دونوں کا مجموعہ اطاعت الٰہی واطاعت رسول ہے، اس پر بشارت عظیم کامیابی اور بامرادی کی!

اس آیت کریمہ کو اپنا دستورالعمل بنالو، زندگی کی تمام جزئیات اسی ایک کلی کے تابع کرلو، اور بے فکر اور مطمئن ہوکر زندگی گزارو، ہر مشکل آسان ہوگی، ہر غلطی درستگی کا راستہ ہموار کرے گی۔

یہاں ایک بات اور بھی ہے، جو بہت ضروری ہے، وہ یہ کہ اہل انتظام کی موافقت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی خوشامد اور چاپلوسی کی جائے، بعض مدرسین اپنی خودغرضی اور دوسروں کی ایذارسانی کے لئے ناظم ومہتمم کا قرب خوشامد اور چاپلوسی کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں، اس کے لئے جھوٹی سچی باتیں بناتے ہیں، دل میں کچھ اور زبان پر کچھ یعنی منافقت کا طرز عمل اختیار کرتے ہیں، اور خود بھی ذلیل وخوار ہوتے ہیں اور مہتمم وناظم کو بھی گمراہ کرتے ہیں، نیز بہت سے اچھے اور کارآمد مدرسین کو اپنی اس حرکت سے پریشانی میں ڈالتے ہیں، یہ ایک مہلک بیماری ہے جو کمزور طبیعتوں میں سرایت کرتی ہے اور مدرسہ اور ادارہ کے زوال کا باعث بنتی ہے، اس مہلکہ سے بہت دور رہو۔

تنخواہ کا مسئلہ:

میں ملازمت کے پہلے موضوع پر بقدر ضرورت کلام کرچکا ہوں، اب اس کے دوسرے موضوع پر کچھ کہنا چاہتا ہوں، یہ ہے تنخواہ اور معاش کا مسئلہ! ابتدائے مکتوب میں کچھ اشارات اس کے متعلق گزرچکے ہیں۔

اس سلسلے میں مَیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اور اب بھی کہتا ہوں کہ تنخواہ کو نہ مقصود بناؤ، اور نہ اسے ذریعۂ معاش قرار دو، میں یہ بھی نہیں کہتا کہ معاش کے لئے کوئی دوسرا کام اختیار کرو، میں جانتا ہوں کہ حصولِ معاش کے لئے کوئی دوسرا کام اختیار کروگے، تو اس کے

تقاضے کچھ دوسرے ہوں گے اور وہ تمہیں اس طرح اپنی گرفت میں لیں گے، کہ تعلیم دین سے رہ جاؤ گے، اس لئے کام تو یہی ایک کرو، لیکن یہ نہ قرار دو کہ تنخواہ تمہارے لئے ذریعۂ معاش ہے، ہاں یہ عطیۂ الٰہی ہے، حیلۂ روزی ہے، اسی کی راہ سے ضرورت کی تمامتر روزی ملتی رہا کرے گی، جب تم اللہ کے کام میں رہو گے، تو اللہ تعالیٰ تمہاری ضروریات کی کفالت فرمائیں گے، جو کچھ تھوڑی بہت تنخواہ تمہیں مل جائے، سو جان سے اللہ کا شکر ادا کرو، اس سے زیادہ کا مطالبہ دل میں بھی نہ لاؤ، یہ تنخواہ تمہاری پوری روزی نہ ہوگی روزی کا ایک جز ہوگی، اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو اسی میں برکت دے کر تمہارے تمام کاموں کو حل کر دیں گے، اور اگر چاہیں گے تو مزید اور کہیں سے عطا کر دیں گے، تمہارا وظیفہ تقویٰ اور توکل ہے، تقویٰ کی حقیقت گناہوں سے بچاؤ اور اطاعت سے لگاؤ ہے، اور توکل کی حقیقت اپنے آپ کو اللہ کی ذمہ داری میں دے دینا ہے، پھر دیکھنا روزی اور آسانی کے کتنے دروازے کھلتے ہیں، کیا تمہیں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر یقین نہیں ہے: **وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهٗ مَخْرَجاً وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَايَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ** (سورۃ الطلاق:) جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرتا ہے، اس کے لئے اللہ تعالیٰ مشکل سے نکلنے کی راہ کھولتے ہیں، اور ایسی جگہ سے اسے روزی دیتے ہیں جہاں سے اس کا وہم وگمان نہیں ہوتا، اور جو کوئی اللہ پر توکل کرتا ہے، اس کے لئے اللہ ہی کافی ہے۔

جو علم تم نے پڑھا ہے، اس علم نے ہمیں یہی سکھایا ہے کہ اسباب سب ناتمام ہیں، لیکن اللہ کی طرف سے برکت مکمل ہے، ہم کو گنتی کا علم نہیں ہے برکت کا علم ہے، جس کا علم ہے اس سے صرفِ نظر کرنا، اور جس کا علم نہیں اس کے پیچھے دوڑنا نادانی ہے۔

اللہ سے مانگنا سیکھو، ان کی روزی بے حساب ہے، مجھے اپنی مدرسہ والی زندگی...... اور یہی کل میری زندگی ہے...... میں بار بار تجربہ ہوا ہے، میں نے کبھی روزی کی گنتی نہیں کی، اور نہ مدرسہ والوں کو اپنی روزی میں دخیل سمجھا۔ دینے والی ہستی وہی ہے چاہے ذرائع مختلف

رہے ہوں، کچھ مدرسے سے ملا، کچھ برکت ہوئی، کچھ نامعلوم ذرائع سے ملا مگر دینے والا ہاتھ ایک ہی رہا۔

میں تمہیں اپنے ابتدائی عہد مدرسی کا ایک تجربہ بتاتا ہوں، یہ اس وقت کی بات ہے جب مدرسہ میں میری تنخواہ فقط ایک سو پچہتر روپئے تھی، اور پڑھاتا تھا بارہ تیرہ کتابیں، عربی پنجم سے عربی دوم تک کی! اس وقت اولاد میں صرف تمہاری بڑی بہن تھی، ایک ماہ ایسا آیا کہ اس میں آدھی سے کچھ زائد تنخواہ ملی تھی، گھر میں دال، آٹا اور چاول موجود تھا، جو رقم ملی تھی وہ ختم ہوگئی، اب کچھ خریدنے کے لئے جیب میں کچھ نہ تھا، اس وقت قرض لینے کی ابھی ہمت نہیں ہوئی تھی، بس جو تھا وہ سادہ سادہ پکتا رہا، دال تھی تو بگھارنے کے لئے تیل نہ تھا، ترکاری اور گوشت کے نام پر کچھ نہ تھا، ایک ہفتہ اسی کیفیت میں گزرا، لیکن دل میں کبھی یہ خیال نہ آیا کہ جو تنخواہ ملنے سے رہ گئی ہے، اس کا تذکرہ میں مہتمم مدرسہ سے کردوں، روزانہ ملاقات ہوتی تھی، بہت بہت دیر تک باتیں بھی ہوتیں، مگر نہ کبھی میں نے ذکر کیا، اور نہ دل میں کوئی شکایت آئی، میں یہی سوچتا تھا، کوئی استحقاق تو ہے نہیں محض فضل الٰہی ہے، تو اپنے جیسے محتاج بندے سے کیا ذکر کروں؟ اور اس کی کیا شکایت کروں؟

ایک ہفتہ اسی طرح گزرا تھا کہ ایک روز بعد نماز عشاء دو بہت خاص مہمان وارد ہوئے، میں تو دال روٹی کھا چکا تھا، میں سوچ میں پڑ گیا کہ ان مہمانوں کو کیا کھلاؤں، گھر مدرسے سے دور تھا اور وہاں کا حال معلوم تھا۔ اب مجبور ہوا، ایک طالب علم کو بلایا کہ تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں؟ اس نے بتایا کہ ہیں! میں نے کہا بازار جاؤ اور ہوٹل سے اچھا کھانا دو آدمی کے بقدر لاؤ۔ وہ لے آیا، میں نے ان مہمانوں کی خاطر اس سے کی، عشاء کے بعد کا وقت تھا، اس وقت تو یہ انتظام ہوگیا، اب پھر سوچتا رہا کہ صبح کو ناشتہ کیسے اور کیا کراؤں؟ گھر پر جو کچھ تھا وہ عرف و رواج کے اعتبار سے مہمان نوازی کے لائق نہ تھا، جیب میں پھوٹی کوڑی نہ تھی کہ کچھ اور انتظام کرتا، مگر طبیعت مطمئن تھی، گرمی کا موسم تھا، میں گیارہ بجے گھر پہونچا، کچھ سوچ

کر دل میں ایک فیصلہ کیا، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سویا، پھر اٹھ گیا، کچھ نمازیں پڑھیں، پھر بالحاح وزاری اللہ سے دعا مانگی۔

اس وقت میری عادت تھی کہ صبح صادق سے پہلے گھر سے نکل جاتا، مدرسہ پہونچتے پہونچتے بیس منٹ کا وقفہ گزرتا، میں جا کر فجر کی اذان پکارتا، پھر طلبہ کو جگاتا، فجر کی نماز کے بعد مسجد سے نکلا تو مدرسہ کے مہتمم صاحب مل گئے، وہ بہت باتونی تھے، دیر تک باتیں کرتے رہے، پھر وہ رخصت ہوئے تو میں اپنے حجرے میں داخل ہوا، جونہی حجرہ کا دروازہ بھیڑا تھا کہ مہتمم صاحب آواز دیتے ہوئے پلٹ کر آئے، کہ میں کئی روز سے آپ کے لئے پیسہ جیب میں رکھے ہوئے ہوں، دینا بھول جاتا ہوں، ابھی یاد آیا، میں نے وہ پیسہ لے لیا، وہ ستر روپئے تھے، دروازہ بند کیا، اور جذبۂ شکر نے آنکھوں کے دہانے کھول دئے، جی بھر شکر الٰہی میں رویا، پھر عمدہ ناشتہ تیار کرایا، رخصت کرتے وقت دونوں کو کرایہ بھی دیا، پھر اس میں اتنی برکت ہوئی کہ کافی دنوں تک اسی سے کام چلتا رہا۔

یہ ایک واقعہ ہے، اور ابتداء کا ہے، اس کے بعد ۳۶/۳۵ سال میں اللہ جانے کتنے واقعات ایمان بڑھاتے رہے، آج سے بارہ تیرہ سال پہلے میں نے ’’تحدیث نعمت‘‘ کے عنوان سے اللہ تعالیٰ کے غیبی فضل وکرم کے واقعات کو جو میرے اوپر مدرسوں کے تعلق سے یا میرے گھر کے تعلق سے ہوئے، لکھنا شروع کیا تھا۔ بہت کچھ لکھنے کے بعد خیال آیا کہ تمہاری حیثیت ہی کیا ہے؟ یہ تو اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی حرکت ہے، پس بند کر دیا، اور لکھا ہوا بھی ناپید کر دیا۔

تم میرے بیٹے ہو، تمہاری نصیحت کے لئے یہ لکھ دیا۔ بات یہ ہے کہ میں نے کبھی دنیا کے مال وجاہ کا ارادہ نہیں کیا، جو کچھ فضل الٰہی سے مل گیا شکر گزار رہا، اور ملا تو بہت ملا، میرے اندازۂ وہم وگمان سے بہت زیادہ ملا۔ یہ محض فضل ربی ہے، ورنہ میری ناکارگی مجھے کہیں کا نہ رہنے دیتی۔ بس پروردگار کا شکر ہے، میں تم لوگوں سے بھی یہی چاہتا ہوں کہ دنیا

کے مال وجاہ کو مقصود نہ بناؤ، اور نہ اسے اتنی اہمیت دو کہ زندگی کا زیادہ وقت یہی فکر گھیر لے، حدیث میں ہے:

من كانت الآخرة نيته جعل الله غناه في قلبه وجمع له شمله وأتته الدنيا وهي راغمة ومن كانت الدنيا نيته فرق الله عليه شمله وجعل فقره بين عينيه ولم ياته الدنيا إلا ما قدر له (مسند دارمی، حدیث: ۲۳۵)

جس کا مقصد اور نیت آخرت ہوگی، اس کے قلب میں حق تعالیٰ غنا اور بے نیازی کی کیفیت پیدا کردیں گے، اور اس کے احوال درست فرمادیں گے، اور دنیا اس کے پاس ناک رگڑتی آئے گی، اور جس کسی کی نیت دنیا ہوگی، اس کے اوپر اس کے احوال کو اللہ تعالیٰ پراگندہ کردیں گے، اور اس کی نگاہوں کے سامنے فقر وتنگدستی مسلط کردیں گے، اور دنیا تو بقدر مقدر ہی ملے گی۔

اس حدیث کو اپنا وظیفۂ زندگی بناؤ، اللہ کی رضا، آخرت کی فلاح کو اپنی تعلیم وتدریس کا مقصود بناؤ۔

مدرسہ کی دوسری ذمہ داریاں:

میرے استاذ گرامی حضرت مولانا افضال الحق صاحب قاسمی مدظلہٗ نے اس وقت جب میں رسمی طالب علمی سے فارغ ہو رہا تھا، چند نصیحتیں کی تھیں، وہ نصیحتیں میری زندگی میں بہت موثر ومفید ثابت ہوئیں، ان سے ایک نصیحت یہ تھی کہ:

> ''جب تمہیں کوئی ذمہ داری مدرسہ اور امورِ مدرسہ سے متعلق دی جائے تو اسے خوشی سے قبول کرلو، معذرت نہ کرنا۔ ذمہ داری سے آدمی کی شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے، تجربہ بڑھتا ہے، زندگی کا شعور حاصل ہوتا ہے۔''

میں حالانکہ جہاں تک مجھے اپنے بارے میں علم ہے، کسی کام اور کسی انتظام کا آدمی نہیں ہوں، مجھے پڑھنے اور پڑھانے کا شوق ہے، اس کے علاوہ کسی انتظام سے مجھے قطعی

مناسبت نہیں ہے، لیکن مولانا نے فرمایا تو میں نے مدرسہ کی کسی ذمہ داری سے معذرت نہیں کی، مدرسوں میں بیت الخلاء واستنجا خانہ کی صفائی اور فراشی سے لے کر مدرسوں کی نظامت تک ہر ایک ذمہ داری میں نے قبول کی، اور نصرت الٰہی کے کرشمے دیکھے ہیں، صرف تعمیرات کا شعبہ ایسا ہے جس سے مجھے قطعاً مناسبت نہ ہوسکی، اور بحمد اللہ اس کی ذمہ داری بھی مجھے کہیں نہیں دی گئی۔

اس کے ساتھ ایک بات بتاؤں، میں نے کسی ذمہ داری کا کوئی مالی معاوضہ نہیں لیا، اپنی ذمہ داری سمجھ کر کام کیا، صرف ایک مدرسہ میں طلبہ کی تقریری انجمن کے بہت سے ذمہ داروں کو معاوضہ تنخواہ میں محسوب کر کے دیا گیا، تو مجھے بھی اس میں شامل کیا گیا تھا، مگر میں نے اس کی طرف کبھی التفات نہیں نہ کیا، پھر اللہ نے متعینہ تنخواہ ہی میں اتنی برکت دی کہ بجز ابتدائی چند دنوں کے مجھے تنگدستی کا کبھی احساس نہیں ہوا۔

میں اپنے بیٹوں اور تلامذہ کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ وہ مال وجاہ کو مطمح نظر نہ بنائیں، یہ دونوں بقدر مقدر مل کر رہیں گے، نہ زیادہ نہ کم! دل کی توجہ کو دنیا میں نہ لگائیں، حتی الامکان دینے کا مزاج بنائیں، لینے کا مزاج صرف اللہ کی بارگاہ سے! مخلوق سے بالکل نہیں، وہ بہت کافی ہیں۔

میں نے سفر حج میں تم سے کہا تھا، کہ اللہ تعالیٰ نے روزی آسان فرمائی ہے تو اسی آسانی سے دوسروں پر خرچ کیا کرو، ملتی رہے گی، اور تم نے اس کا تجربہ بھی کرلیا ہے۔

بس مقصد صرف دین ہو، دین کی خدمت ہو، علم دین کی خدمت ہو، اور معاوضہ صرف اللہ سے مانگو، یہی تمام انبیاء کی سنت ہے، اور یہی بات اللہ کو پسند ہے، مدرسہ کو تجارت گاہ اور علم کو سامانِ تجارت نہ بناؤ، مدرسہ کی ذمہ داریوں کو کاروبار نہ سمجھو، جتنا ہوسکے مدرسہ کی خدمت کو دارین کی سعادت سمجھو، تم تو میرے ساتھ سفر حضر میں بہت رہے ہو، میرے سفروں سے مدرسہ کی کس قدر مالی اعانت ہوتی ہے، ایسا بھی کبھی ہوا کہ مالی اعانت ہی کے لئے میں

نے سفر کیا ہے اور حساب کتاب تمہارے ہاتھ میں رہا ہے، کبھی تم نے دیکھا کہ میں نے کرایہ، سفر خرچ، معاوضہ مدرسہ سے لیا ہو؟ ہاں مدرسہ کی طرف سے میری رعایتیں ہیں اور میں ان رعایتوں کا شکر گزار بھی ہوتا ہوں، اور حسن تلافی کا انتظام بھی کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ تمہیں توفیق دیں، میں نے بہت کچھ کہہ دیا، زندگی اور عمل کا یہی دستور بناؤ۔

تکملہ (۱)

حضرات اہل تدریس، علماء کی ایک اہم ترین جماعت ہیں۔ علماء دو طرح کے ہیں، علماء ربانیین اور علماء سوء! ان دونوں میں فرق و امتیاز کرنا ضروری ہے، تا کہ دانستہ یا نادانستہ علماء سوء کی صف میں نہ جا شامل ہوں۔

امام محمد بن حسین آجری علیہ الرحمہ نے رسالہ ”اخلاق العلماء“ میں دونوں گروہوں کے اوصاف و احوال لکھے ہیں، ہم انھیں قدرے تلخیص و اختصار کے ساتھ یہاں نقل کرتے ہیں۔

شہرت علم کے حقوق و آداب

تواضع:

اللہ تعالیٰ جب عالم کو شہرت و ناموری بخشیں اور مسلمانوں میں عالم کی حیثیت سے اس کا تعارف ہو جائے اور لوگ اپنی علمی ضروریات اس کے پاس لانے لگیں تو اس کا فریضہ ہے کہ خواندہ و ناخواندہ ہر ایک کے ساتھ تواضع کا برتاؤ کرے، اگر کوئی شخص علم میں اس کے ہم پایہ ہو تو اس کے سامنے تواضع و فروتنی اس لئے ضروری ہے کہ ملنے کا یہ انداز اس کے دل میں محبت و تعلق کا تخم بو دے گا، پھر اس طرح کے لوگ اس کے پاس آنا اور بیٹھنا پسند کریں گے، یہ موجود نہ ہوگا تو اس کی ملاقات کے لئے بیتاب ہوں گے۔ اپنے سے بڑے علماء کے ساتھ تواضع اس لئے ضروری ہے کہ علم یہی ادب سکھلاتا ہے اور اپنے سے کم علم لوگوں سے بھی تواضع ہی کا برتاؤ کرے کیونکہ علم کی فضیلت اور مرتبہ خدا کے نزدیک بھی اور بندوں کے

نزدیک بھی اسی تواضع کی وجہ سے ہے۔

خدا کی رضا:

ایسے عالم کو اپنے علم، اپنے صدق، اپنے حسن نیت، ہر حال میں خدا کی رضا پر ہی نگاہ رکھنی چاہئے، اپنے علم کو زینہ بنا کر بادشاہوں کے دربار تک چڑھنے کی کوشش بالکل نہ کرے، نہ اپنے علم کو ان کے پاس لے کر جائے، علم کو نااہلوں سے بچائے اور اس پر کوئی اجرت اور معاوضہ نہ قبول کرے، علم کو ضروریاتِ دنیوی پورا کرنے کا ذریعہ نہ بنائے، ایسا ہرگز نہ ہو کہ دنیاداروں کا قرب اختیار کرے اور فقراء سے دور بھاگے، لیکن یہ بھی نہ ہو کہ دنیاداروں سے بالکل ہی کنارہ کشی اختیار کرلے، فقراء اور نیکوکاروں سے جھک کر ملے تاکہ وہ لوگ اس سے فائدہ اٹھاسکیں۔

مجلس کا انداز:

اور اگر اس نے کسی علمی مجلس کا اہتمام کر رکھا ہو تو شرکاء مجلس کے ساتھ حسن مدارات کے ساتھ پیش آئے، سوال کرنے والوں سے نرم برتاؤ کرے، اور اہل مجلس کے ساتھ حسن اخلاق اختیار کرے اور بد خلقی سے پرہیز کرے۔ شرکاء مجلس میں جو لوگ کند ذہن ہوں ان کے حق میں صبر سے کام لے تاکہ وہ بات کو اچھی طرح سمجھ لیں، اگر کوئی گستاخی کرے تو اسے نرمی سے برداشت کرے، اہل مجلس کو اچھے آداب واخلاق کا خوگر بنائے، انھیں لایعنی مشغولیات میں مبتلا ہونے سے بچائے اور جو کچھ علمی فیضان کر رہا ہے اس کی جانب انھیں متوجہ کرتا رہے اور انھیں پابند بنائے کہ خاموشی کے ساتھ اس کا کلام سنیں اور اگر کسی سے علماء کی شان کے خلاف کسی عمل یا اخلاق کا صدور ہو تو اس کو محض خاموش کرنے اور اس پر حجت قائم کرنے کے لئے زجر وتوبیخ نہ کرے بلکہ اسے نرمی اور آہستگی سے سمجھادے کہ اس طرح کا عمل اہل علم کی شان سے گرا ہوا ہے، اہل علم کو اس سے دور رہنا چاہئے، اس طرح سمجھائے

کہ بات اس کے دل میں گھر کر جائے اور محض اس کی نرمی وملاطفت کی وجہ سے وہ اس عمل کے ترک پر آمادہ ہوجائے۔

سوال کرنے والوں کی رعایت:

اگر کوئی شخص لایعنی اور بے کار سوال کرے تو اسے روک دے اور بتائے کہ کام کی باتیں پوچھا کرو، اگر دیکھے کہ جس علم کی انھیں ضرورت ہے اس سے غفلت برت رہے ہیں تو اسے ظاہر کردے اور انھیں سمجھائے کہ اس علم کے وہ کس درجہ محتاج ہیں، پوچھنے والے کو ہرگز نہ جھڑکے، اس سے خوامخواہ اس کی رُسوائی ہوگی، اور نہ سختی کے ساتھ اسے روکے، اس سے عالم کی وقعت اس کے دل سے نکل جائے گی، لیکن اسے سوال پورا کرنے کی اجازت دے تاکہ اس کا مطلب بخوبی سمجھ سکے اور اسے ان علوم ضروریہ کی ترغیب دے جن کا تعلق فرائض کی ادائیگی اور محرمات سے اجتناب کے ساتھ ہے، ایسا شخص جس کے سوال کا مقصد یہ معلوم ہو کہ وہ اس علم کا محتاج ہے اور اس پر اسے عمل پیرا ہونا ہے، اس پر پوری توجہ کرے، اور اگر یہ محسوس ہو کہ اس کے سوال کا مقصد محض بحث اور مناظرہ ہے تو اس سے اعراض کرے، جن کوتاہیوں اور نقصانات کو وہ دور سمجھ رہے ہوں حکمت ودانائی سے ان کا قریب ہونا ظاہر کرے، گستاخ کے سامنے حلم ومتانت اختیار کرکے خاموشی کو ترجیح دے، اور خیر خواہی کے ساتھ علم وحکمت کا فیضان کرتا رہے، اہل مجلس کے حق میں اس طرح کے اخلاق وآداب کی رعایت کرے۔

جواب کے آداب:

اور جو لوگ اس سے علم اور مسائل کی تحقیق کرنا چاہتے ہوں اس کے متعلق یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اگر اس کے پاس علم ہو تو جواب دے اور اس کا اصول یہ ہے کہ جواب قرآن وسنت سے ہو یا اجماع سے، اگر کوئی ایسا مسئلہ ہو جس میں اہل علم کا اختلاف ہے تو

پوری کاوش سے دیکھے کہ کون سا قول کتاب وسنت اور اجماع سے قریب تر ہے، اس پر فتویٰ دے، اور بحث وتحقیق میں اقوالِ صحابہ اور ان کے بعد کے فقہاء کے اقوال سے باہر نہ نکلے۔ اگر اس کی تحقیق کسی صحابی یا کسی امام کے قول کے موافق ہے تو اسی کو اختیار کرے، اور اگر اس کی تحقیق اقوال صحابہ اور اقوال الائمہ کے دائرہ سے باہر نکل رہی ہے تو ہرگز اسے اختیار نہ کرے، اپنی رائے کو ناقص سمجھے، اور اگر اس سے بڑا کوئی عالم موجود ہے تو اس سے دریافت کرے تاکہ حق اس پر واضح ہو اور خدا سے بھی دعا کرتا رہے کہ وہی خیر وحق کی توفیق عنایت فرمائیں۔

اگر سوال ایسا ہے جس کا جواب معلوم نہ ہو تو اپنی لاعلمی کے اظہار میں قطعاً نہ شرمائے اور اگر مسئلہ ایسا ہو کہ اس کے اظہار سے لوگوں میں خوامخواہ ہیجان اور شور وشغب ہوگا تو اس کے بتانے سے معذرت کرے، اور نرمی ومہربانی کے ساتھ اس سے بہتر کی جانب متوجہ کردے، اگر کسی مسئلہ میں فتویٰ دینے کے بعد معلوم ہو کہ اس سے غلطی ہوئی تو اس سے رجوع کرلے، اگر اس نے کوئی بات کہی پھر دوسرے کسی عالم نے اس کی تردید کی، خواہ تردید کرنے والا اس سے بڑا ہو یا اس کے ہم رتبہ یا اس سے کم درجہ، ہر صورت میں اگر اس پر واضح ہوجائے کہ حق بات وہی ہے جو دوسرے نے کہی تو بلا تأمل مان لے، اور اس کا شکر گزار ہو اور اس کا بہتر بدلہ دے۔

اگر اس سے ایسا کوئی مسئلہ دریافت کیا گیا جس میں قول فیصل کی وہ تعیین نہیں کر پا رہا ہے، تو بے تکلف کہہ دے کہ کسی اور سے معلوم کرلو۔ جس مسئلہ میں تردد ہو، اس کے جواب میں خوامخواہ تکلف نہیں کرنا چاہئے۔ مسائل بدعیہ سے سخت احتراز کرے، اہل بدعت کی بات ہرگز نہ سنے، نہ اہل بدعت کی مجالست اختیار کرے اور ان سے بحث ومباحثہ بھی نہ کرے، اصل علم کتاب وسنت، طریقۂ صحابہ وتابعین اور اقوال ائمہ ہیں، اتباع کا حکم دے اور ابتداع سے منع کرے، علماء سے بحث وجدال نہ کرے اور نہ بیوقوفوں سے الجھے، تلاوتِ کلام

اللہ اس نیت سے کرے کہ اللہ کی مرضی پا سکے، اور سنت میں اشتغال اس لئے رکھے کہ اللہ کے حقوق و آداب ضائع نہ ہونے پائیں، اور عبادتِ الٰہی کے طریقے معلوم ہوتے رہیں۔ غافلوں کو نصیحت کرے، جاہلوں کو علم سکھائے، حکمت کی بخشش، جو اس کے اہل ہوں ان پر کرے، اور نا اہلوں سے اسے محفوظ رکھے، ایسے عالم کی مثال طبیب جیسی ہے، طبیب جانتا ہے کہ دوا کس موقع پر فائدہ کرے گی۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے علمی شہرت عطا فرمائی ہو، انھیں اس جیسے اخلاقِ فاضلہ اور اوصافِ حمیدہ کا حامل ہونا چاہئے، جس قدر اس کے علم میں اضافہ ہو اس کی تواضع و خشیت بڑھتی رہے، سربلندی کا طالب محض خدا سے ہو، پھر علم کی وجہ سے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں ان کے متعلق شدت کے ساتھ خدا سے ڈرتا بھی رہے۔

☆☆☆☆☆

عوام الناس کے ساتھ معاشرت

جس قسم کے عالم دین کا ذکر ہم کر رہے ہیں، اس کے اخلاق کی شان یہ ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ معاملہ کرنیوالا، اس کے شر سے مطمئن رہتا ہے اور اس کا ہمنشیں اس کے خیر کا امیدوار ہوتا ہے، وہ چھوٹی باتوں پر گرفت نہیں کرتا، کسی کی غلطی کا چرچا نہیں کرتا، کسی کی چغلخوری کی وجہ سے تعلقات منقطع نہیں کرتا، اگر کسی سے رنجش ہوتی ہے تو اس کے پوشیدہ راز نہیں کھولتا، اور نہ ناحق اس سے انتقام لیتا، بلکہ اسے معاف کرتا اور اس سے درگزر کرتا ہے، حق کے سامنے سپر انداز اور باطل کے حق میں سخت ہوتا ہے، اپنی ایذاء پر غصہ پی جانے والا اور خالق کی نافرمانی پر سخت بغض رکھنے والا، بیوقوف کا جواب خاموشی سے اور عالم کا جواب اس کی بات کی قبولیت سے دیتا ہے، نہ مداہنت کرتا نہ دشمنی رکھتا، نہ اتراتا، نہ حسد کرتا، نہ کینہ پرور ہوتا، نہ بیوقوف ہوتا، نہ خشک ہوتا، نہ سخت دل ہوتا، نہ طعنہ دیتا، نہ طنز کرتا، نہ غیبت کرتا، نہ بُرا بھلا کہتا، جو احباب خدا کی طاعت میں اس کے مددگار ہوتے ان کی صحبت

اختیار کرتا ہے، اور جن چیزوں سے خالق کی ناراضگی ہوتی ہے ان سے منع کرتا ہے، جن لوگوں کی طرف سے اطمینان نہیں ہوتا، اپنے دین وایمان کی حفاظت کی خاطر ان کے ساتھ بھی حسن سلوک کرتا ہے، بندوں کے حق میں صاف دل، کینہ اور حسد سے پاک ہوتا ہے، اہل ایمان کے لئے اس کے دل میں آخری امکانی حد تک حسن ظن کا جوش ہوتا ہے، کسی کی نعمت وخوشی کا زوال نہیں چاہتا، اس کی نرم دلی کی وجہ سے اگر کوئی گستاخی کر بیٹھتا ہے تو اس کے ساتھ بھی مدارات ہی کا برتاؤ کرتا ہے، اگر کسی کی جہالت وگستاخی سے کبھی اسے حیرت واستعجاب ہونے لگتا ہے تو وہ یہ سوچ کر اپنی حیرت دور کر لیتا ہے کہ اللہ عزوجل کے حق میں میری جہالت اور گستاخی اس سے کہیں بڑھی ہوئی ہے، اس سے کسی بدی کا اندیشہ اور کسی دغا کا خوف نہیں ہوتا، عام لوگ اس سے راحت میں ہوتے ہیں، البتہ خود اس کا نفس پوری مشقت میں رہتا ہے۔

☆☆☆☆☆

خدا کے حضور میں

ایک عالم ربّانی کے یہ جتنے اوصافِ حمیدہ اور اخلاق فاضلہ ہم نے ذکر کئے، یہ سب خداوند تعالیٰ کی توفیق سے کسی ایسے عالم میں جمع ہوتے ہیں، جسے ان سب کی توفیق مل گئی ہو، پھر ظاہر ہے کہ خود خدا تعالیٰ کی جناب میں اس کے ذوقِ عبودیت اور شوقِ طاعت کا کیا حال ہوگا۔ یقیناً حق تعالیٰ اس کے قلب کو وہ کیفیت عطا فرما دیتے ہیں کہ اسے ایک طرح کی خصوصیت اور امتیاز حاصل ہو جاتا ہے، اور یہ اس علم کی برکت ہے جس سے حق تعالیٰ نے اسے نواز کر انبیاء کا وارث اور اولیاء کا قرۃ عین اور بیمار دلوں کا مسیحا بنایا ہے۔

اس کا حال سنئے! وہ خدا تعالیٰ کا شاکر وذاکر ہوتا ہے، محبت خداوندی کی حلاوت سے سرشار، مناجاتِ الٰہی میں فارغ ویکسو، تمامتر طاعت وعبادت کے باوجود اپنے آپ کو

گنہگار وخطا کار شمار کرتا اور حسن عمل پر دوام کے باوجود خود کو پُر تقصیر سمجھتا ہے، خدا کی پناہ اس نے ڈھونڈھی، خدا نے اسے قوت بخشی، خدا پر اعتماد وتوکل کیا پھر کسی کا خوف دل میں نہیں لایا، اللہ کو پا کر ہر چیز سے بے نیاز ہو گیا، ہر چیز میں خدا ہی کا محتاج رہا، اس کو اُنس ہے تو محض اللہ سے، اور وحشت ہر اس چیز سے ہے جو خدا سے اسے ہٹا دے، اس کا علم بڑھتا ہے تو خدا کی حجت پختہ ہونے سے خائف ہوتا ہے، سابقہ اعمال صالحہ کے سلسلے میں عدمِ قبولیت سے ڈرتا رہتا ہے، تلاوت کلام اللہ کرتے وقت اس کی فکر رہتی ہے کہ اپنے مولیٰ کی بات سمجھ لوں اور سنت رسول میں اشتغال اس لئے ہوتا ہے کہ اس میں تفقہ حاصل کر لے، مبادا کوئی حکم ضائع نہ ہو جائے، قرآن وسنت کے آداب سے مزین ہوتا ہے، اہل دنیا سے دنیاوی عزت کے سلسلے میں کوئی مسابقت نہیں کرتا اور دنیاوی ذلت سے اسے کچھ گھبراہٹ نہیں ہوتی، زمین پر تواضع، وقار اور سکون کے ساتھ چلتا ہے، اس کا دل ہر وقت عبرت پذیری میں مشغول رہتا ہے، اگر کبھی اس کا دل اللہ کی یاد سے خالی ہو جائے تو اس کے نزدیک سخت مصیبت ہے، اگر اللہ کی اطاعت بغیر حضور قلب کے ہو تو سخت محرومی اور خسارہ، ذاکروں کے ساتھ ذاکر، غافلوں کی حالت سے عبرت پذیر، اپنے عیوبِ نفس سے واقف اور اسے مُتَّہم جاننے والا، علوم میں اتنی وسعت کہ سمجھ بالکل کھلی ہوئی، جس کا اثر یہ ہے کہ ذاتِ حی وقیوم سے حیا وشرم اس کے دل میں سما گئی، تمام اعمال میں مشغولی بحق مسلسل اور ماسوا اللہ سے انقطاع ویکسوئی مکمل۔

☆☆☆☆☆☆

علماءِ سوء کے اوصاف وعادات:

اگر کوئی مجھ سے کہے کہ اچھا ہمارے سامنے ایسے علماء کے کچھ احوال بیان کرو جن کا علم ان کے خلاف ان پر حجت ہے تاکہ ہم کسی اہل علم کو دیکھیں تو پہلے اس کے احوال واخلاق کو پرکھ لیں، اگر اس میں ایسے اخلاق وعادات ہوں جو اہل علم کی شان کے لائق نہیں

ہیں تو ہم ان سے اجتناب کریں اور سمجھ لیں کہ ابھی ان کی جو باتیں پوشیدہ ہیں وہ ان سے بھی بدتر ہوں گی جو ظاہر ہوگئیں اور ہم یہ بھی جان لیں کہ یہ شخص فتنہ ہے تو اس سے پرہیز ہی کرنا چاہئے، کہیں ہم بھی اسی کی طرح فتنہ میں نہ پڑ جائیں۔ واللہ موفقنا للرشاد

ہم عرض کریں گے ٹھیک ہے ہم کچھ ایسی باتیں بیان کئے دیتے ہیں جنھیں اہل علم سن لیں اور غور کر لیں کہ ان میں یہ اخلاق مذمومہ اور عادات قبیحہ موجود تو نہیں ہیں، اگر ہوں تو اللہ سے معافی چاہیں، اور ان سے فوراً باز آجائیں، اور وہ اخلاق اختیار کریں جو اہل علم کی شان کے مناسب ہیں، جن سے حق تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور ایسی عادات یکلخت ترک کر دیں جن سے حق تعالیٰ کی جناب سے دوری ہوتی ہو۔

ایسے عالم کی ایک بے ہودہ صفت یہ بھی ہے کہ نمائش کے لئے علم حاصل کرتا ہے اور لڑنے کے لئے دلائل فراہم کرتا ہے، جس سے تعلق ہوتا ہے اسے فتویٰ میں سہولت دیتا ہے، اور جس سے تعلق نہیں ہوتا اس کے حق میں تشدد کرتا ہے، بعض رائیں اسے ناپسند ہوتی ہیں لیکن اہل تعلق کو ضرورت ہوتی ہے تو سہولت کے خیال سے وہی ناپسندیدہ مسئلہ بتا دیتا ہے، بلکہ اس پر عمل بھی کر لیا کرتا ہے، جس کو پڑھاتا ہے تو اسلئے پڑھاتا ہے کہ دنیا کا کچھ نفع حاصل ہو، اگر یہ مقصد پورا ہوتا ہے تو آسانی سے اسے پڑھا دیتا ہے اور اگر یہ مقصد پورا ہوتا دکھائی نہیں دیتا بلکہ صرف حصول آخرت ہی اس پر مرتب ہوتا ہے، تو اسے گرانی ہونے لگتی ہے، ایسے علم پر بھی ثواب کی امید باندھتا ہے جس پر اس کا عمل نہیں۔ یہ نہیں سوچتا کہ اس پر کتنا سخت مواخذہ ہوگا۔ جن لوگوں کے احوال مستور و مخفی ہیں ان کے ساتھ بدگمانی قائم کر کے اللہ سے ثواب کی امید رکھتا ہے اور اس کا خوف اسے نہیں ہوتا کہ دنیاداروں کے ساتھ مداہنت کا برتاؤ کر کے خدا کے غضب میں گرفتار ہو چکا ہے، حکمت کی باتیں بولتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ وہ اس کا اہل ہے اور یہ نہیں خیال کرتا کہ ترکِ عمل کی وجہ سے اس پر حجت الٰہی قوی ہوتی جا رہی ہے، کوئی بات جان لیتا ہے تو فخر و غرور سے اس کا سر اونچا ہو جاتا ہے اور

اگر کوئی بات نہیں جانتا اور اسے ضرورت ہوتی ہے تو عار کی وجہ سے اسے چھوڑ دیتا ہے۔

اگر اس کے دَور میں علماء کی تعداد زیادہ ہو اور زمرۂ علماء میں ان کا شمار ہوتا ہو تو چاہتا ہے کہ اس کا بھی تذکرہ ان میں ہو۔ اگر کسی مسئلہ میں اس سے سوال نہ کیا جائے اور دوسرے علماء سے پوچھا جائے تو اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ مجھ سے دریافت کیا جائے، حالانکہ اس پر اسے خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے تھا کہ چلو میں ذمہ داری سے چھوٹا، اور اگر کسی دوسرے نے مسئلہ بتایا اور اس کا بتایا ہوا مسئلہ غلط ثابت ہو گیا تو اسے بہت خوشی ہوتی ہے، حالانکہ اسے رنج ہونا چاہئے تھا۔ اگر کسی عالم کی وفات ہوتی ہے تو یہ خوش ہوتا ہے کہ اب لوگ اس کے محتاج و نیاز مند ہوں گے، اگر اس سے کوئی ایسی بات پوچھی جائے جو اسے معلوم نہ ہو تو اسے اپنی لاعلمی کا اقرار کرنے میں عار محسوس ہوتا ہے اور تکلف کر کے ایسا جواب دیتا ہے جس کی گنجائش نہیں ہوتی، اگر اسے معلوم ہو کہ فلاں آدمی مسلمانوں کے لئے اس سے زیادہ مفید ہے تو اس کی زندگی اسے ناپسند ہو جاتی ہے اور لوگوں کی رہنمائی اس کی جانب نہیں کرتا۔ اگر اس نے کوئی بات بتائی اس کی یہ بات مان کر لوگوں نے اتباع کر لیا اور جاہلوں کے نزدیک اس کی وجہ سے ایک مقام و مرتبہ اسے حاصل ہو گیا، پھر معلوم ہوا کہ بات غلط تھی، تو اب اسے اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں عار محسوس ہوتا ہے۔ غلطی کا اعتراف تو ایک طرف رہا اس اندیشہ سے کہ اس کا مرتبہ مخلوق کی نگاہ سے گر نہ جائے، اپنے اس غلط قول کی حمایت میں دلائل فراہم کرنے لگتا ہے۔

اپنے کو زمرۂ علماء میں شمار کرتا ہے، حالانکہ اعمال اسکے سب احمقوں والے ہیں۔

دنیا کی محبت، جھوٹی تعریف کی خواہش اور جاہ و منزلت کی حرص نے اس کو فتنہ میں ڈال رکھا ہے، علم کے ذریعہ اپنی ایسی آرائش کرتا ہے جیسے کوئی خوبصورت عورت کپڑوں سے اپنے کو سنوارتی ہے، لیکن اپنے علم کو عمل سے مزین نہیں کرتا۔

ہر عالم کو چاہئے کہ ان خصائل پر اچھی طرح غور کر لے، اگر اس کے اندر ان باتوں

میں سے کوئی چیز موجود ہو تو اللہ سے شرمائے اور فوراً درستگی اور حق کی جانب رجوع ہو، اب ہم اس سلسلے میں کچھ آثار وروایات نقل کرتے ہیں۔

فکر معاش:

اس قسم کے عالم کی ایک صفت یہ ہے کہ اس کی فکر زیادہ تر معاش کے ساتھ وابستہ رہتی ہے، فقر وغربت کے اندیشہ سے ایسے مواقع میں بھی جا پڑتا ہے، جو جائز نہیں ہوتے، جتنی روزی مل چکی ہے اس پر قانع نہیں، اور جو کچھ تقدیر سے ابھی نہیں حاصل ہوا ہے، اس کے بارے میں یہ بدگمانی کہ کس قدر تاخیر ہو رہی ہے، اس کے قلب ودماغ پر شغل دنیا ہر وقت مسلط رہتا ہے، اور ذکر آخرت محض وسوسہ کے درجے میں اس کے دل میں گزرتا ہے، دنیا کو بڑی مشقت اور حرص وآرزو سے حاصل کرتا ہے، اور آخرت کے باب میں نری تمناؤں اور ٹرخانے سے کام لینا چاہتا ہے، گناہ کرتا ہے تو اللہ سے پُر امید رہنے کو یاد کرتا ہے اور اسی پر جمارہتا ہے اور طاعت کرنی ہوتی ہے تو اپنا عجز وضعف سوچ کر اس سے رُک جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خدا کے ساتھ اسے حسن ظن ہے، اور خدا کے عفو ودرگزر پر اسے اعتماد ہے، جبکہ خدا نے ایسا کچھ ذمہ نہیں لیا ہے اور رزق کے باب میں جس خدا نے ذمہ لے رکھا ہے، نہ اس سے حسن ظن رکھتا ہے اور نہ اس پر بھروسہ کرتا ہے، بلکہ ہر وقت اس کا دل مضطرب اور مشغول رہتا ہے جبکہ اسے اپنے رب پر اطمینان رکھنے کا حکم ہے، موت کے ذکر پر اسے بالکل اطمینان سا رہتا ہے، حالانکہ اس وقت اضطراب ہونا چاہئے، اگر معاش کی طرف سے کوئی اندیشہ وخوف ہو تو کسی طرح اسے قرار نہیں آتا، حالانکہ خدا نے اس کی ذمہ داری لی ہے، اور اس کا اطمینان ہے کہ جتنی روزی مقدر ہے وہ مل کر رہے گی، لیکن جس چیز کا خدا نے اطمینان دلایا ہے اس پر تو اضطراب ہے، اور جس سے ڈرایا ہے اس پر بالکل اطمینان ہے، اللہ تعالیٰ کچھ دنیا عطا فرمادیتے ہیں تو اتنا خوش ہوتا ہے کہ اس کا شکر تک یاد نہیں رہتا، اور مصائب پر اتنا مغموم

وپریشان ہوتا ہے کہ رضا بالقضا تک کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔

اگر کوئی حادثہ یا ضرورت سامنے آجائے تو پریشان ہو کر بندوں کے پاس پہونچتا ہے اور ان سے اعانت کا طالب ہوتا ہے، اور خدا کی جانب اس وقت رجوع ہوتا ہے جب مخلوق سے ہر طرح مایوسی ہو جاتی ہے، اگر کسی مخلوق کے قرب وتعلق کی امید ہوتی ہے تو خدا کو قطعاً بھول جاتا ہے، کسی نے اس کے ساتھ حسن سلوک کر دیا تو دل کی ساری مشغولیت اسی کے دامن میں بندھ جاتی ہے، اس کا تذکرہ، اس کی محبت اور اس کی شکر گزاری، بس دن رات کا یہی مشغلہ ہو جاتا ہے اور خدا کو بالکل بھلا بیٹھتا ہے، اگر ایسے شخص پر اسے مال خرچ کرنا پڑے جو اس کی مکافات نہ کر سکے، اور محض خدا سے اس کی جزاء کی امید ہو تو تھوڑا مال خرچ کرنے میں بھی اسے گرانی ہوتی ہے اور اگر ایسا شخص ہے کہ مال خرچ کرنے سے وہ اس کا بدلہ چکائے گا یا اس سے کسی اور رُخ سے حصول دنیا کی توقع ہے، تو اس کو زیادہ سے زیادہ مال خرچ کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے، جس سے محبت وتعلق ہوتا ہے اس کی جھوٹی تعریفیں کر کے گناہ میں مبتلا ہوتا ہے، اور جس سے بغض وعداوت ہوتی ہے اس کی ناحق مذمتیں کر کے معصیت میں گرفتار ہوتا ہے، بدگمانیوں کو یقین کا درجہ دے دیتا ہے، تہمتوں کو سچ جانتا ہے، جو شخص اپنا انتقام لینے کی قدرت رکھتا ہے یا لوگوں کی مدد اسے حاصل ہے، اس پر ظلم کرنے کو غلط سمجھتا ہے، لیکن اگر کسی کا حامی وناصر بجز خدا کے کوئی نہ ہو تو اس پر ظلم کو بالکل روا رکھتا ہے، خدا کا ذکر اس پر بہت گراں اور فضول بکواس اس کو بہت آسان، اگر خوشحال ہے تو بہت خوش، بالکل غافل، بڑا ظالم، بے انتہا سرکش اور باغی، اور خوشحالی ساتھ چھوڑ دے تو اپنے فرائض منصبی تک سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اور سمجھتا ہے کہ بس اب کبھی خوشی ومسرت حاصل نہ ہوگی۔

بیمار پڑ جائے تو توبہ واستغفار اور اظہارِ ندامت کرنے لگے، اور یہ معاہدہ کہ اب کبھی گناہ نہ کروں گا، پھر تندرست ہو جائے تو فوراً عہد توڑ دے اور سابقہ حالات پر لوٹ

آئے، اگر مخلوق سے کوئی اندیشہ ہو، یا ان کی دنیا کی توقع ہو تو اپنے مولیٰ کو ناراض کر کے انھیں راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور اگر اپنے گمان کے مطابق خدا سے خوف کرتا ہے تو مخلوق کو ناخوش کر کے خدا کو خوش کرنے کی ہمت نہیں کرتا، اپنے سے طاقتور بندوں کے شر سے خدا کی پناہ چاہتا ہے، لیکن اپنے سے کمزور مخلوق کو اپنے شر سے پناہ نہیں دیتا، غصہ کو نافذ کر کے اس کے دل کو شفا ہوتی ہے، اگرچہ اس کا رب ناراض ہو جائے، معاش میں جو لوگ اس سے برتر ہیں، ان پر نگاہ رکھتا ہے، اور ان کے لحاظ سے اپنے اوپر خدا کی نعمتوں کو بہت قلیل سمجھتا ہے اور اس پر شکر گزار نہیں ہوتا، اور جو لوگ اس سے کمتر ہیں انھیں نہیں دیکھتا کہ ان کے لحاظ سے حق تعالیٰ کا شکر ادا کر سکے، فضول کاموں کی مشغولیت میں اتنا انہماک ہوتا ہے کہ نمازیں اخیر وقت تک ٹال دیتا ہے، پھر جب پڑھتا بھی ہے تو غفلت کے ساتھ، اس میں خدا کی تعظیم بالکل نہیں ہوتی، اگر امام لمبی نماز پڑھا دے تو اُکتانے لگتا ہے اور اس کی شکایتیں کرتا ہے اور اگر مختصر نماز پڑھائے تو بہت خوش ہوتا ہے اور اس کی تعریفیں کرتا ہے، اگر شدائد و مصائب میں مبتلا نہ ہو تو دعا کرنے کی نوبت بہت کم آتی ہے، اور دعا کرتا بھی ہے تو دل دنیا ہی میں پھنسا رہتا ہے۔

☆☆☆☆☆

تکملہ (۲)

عزیزم! تدریس اور اساتذہ سے متعلق ضروری باتیں میں نے قدرے تفصیل سے لکھ دی ہیں، اس قدر لکھنے کے بعد مجھے بوسیدہ کاغذات میں، اپنی ایک پرانی تحریر ملی، جو غالباً آج سے سولہ سال قبل دارالعلوم دیوبند کی دعوت پر ایک نمائندہ اجتماع میں پیش کرنے کے لئے لکھی تھی، اسے بھی لکھے دیتا ہوں، قندِ مکرر کا لطف آئے گا، اور یاد دہانی کی تکرار سے مزید توجہ ہوگی، اسے بھی بغور پڑھو، ان شاءاللہ کچھ جدید فوائد بھی حاصل ہوں گے۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ تعلیم کے تین ارکان ہیں۔ اوّل اساتذہ، دوسرے طلبہ، تیسرے نصاب تعلیم۔ نصاب تعلیم پر تو بہت اظہار خیال کیا جاتا ہے، مگر اس سے اہم یہ ہے

کہ اساتذہ وطلبہ پر توجہ دی جائے، انھیں دونوں کے طریقۂ کار کو مجموعی اعتبار سے ’’طریقۂ تعلیم وتربیت‘‘ کہا جاسکتا ہے، اس سلسلے میں چند باتوں کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔

(۱) **تصحیحِ نیت**: پہلی چیز یہ ہے کہ طلبہ ہوں یا اساتذہ، سب اپنی نیت کی تصحیح کا التزام کریں، یعنی دینی تعلیم کا حصول اور اس کی اشاعت وتدریس صرف اس لئے ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جناب سے ایک فریضہ ہے، اسی سے دین کے احکام اور رضائے خداوندی کے طریقوں کا علم ہوتا ہے۔ آج دوسری دنیاوی تعلیموں کی طرح دینی تعلیم بھی تحصیل معاش کے لئے ذریعہ بن گئی ہے، نیت کی خرابی کی وجہ سے دینی علوم کا تقدس دلوں میں باقی نہیں رہتا، اور تحصیل علم میں محنت اور مطالعۂ ومذاکرہ کی بھی ضرورت نہیں محسوس ہوتی، کیونکہ معاش کے لئے سرے سے علم ہی کی ضرورت نہیں ہے، پھر اس کے لئے محنت ومشقت کا دردِ سر کون مول لے، نیت کا فساد پورے مدرسہ کے ماحول کو فاسد کردیتا ہے، اساتذۂ کرام خود بھی اپنی نیت کی دیکھ بھال کرتے رہیں، اور طلبہ کو بھی بار بار یاد دلاتے رہیں، نیز اساتذہ کسی صاحب دل مخلص، اللہ والے کی صحبت اور تعلق کی پابندی کریں، اللہ والوں کی صحبت کیمیا کی تاثیر رکھتی ہے، اساتذۂ کرام ایسے اللہ والوں کی تلاش میں رہیں جن کی صحبت میں زہد وقناعت، للٰہیت وخلوص، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کی فکر پیدا ہو، اللہ کی محبت دل میں جاگزیں ہو، رسول اکرم ﷺ سے صحیح نسبت قائم ہو، اس تلاش اور اس فکر سے غافل نہ ہوں، پھر جہاں ان کا علم اور قلب مطمئن ہوجائے اس کی خدمت میں رہ کر قلب میں اور علم میں نور حاصل کریں، یہ کہہ کر ٹال نہ دیں کہ اب بزرگوں کا وجود کہاں؟ یا کیا ضرورت ہے بزرگوں کی صحبت کی؟ ہم تو خود دینی تعلیم کے حامل ہیں اور امکانی حد تک اس پر عامل ہیں، اس دھوکے میں ہرگز نہ آئیں، ذرا مخلص علماء ومشائخ کے حالات وسوانح کا مطالعہ کریں تو اپنی کمی کا واضح طور پر احساس ہوگا۔

(۲) **درس کی تیاری**: اساتذہ پڑھانے کے لئے باقاعدہ تیاری کریں، پڑھانے سے پہلے پورے سبق کو اپنے ذہن میں مستحضر کریں تاکہ اس کا کوئی جز ان کے ذہن

سے اوجھل نہ ہو، اور تا کہ وہ طلبہ کو انشراح کے ساتھ پڑھا سکیں۔

(۳) **طلبہ کی عبارت خوانی**: طالب علموں کو مطالعہ کا پابند بنائیں، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس قدر سبق پڑھانا ہو، اس کی عبارت پڑھنے کا مکلّف ہر طالب علم کو بنائیں، تھوڑی تھوڑی عبارت وقت کی گنجائش کے لحاظ سے ہر ایک طالب علم سے پڑھوائیں، اور عبارت کی غلطی پر سرسری روک ٹوک کریں اور اصلاح کی طرف توجہ دلائیں، اصلاح میں زیادہ کاوش نہ کریں ورنہ سارا وقت اسی میں چلا جائے گا اور سبق نہ ہو سکے گا، سرسری اصلاح روزانہ ہوتی رہے گی تو وہ ذہن نشین ہو جائے گی۔

(۴) **طریقۂ درس**: درس میں لمبی تقریر بالکل نہ کی جائے، عبارت پڑھوائی جائے، عبارت کا ترجمہ قریب قریب تحت اللفظ کرایا جائے تا کہ ہر طالب علم کو معلوم ہو جائے کہ کس لفظ کا کیا ترجمہ ہے، محاورۂ اردو کی بہت رعایت ہوگی، تو طالب علم مفردات کے ترجمے سے محروم ہو جائے گا، عبارت کو مختصر لفظوں میں حل کرنے کی کوشش کی جائے، متوسطات تک طریقہ یہ ہو کہ نپے تلے سہل الفاظ میں سبق کی تقریر کی جائے، اور انھیں الفاظ میں کم از کم تین بار وہ تقریر دہرائی جائے، تقریر دہرانے میں الفاظ وکلمات اور تعبیر و اُسلوب میں تبدیلی نہ کی جائے، اس سے طالب علم کا ذہن منتشر ہوتا ہے، اور بار بار ایک ہی انداز میں تقریر کی جائے گی، تو معانی الفاظ سمیت ذہن نشین ہو جائیں گے، ذہین اساتذہ اس باب میں اکثر غلطی کا شکار ہوتے ہیں۔

(۵) **کمزور طالب علم کی رعایت**: جس طرح نماز باجماعت کے بارے میں حکم ہے کہ کمزور تر مقتدی کی رعایت کی جائے، اسی طرح جماعت میں کمزور تر طالب علم کی رعایت کرتے ہوئے سبق پڑھایا جائے، اس طریقۂ عمل سے ذہین طلبہ کو سبق مجلس درس میں ہی ازبر ہو جائے گا، اور کمزور طالب علم بھی اپنی استعداد کے بقدر فائدہ اٹھا لے گا۔

(۶) **طالب علم کے ساتھ سلوک** : طالب علموں کی ہمت شکنی ہرگز نہ کی جائے ، زجر وتوبیخ میں یہ انداز قطعاً نہ اختیار کیا جائے ، جس سے یہ تاثر پیدا ہو کہ یہ طالب علم کسی کام کا نہیں ہے ، یا اسے علم حاصل ہی نہ ہوگا ، ممکن ہے کسی خاص فن میں یا کسی خاص کتاب میں وہ کمزور ہو ، لیکن اس سے یہ بالکل لازم نہیں آتا کہ وہ بالکل ناکارہ ہوکر رہ جائے ، کبھی کبھی ہمت شکنی طالب علم کو ہمیشہ کے لئے مایوسی کا شکار بنا دیتی ہے ۔

(۷) **تعلیمی گھنٹی کی رعایت** : اساتذہ خاص طور سے اس کا اہتمام کریں کہ کسی درس اور کتاب کے لئے جو وقت مدرسہ کی طرف سے متعین ہے ، اس پورے وقت میں اپنے آپ کو طلبہ کے ساتھ پابند رکھیں ، کسی مشغولیت کی وجہ سے درگاہ پہونچنے میں دیر نہ کریں ، ورنہ طلبہ اور زیادہ سست ہو جائیں گے ، استاذ جب وقت کی پابندی کرتا ہے تو طلبہ مستعد رہتے ہیں ، اسی طرح اگر وقت ختم ہونے سے پہلے سبق پورا ہو جائے اور وقت زیادہ بچ گیا ہے ، تو اس کو ضائع نہ ہونے دیں ، بلکہ طلبہ کو کسی کام میں مشغول کر دیں ، اور خود بھی وہاں موجود رہیں ، ہاں پانچ منٹ پہلے ضرور انھیں چھوڑ دیں تاکہ وہ دوسرے استاذ کے یہاں وقت پر پہونچ سکیں ، ایسا کبھی نہ کریں کہ دوسرے استاذ کے وقت میں اپنا سبق پورا کریں ۔ وقت ختم ہونے سے پانچ منٹ پہلے ضروری ہے کہ طلبہ کو فارغ کر دیا جائے ، اساتذہ اس کا خیال نہیں کرتے ، اپنا وقت ضائع کرتے ہیں ، اور دوسرے استاذ کے وقت میں بے جا تصرف کرتے ہیں ، یہ عمل طلبہ کے حق میں تو مضر ہے ہی ، خود اساتذہ کے باہمی تعلقات میں اس سے خرابی پیدا ہوتی ہے ۔

ایک بات یہاں اور قابل لحاظ ہے ، وہ یہ کہ تعلیم کا گھنٹہ ساٹھ منٹ سے کم نہ ہونا چاہئے ، لوگوں نے درس میں کتابیں زیادہ کر دی ہیں ، اس لئے گھنٹوں کو مختصر کرنا پڑا ہے ، اس سے طلبہ کی استعداد پختہ نہیں ہو پاتی ، کتابیں بس اتنی چاہئیں کہ ساٹھ منٹ کے حساب سے چھ گھنٹے میں ان کی تکمیل ہو جائے ، طلبہ کم ہوں ، تو چھوٹی گھنٹیوں کی گنجائش نکل سکتی ہے ، لیکن

اگر ایک جماعت میں بارہ چودہ طلبہ ہوں تو ساٹھ منٹ سے کم قطعاً نا کافی وقت ہے، انجام یہ ہوتا ہے کہ خارج میں اسباق پڑھانے پڑتے ہیں، اس سے طلبہ بھی مصیبت میں پڑتے ہیں اور اساتذہ بھی پریشان ہوتے ہیں۔

بہر حال درس میں کتابیں کم ہوں، اور وقت پورا ہو، تو استعداد ٹھوس ہونے کی توقع زیادہ ہے۔

(۸) **اسباق کا مذاکرہ**: طلبہ کو پڑھے ہوئے اسباق کے مذاکرہ کا پابند بنایا جائے، اور ایسا ماحول تشکیل دیا جائے کہ پڑھنے لکھنے کا شوق اور ولولہ پیدا ہو۔

(۹) **مشورہ**: اہل مدرسہ اس کا اہتمام کریں کہ جس تجربہ کار عالم پر اعتماد ہو، اور اس کی ہمدردی اور تعلق کا یقین ہو، اسے کبھی کبھی مدرسہ میں دعوت دے کر تعلیم اور طریقۂ تعلیم کے موضوع پر ان سے رہنمائی حاصل کی جائے، انتخاب بہت احتیاط اور اہتمام سے کریں، اور ایک یا دو عالم کا انتخاب کریں اور ہمیشہ انھیں سے مشورہ لیں، کئی علماء سے اگر استفادہ کیا جائے گا، تو تشتت پیدا ہوگا۔

(۱۰) **اجتماعی تربیت**: مدرسہ میں ایک ذمہ دار استاذ ایسا ضرور ہونا چاہئے، جو انفراداً تربیت کے علاوہ اجتماعی طور پر تربیتی اور ترغیبی باتیں طلبہ میں اچھے انداز میں کرسکتا ہو، کم از کم ایک ماہ میں دوبار اس کا التزام ہونا چاہئے، اس کے فوائد بہت ہیں۔

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ

باتیں تو بہت ہیں، لیکن سب کا قدر مشترک یہ ہے کہ اساتذہ وطلبہ پوری دیانت داری کے ساتھ اس کام میں مشغول ہوں، اساتذہ اسے صرف حصول تنخواہ کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ عبادت سمجھ کر یہ کام انجام دیں، اور طلبہ اس علم کی اہمیت محسوس کریں، کلیدی بات یہی دیانت داری ہے۔

* * *

دارالعلوم دیوبند کیا ہے؟

دارالعلوم دیوبند کسی متعصب فرقے کا نام نہیں ہے، نہ یہ کوئی سیاسی جماعت ہے، نہ کوئی ایسا گروہ یا جتھہ ہے، جو ہر حق و ناحق میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے لئے قائم کیا گیا ہو، اور نہ کوئی یہ بحث و مناظرہ کی کوئی ٹیم ہے، جو صرف کسی خاص فرقے کی تردید کے لئے معرض وجود میں آئی ہو، بلکہ درحقیقت دارالعلوم دیوبند قرآن وسنت کی اس تعبیر کا نام ہے جو صحابہ کرام، تابعین عظام اور اسلافِ امت کے ذریعہ ہم تک پہونچی ہے۔

یہ اس علم صحیح کا نام ہے، جو بزرگانِ دین نے پیٹ پر پتھر باندھ کر ہم تک پہونچایا ہے، یہ سیرت و کردار کی اس خوشبو کا نام ہے، جو صحابہ وتابعین کی سیرتوں سے پھوٹی ہے، یہ اس جہد وعمل کا نام ہے، جس کا سرا بدر واحد کے میدانوں تک پہونچتا ہے، یہ اس اخلاص وللّٰہیت، تواضع وسادگی، تقویٰ وطہارت اور حق گوئی وبے باکی کا نام ہے، جو تاریخ اسلام کے ہر دور میں علمائے حق کا طرۂ امتیاز رہی ہے، پچھلی صدی میں دارالعلوم دیوبند کا تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کے دورِ انحطاط میں ان علمی وعملی اوصاف کو زندہ کیا اور ایسے انسان پیدا کئے جو ان اوصاف کے جیتے جاگتے پیکر تھے۔

لہٰذا جو شخص ان اوصاف سے متصف ہے، جسے ان خطوط پر پہلے اپنی اور پھر ساری امت کی اصلاح کی فکر ہے، وہ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہے خواہ ظاہری طور پر اس نے دارالعلوم دیوبند کو دیکھا بھی نہ ہو، اور جو شخص ان اوصاف سے بے فکر اور اس مشن سے بے پرواہ ہے، اس کا دارالعلوم دیوبند سے کوئی تعلق نہیں خواہ ظاہری طور سے اس کے پاس دارالعلوم دیوبند کی سند اور دستار کیوں نہ موجود ہو۔

(**جہانِ دیدہ**، مؤلفہ: مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ۔ ص: ۵۱۱)

تصانیف حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ

(۱) **تسہیل الجلالین** ’’شرح اردو جلالین شریف‘‘ (جلد اول)
(سورہ بقرہ تا سورہ نساء، سوا پانچ پارے)، صفحات: 648 قیمت: 400

(۲) **حدیث دوستاں**
دینی و اصلاحی اور علمی و ادبی مکاتیب کا مجموعہ، صفحات: 730 قیمت: 350

(۳) **حدیث دردِ دل**
مجلّہ المآثر، الاسلام، اور ضیاء الاسلام کے اداریئے صفحات: 592 قیمت: 300

(۴) **کھوئے ہوؤں کی جستجو**
مختلف شخصیات پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ، صفحات: 616 قیمت: 200

(۵) **حیاتِ مصلح الامت**
حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب اعظمی کی مفصل سوانح، صفحات: 528 قیمت: 150

(۶) **مدارسِ اسلامیہ، مشورے اور گزارشیں** (جدید اضافہ شدہ ایڈیشن)
مدارس سے متعلق مضامین کا مجموعہ، صفحات: 312 قیمت: 150

(۷) **بطوافِ کعبہ رفتم** ---(سفرنامۂ حج) (جدید اضافہ شدہ ایڈیشن)
حرمین شریفین (مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ) کے سفر کی روداد، صفحات: 464 قیمت: 300

(۸) **تہجد گزار بندے** (جدید اضافہ شدہ ایڈیشن)
تہجد کی اہمیت و فضیلت اور تہجد گزار بندوں کا تفصیلی تذکرہ، صفحات: 472 قیمت 300

(۹) **ذکرِ جامی**

ترجمان مصلح الامتؒ مولانا عبدالرحمٰن جامی کے حالاتِ زندگی، صفحات:216 قیمت:90

(۱۰) **حضرت چاندشاہ صاحب اوران کا خانوادۂ تصوف**

حضرت چاندشاہ صاحب ٹانڈوی اوران کے خلفاء کے حالات، صفحات:180 قیمت:70

(۱۱) **تذکرہ شیخ ہالیجویؒ**: سندھ کے معروف شیخ طریقت وعالم اور مجاہد فی سبیل اللہ

حضرت مولانا حماداللہ صاحب ہالیجوی کا مفصل تذکرہ۔ صفحات:224، قیمت:56

(۱۲) **مودودی صاحب اپنے افکارونظریات کے آئینہ میں**

مولانا بنوریؒ کی عربی کتاب الاستاذ المودودی کا ترجمہ۔ صفحات:184، قیمت:95

(۱۳) **حکایتِ ہستی** (جدیداضافہ شدہ ایڈیشن)

خودنوشت سوانح، ابتداءِ حیات سے اختتام طالب علمی تک۔ صفحات:400، قیمت:250

(۱۴) **کثرتِ عبادت** عزیمت یا بدعت؟ قیمت ۲۸/روپئے

(۱۵) **قتل ناحق** قرآن وحدیث کی روشنی میں قیمت ۱۶/روپئے

(۱۶) تعویذات وعملیات کی حقیقت وشرعی حیثیت قیمت ۲۰/روپئے

(۱۷) شب برأت کی شرعی حیثیت قیمت ۴۰/روپئے

(۱۸) اخلاق العلماء علماء کیلئے خاص چیز قیمت ۲۰/روپئے

(۱۹) دینداری کے دو دشمن حرصِ مال وحب جاہ قیمت ۴۰/روپئے

(۲۰) فتنوں کی طغیانی ٹی۔وی پر ایک فکرانگیز تحریر! قیمت ۱۵/روپئے

(۲۱) اہل حق اور اہل باطل کی شناخت قیمت ۶۰/روپئے

(۲۲) مالی معاملات کی کمزوریاں اور انکی اصلاح قیمت ۴۰/روپئے

(۲۳) منصب تدریس اور حضرات مدرسین	قیمت ۴۵/روپے
(۲۴) حج وعمرہ کے بعض مسائل میں غلو اور اس کی اصلاح	قیمت ۳۵/روپے
(۲۵) برکات زمزم ماءِ زمزم کی فضیلت واہمیت کا بیان	قیمت ۲۵/روپے
(۲۶) تصوف ایک تعارف!	قیمت ۸۰/روپے
(۲۷) خواب کی شرعی حیثیت	قیمت ۴۰/روپے
(۲۸) تکبر اور اس کا انجام	قیمت ۳۰/روپے
(۲۹) مسئلۂ ایصالِ ثواب	قیمت ۶۰/روپے
(۳۰) مروجہ جلسے بے اعتدالیاں اور ان کی اصلاح	قیمت ۳۰/روپے
(۳۱) رمضان المبارک: نیکیوں کا موسم بہار	قیمت ۴۰/روپے
(۳۲) علوم ونکات: (مجموعۂ مضامین) جلد اوّل، دوم	قیمت ۱۰۰۰/روپے
(۳۳) نمونے کے انسان	قیمت ۲۵۰/روپے

اسٹاکسٹ

مکتبہ ضیاء الکتب اتراری، خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)
PIN:276403 MOB:9235327576

دیوبند میں ہماری کتابیں ملنے کا پتہ
کتب خانہ نعیمیہ، جامع مسجد دیوبند (01336223294)

دہلی میں ہماری کتابیں ملنے کا پتہ
فرید بک ڈپو، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی۲ (01123289786